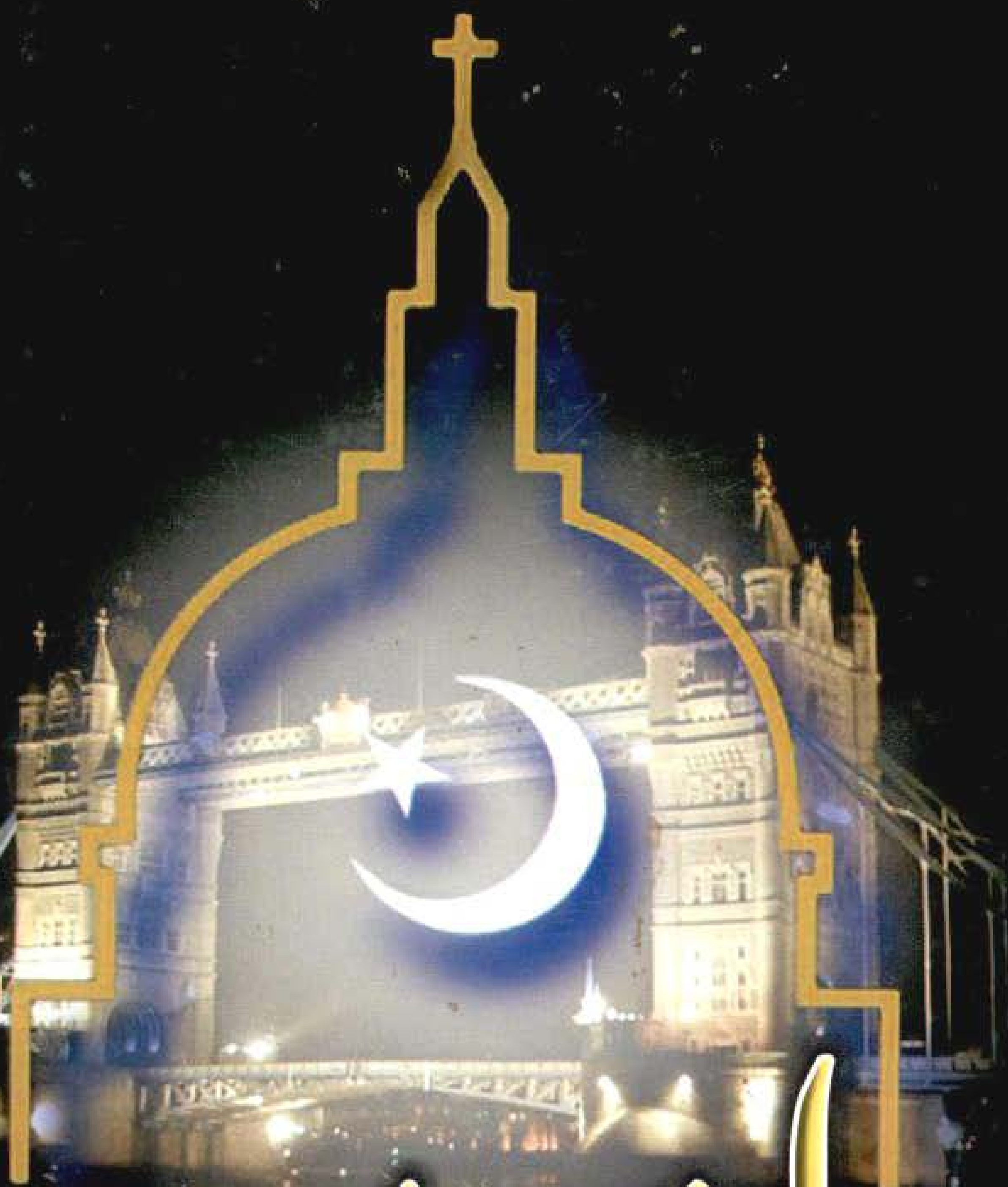


# لندن

## اِک شہرِ بے مثال

نسیم احمد فاروقی




# لندن

## اک شہرِ بے مثال

## ☆......ڈسٹری بیوٹرز......☆

خزینہ علم وادب الکریم مارکیٹ اردو بازار، لاہور
مشتاق بک کارنر الکریم مارکیٹ اردو بازار، لاہور
اسلامی کتب خانہ، اردو بازار، لاہور
کتاب گھر کمیٹی چوک، راولپنڈی
احمد بک کارپوریشن کمیٹی چوک، اقبال روڈ، راولپنڈی
رحمٰن بک ہاؤس اُردو بازار، کراچی
احمد بک کارپوریشن اقبال روڈ کمیٹی چوک راولپنڈی
مسٹر بکس سپر مارکیٹ اسلام آباد
مکتبہ ضیائیہ بوہڑ بازار، راولپنڈی
گڈ بکس شاپ صدر بازار، راولپنڈی
بختیار سنز قصہ خوانی بازار، پشاور
بنگش بکڈ پو اردو بازار، سیالکوٹ
ماڈرن بکڈ پو سیالکوٹ کینٹ
کھوکھر بکسٹال مسلم بازار، گجرات
بلال بکڈ پو، گجرات
کتاب مرکز امین پور بازار، فیصل آباد
کتب خانہ مقبول عام امین پور بازار، فیصل آباد
شریف سنز کارخانہ بازار، فیصل آباد
کارواں بک سنٹر، ملتان کینٹ
دارالکتاب کالج روڈ، لیہ
الیاس کتاب محل کچہری بازار، جڑانوالہ
ڈار برادرز تحصیل بازار، جہلم
جالندھر بکڈ پو، ڈسکہ
یونائیٹڈ بک ہاؤس، کچہری روڈ، منڈی بہاؤالدین
شائلہ بک ایجنسی محلہ چوہدری پارک ٹوبہ ٹیک سنگھ
میاں ندیم مین بازار، جہلم
اسلامی کتب خانہ، حافظ آباد
کارواں بک سنٹر، بہاولپور
گلیکسی بکس، خان آرکیڈ، کچہری روڈ، سرگودھا
النور بک کارنر محمدی پلازہ، میرپور آزاد کشمیر

مکتبہ قابل اردو بازار، لاہور
کتاب سرائے الحمد مارکیٹ اردو بازار، لاہور
فہیم بکڈ پو، رجپوت مارکیٹ اردو بازار، لاہور
اشرف بک ایجنسی کمیٹی چوک راولپنڈی
فضلی سنز اردو بازار، کراچی
ویلکم بک پورٹ اُردو بازار، کراچی
کتب خانہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی
سعید بک بنک اسلام آباد
کیپٹل بکڈ پو، اردو بازار، راولپنڈی
سعید بک بنک، پشاور
یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار، پشاور
حافظ بک ایجنسی اقبال روڈ، سیالکوٹ
بک سنٹر اردو بازار، سیالکوٹ
پنجاب بکڈ پو سرکلر روڈ، گجرات
سلطان بک پیلس، گجرات
فائن بکس امین پور بازار، فیصل آباد
نیو مکتبہ دانش امین پور بازار، فیصل آباد
مقبول بک ایجنسی چوک پاک گیٹ، ملتان
الکریم نیوز ایجنسی، اوکاڑہ
چوہدری بکڈ پو مین بازار، دینہ
عمر بک سنٹر جی ٹی روڈ، سرائے عالمگیر
شکیل بکڈ پو، سمندری
مسلم بک لینڈ، بینک روڈ، مظفر آباد
نیو وہاڑی کتاب گھر، جناح روڈ، وہاڑی
ہلال کاپی ہاؤس لیاقت روڈ، میاں چنوں
نیو نفیس بکڈ پو مین بازار، میانوالی
خالد کتاب محل، سیالکوٹ روڈ، اگوکی
پاکستان بکڈ پو مین بازار، جلال پور جٹاں
جہلم بک کارنر، جہلم
منور بک ڈپو گجرات

# لندن

## اک شہرِ بے مثال



نسیم احمد فاروقی

مشعل بکس

C-2, اسلامک سنٹر پنجاب یونیورسٹی لاہور

فون: 092-42-5869871 موبائل: 0300-8684021

www.mashalfoundation.org

| | | |
|---|---|---|
| نام کتاب | ............ | لندن ...... اِک شہر بے مثال |
| تحقیق وترتیب | ............ | محمد نسیم فاروقی |
| ناشر | ............ | مشعل پبلشرز، لاہور |
| مطبع | ............ | جوہر رحمانیہ پرنٹرز، لاہور |
| سرورق | ............ | عمر الغزالی |
| پروف ریڈنگ | ............ | کامران امجد خان |
| سنِ اشاعت | ............ | اکتوبر 2005ء |
| قیمت | ............ | -/175 روپے |

مشعل بکس

C-2، اسلامک سنٹر، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

فون: 300-8684021,042-5869871

www.mashalfoundation.org

# عرض ناشر

''سفر نامہ'' یہ لفظ سنتے ہی ذہن میں ایسی کتاب کا تصور ابھرتا ہے کہ جس میں چٹ پٹی کہانیاں، مغربی ممالک میں حدود و قیود سے آزاد نوجوانوں کی داستانیں، صاحب تحریر پر دل و جان سے فریفتہ خوبصورت گوریوں کے قصے اور مصالحہ سے بھرپور مواد ہوگا۔ کوئی مصنف کبھی کبھار زبان کا ذائقہ تبدیل کرنے کیلئے جغرافیہ، سیاست و ثقافت پر بھی ضرور بحث کر لیتا ہے لیکن سنجیدہ تحریر بالعموم سفر نامے کا موضوع نہیں سمجھی جاتی۔

''لندن ایک شہر بے مثال'' اس لحاظ سے سفر نامے کی اس تعریف پر قطعاً پورا نہیں اترتی۔ یہ کتاب محض ایک سفر نامہ نہیں ہے بلکہ ایک صاحب بسیرت شخص کا چشم کشا پوسٹمارٹم ہے ایک ایسی قوم اور ایک ایسی تہذیب کا جو پستی کی انتہائی گہرائیوں سے اٹھی اور آدھی سے زیادہ دنیا پر حکمران ہوگئی۔ اس سفر میں اس نے کیا کیا حربے استعمال کئے اور کس طرح سے زیر قبضہ علاقوں کو بے رحمی سے لوٹا اور عوم کے گلے میں غلامی کا طوق طویل عرصے تک پہنائے رکھنے کیلئے کیا کیا جتن کئے۔

طویل عرصے تک دنیا پر حکمرانی کرنے والی اس قوم کی نئی نسل آج جس بحران اور ذہنی انحطاط کا شکار ہے اس کی پیشین گوئی علامہ اقبال نے کئی سال قبل ان الفاظ میں کی تھی:۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
شاخ نازک پہ جو آشیانہ بنے گا، ناپائدار ہوگا

مغرب کی موجودہ مادی ترقی ان کی تہذیب و ثقافت کی برتری کی آئینہ دار نہیں ہے بلکہ اس ترقی کے پس منظر میں اسلام کے لازوال اور ابدی اصول ہیں جس کا برملا اظہار خود مغربی دنیا بھی کرتی ہے۔

مشعل پبلشر کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت ہے کہ جن سے قاری بالخصوص نوجوان نسل میں زندگی کا صحیح شعور اجاگر کرنا، ایک با مقصد زندگی کی اہمیت کا احساس دلانا، مقصد کے حصول کیلئے درکار محنت اور اس کے حصول کیلئے قربانی دینے کا جذبہ پیدا کرنا اور ان کو محنت کی راہ پر گامزن کرنا ہے۔ ''لندن... اک شہر بے مثال'' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

اس کتاب کو نسیم فاروقی صاحب نے صحیح معنوں میں خونِ جگر سے لکھا ہے۔ اس کتاب کے ذریعے نسیم صاحب ہمیں بہت سے پہلوؤں پر دعوتِ فکر دے گئے ہیں۔

مغربی معاشرے میں ایک فرد کی انفرادی اور ازدواجی زندگی جتنی بھی افراتفری کا شکار ہو ان کی معاشرتی زندگی کی کامیابی ہمیں بہت کچھ سوچنے کی دعوت دیتی ہے۔ ان کی کامیاب معاشرتی اور سماجی زندگی کی بنیاد بھی اسلام کے لازوال اصولوں پر عمل ہے۔ یورپ میں سوشل سیکیورٹی کے قانون کو عمر الله کہتے ہیں جو حضرت عمر کی نسبت سے ہے۔ صرف یہ نہیں بلکہ یورپ اور امریکہ میں عبادات کے علاوہ تمام شعبہ ہائے زندگی میں اسلام کے اصولوں پر عمل کیا جاتا ہے۔ اس بات کا اقرار لندن میں ایک پروفیسر جو کہ خود کو اتھیسٹ (منکرِ مذہب) کہتا تھا نے بھی نسیم صاحب سے گفتگو کے دوران کیا:۔

"مسلمان قوم زوال پذیر ہے۔ پھر میں کیوں اس ڈوبتی قوم کا فرد بنوں۔؟ اس کا کیوں نہ رہوں جنہوں نے سوائے عبادت کے اسلام کی تمام خوبیاں اپنے اندر سمو لیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اسلام جتنی اخلاقی تعلیمات دیتا ہے وہ یورپ والے لے چکے مسلمان اس سے تہی دست ہیں۔"

کوئی بھی مذہب انسان کی دو شعبوں میں رہنمائی کرتا ہے۔ اخلاقی اور روحانی۔ اخلاقی اصولوں یعنی رہن سہن، بول چال، ادب آداب، امانت و دیانت، عدل و انصاف، محنت و مشقت پر صدقِ دل سے عمل انسان کو اس دنیا میں ترقی سے ہمکنار کرتا ہے اور اگر یہی عمل اللہ اور اس کے نبی کے فرمودات سمجھ کر انجام دیا جائے تو انسان کو آخرت میں اجر و ثواب کو مستحق بھی قرار دیتا ہے۔ اس فلسفہ زندگی کی صداقت پر ایمان لائے بغیر اس پر عمل تو اس دنیا میں کامیابی کی ضمانت ہے۔ اس کی مثال ہمیں یورپ اور امریکہ میں پرسکون معاشرتی زندگی سے ملتی ہے۔ جبکہ اس پر محض ایمان لانا نا تو اس دنیا میں کوئی معنی رکھتا ہے اور نا ہی آخرت میں کسی فائدہ کا موجب ہوگا۔

ہمارے لیئے لمحہ فکر یہ ہے کہ اہل مغرب اس پیغام پر ایمان تو نہیں لائے مگر اس پر صدقِ دل سے عمل کر کے ایک پرسکون زندگی گزار رہے ہیں جبکہ ہم لوگ اللہ کی واحدانیت اور اس کے دیے ہوئے فلسفہ حیات پر ایمان رکھتے ہیں مگر ہماری سماجی زندگی میں پائی جانے والی ابتری، نفسانفسی، رشوت، اقربا پروری، سفارش، اپنے معاشرتی فرائض سے غفلت ہمیں دعوتِ فکر دیتی ہے کہ آیا اس دنیا میں کامیاب زندگی گزارنے کے لیے صرف اسلام کے رہنما اصولوں پر ایمان لانا ہی کافی ہے یا اس پر

عمل بھی ضروری ہے۔

پروفیسر کے بقول۔

''مسلمانوں جیسی بدقسمت قوم دنیا میں نہیں۔اس کے پاس قرآن جیسی رشد وہدایت سے بھری کتاب ہے جس کو پڑھ کر عام انسان بھی اپنی زندگی بدل سکتا ہے لیکن مسلمانوں نے اسے کپڑوں کی تہہ میں لپیٹ کر طاق پر رکھ دیا ہے۔اسی فیصد مسلمان اسے پڑھ بھی نہیں سکتے اس پر عمل کیا کرینگے۔جب عمل نہیں کر سکیں گے تو فائدہ کیا اٹھائیں گے۔؟ ماضی میں عیسائیوں نے انجیل کو طاق پر رکھ دیا تھا۔خدا نے انہیں بھی طاق پر رکھ دیا تھا۔یہی حال یہودیوں کا تھا...... جارج برنارڈشا نے کہا تھا کہ'' اسلام بہترین مذہب ہے لیکن مسلمان بدترین قوم ہے''۔

مجھے یہ دیکھ کے دکھ ہوتا ہے کہ اسلام جیسا عظیم وفطری مذہب جن برائیوں کے خاتمے کے لئے آیا تھا مسلمانوں نے انہی برائیوں کو زندہ رکھا ہوا ہے۔زندگی کے ہر پہلو میں کون سی برائی ہے جس سے اسلام واضح طور پر منع نہیں کرتا اور مسلمان اسے روا نہیں رکھتا۔چوری' مکاری' شراب نوشی' دھوکہ دہی کون سی اخلاقی بیماری ہے جس میں مسلمان پیچھے ہیں۔اب خود سوچیں عیسائی اور مسلمان دونوں ہی روحانی شعبہ میں کم وبیش خالی اور تہی دست ہیں۔اس لحاظ سے عیسائی مسلمانوں سے تو بہتر ہوئے کہ کم از کم اخلاقی شعبہ میں تو آگے ہیں۔تو پھر میں مسلمان کیوں ہو جاؤں۔؟

خدا کا اصول ہے کہ اسے وہ قوم یا لوگ پیارے ہوتے ہیں جو اس کے احکامات پر چلیں اور ان کے اعمال اچھے ہوں۔محض خاندان' قرابت' نسل یا کسی اور نسبت کی وجہ سے اسے کوئی پیارا نہیں ہوتا۔خدا کا طریقہ یہ ہے کہ جو قوم اس کی ہدایات پر عمل کرتی رہتی ہے۔وہ اس کی لاڈلی اور مرغوب قوم ہوتی ہے اور اس کی رحمتوں اور برکتوں کے سائے میں رہتی ہے اسے دنیا میں عظمت' سربلندی' حکومت' مال دولت سب کچھ ملتا ہے۔ جوں ہی وہ سرگردانی شروع کرتی ہے۔تو اس سے سب کچھ چھننا شروع ہو

جاتا ہے۔ کچھ عرصہ تک تو خدا اس قوم کو برداشت کرتا ہے۔ پھر اسے ہٹا کر دوسری لے آتا ہے۔ اور اس کو نوازنا شروع کر دیتا ہے۔ ابتدا سے آج تک خدا کا اصول یہی رہا ہے۔ اب خود ہی دیکھ لو اسرائیلی قوم خدا کی لاڈلی قوم تھی۔ جب یہ قوم منحرف ہوئی تو خدا اس کی بجائے عیسائیوں کو لے آیا جو تھے تو ان ہی میں سے لیکن الگ فرقہ بن گئے تھے۔ جب تک عیسائی خدا کو پوجتے رہے۔ دنیا میں عروج پر رہے۔ جب وہ منحرف ہوئے تو خدا انہیں ہٹا کر مسلمانوں کو لے آیا۔ مسلمانوں نے پچاس سال کے اندر دنیا کی لیڈری حاصل کر لی۔ خدا نے ان کو زمین کے وسیع حصے کی حکومت' دولت' عزت وقار سے نوازا بعد میں یہ حیثیت اس وقت تک رہی جب تک وہ خدا کے تابع رہے۔ آج کل یہ قوم بھی زوال پذیر ہے۔ پھر میں کیوں اس ڈوبتی قوم کا فرد بنوں۔؟ اس کا کیوں نہ رہوں جنہوں نے سوائے عبادت کے اسلام کی تمام خوبیاں اپنے اندر سمو لیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اسلام جتنی اخلاقی تعلیمات دیتا ہے وہ یورپ والے لے چکے مسلمان اس سے تہی دست ہیں۔"

اس پیغام معاشرے کے ہر فرد تک اس پیغام کو پہنچانے کا نسیم کو اس قدر احساس تھا کہ انہوں نے اس کو کتاب کی شکل میں شائع کرنے کی بجائے عوام میں مقبول سیارہ ڈائجسٹ میں شائع کرنے کو ترجیح دی تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے مستفید ہو سکیں۔

ہم نے اس کتاب کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کو کتاب کی شکل میں شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

عبدالمجید

لاہور

یکم اگست ۲۰۰۵ء

# مصنف

**نسیم فاروقی** ۲۶ دسمبر ۱۹۳۷ کو بمبئی میں پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان کے وقت ہجرت کرکے پاکستان آ گئے اور این ای ڈی کالج سے الیکٹریکل انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد انہوں نے متعدد اداروں میں خدمات انجام دیں جن میں ایکسائڈ بیٹری، پیٹاک، کراچی شپ یارڈ، ہیوی مکینیکل کمپلیکس وغیرہ شامل ہیں۔

ان اداروں میں ملازمت کے دوران نسیم صاحب اپنے معمول کے فرائض کے ساتھ ساتھ تعلیم وتربیت سے بھی وابستہ رہے اور بالآخر وزارت تعلیم سے منسلک ہوگئے جہاں سے وہ ۲۸ سال تک خدمات انجام دینے کے بعد ۱۹۹۸ میں مشیر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔

وزارت تعلیم میں ملازمت کے دوران نسیم صاحب زیادہ تر نصاب تعلیم سے منسلک رہے۔

# معلومات کا سمندر

محمد نسیم فاروقی (مرحوم) وزارت تعلیم میں ایک عرصے تک خدمات انجام دیتے رہے۔ علم وادب کے حوالے سے ان کی خدمات قابل قدر ہیں۔ لندن اک شہر بے مثال...... کہنے کو تو ایک سفرنامہ ہے مگر نسیم فاروقی کا یہ سفرنامہ...... روایتی سفرنامہ نہیں ہے جو تاریخی اور جغرافیائی حالات اور سفر کی تفصیلات پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ تو ایک ایسے مسافر کی داستان ہے۔ جس کا سفر محض چند روز پر مشتمل تھا لیکن اس چند روزہ سفر کی داستان بیان کرتے کرتے نسیم فاروقی نے علم و آگہی، معرفت، تاریخ اور معاشرتی امور کی ایسی ایسی معلومات اور تفصیلات بیان کر دی ہیں، جنہیں حاصل کرنے کیلئے، لاتعداد کتب کا مطالعہ، دیش دیش کی تلاش بسیار اور تاریخ کا گہرا مشاہدہ ضروری ہے۔

سیارہ ڈائجسٹ میں اس سفرنامے کی اشاعت بھی اپنے اندر بے شمار حیرت انگیز واقعات سموئے ہوئے ہے۔ جن دنوں نسیم فاروقی (مرحوم) نے مجھ سے اپنے سفرنامے کی قسط وار اشاعت کے بارے میں بات کی اس وقت ہم پہلے ہی دو قسط وار سلسلے شائع کر رہے تھے اور دونوں میں سے کسی کے بھی جلد اختتام کا امکان نہ تھا، لہٰذا میں نے ان سے معذرت کر لی۔ مگر نسیم صاحب کا کہنا تھا کہ انہوں نے یہ سفرنامہ بے حد محنت اور دل لگا کر لکھا ہے اور ان کا دل گواہی دیتا ہے کہ اس کی اشاعت سیارہ ڈائجسٹ ہی کے صفحات کے ذریعے ممکن ہے۔ ان سے گفتگو کے اگلے ہی دن کچھ ایسے حالات خود بخود بن گئے کہ ہمیں دو قسط وار سلسلوں میں سے ایک کو فوری طور پر روکنا پڑ گیا۔ مزید یہ کہ لندن اک شہر بے مثال کے مسودہ کا مطالعہ کرتے ہی مجھے اس کی اہمیت اور اثر انگیزی کا قائل ہونا پڑا۔ یوں یہ سفرنامہ جسے میں ''معلومات کا سمندر'' کہہ کر پکارتا ہوں...... سیارہ ڈائجسٹ میں قسط وار شائع ہونے لگا۔ جوں جوں اقساط شائع ہوتی گئیں قارئین کی دلچسپی اور

پسندیدگی کے خطوط میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔آخری دو اقساط شائع ہونے سے قبل ایک اور حیرت انگیز اور المناک واقعہ پیش آیا۔ہوا یوں کہ نسیم صاحب نے مجھے آخری دو باب مہینے کی ابتدائی تاریخوں میں ارسال کرنے کا وعدہ کر رکھا تھا،مگر 10 تاریخ تک بھی ان کی طرف سے کوئی اطلاع موصول نہ ہونے پر میں تشویش میں مبتلا ہو گیا۔میں نے نسیم صاحب کے گھر فون کیا،ان کے صاحب زادے نے فون اٹھایا اور بڑے ہی درد بھرے لہجے میں مجھے نسیم صاحب کے انتقال کی اطلاع دی۔یہ خبر نہ صرف میرے لئے المناک تھی بلکہ تشویشناک بھی تھی۔اتنے عرصے میں نسیم صاحب کے ساتھ ایک دلی تعلق پیدا ہو چکا تھا اور محبت کا رشتہ جڑ گیا تھا۔ان کی شفقت،علم وآگہی اور دوستانہ باتیں آج بھی یاد آتی ہیں تو دل خون کے آنسو روتا ہے۔بہر حال میں نے ان کے صاحب زادے سے درخواست کی کہ وہ نسیم صاحب کے کاغذات میں تلاش کریں شائد کہیں سفر نامے کی آخری دو اقساط مل جائیں۔مجھے یقین تھا کہ نسیم صاحب نے مجھ سے جو وعدہ کیا تھا وہ ضرور پورا کیا ہوگا کیونکہ دس ماہ کی رفاقت میں کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ انہوں نے جس بات کیلئے حامی بھری ہو اسے پورا نہ کیا ہو۔اس کے علاوہ اس وقت تک سفرنامے کے ساتھ میری،سیارہ ڈائجسٹ کے قارئین اور خود نسیم صاحب کی بھی انتہائی گہری وابستگی استوار ہو چکی تھی۔ہر روز درجنوں خطوط سفرنامے سے دلچسپی اور پسند کے اظہار کے حوالے سے موصول ہو رہے تھے۔چند دن مزید اسی صبر آزما کیفیت میں گذر گئے۔ایک روز اچانک نسیم صاحب کے صاحبزادے کا فون آ گیا اور انہوں نے انکشاف کیا کہ ان کے والد (مرحوم) نے نہ صرف دونوں آخری اقساط تحریر کر کے رکھی تھیں بلکہ انہیں ایک لفافے میں بند کر کے میرے نام پوسٹ کرنے والے تھے مگر فرشتہء اجل نے مہلت نہ دی۔یہ تفصیل سن کر بے اختیار آنسو بہہ نکلے اور نسیم صاحب کی دعائے مغفرت کیلئے ہاتھ بلند ہو گئے۔

آخری دو اقساط بھی باقی سفرنامے کی طرح معلومات سے بھرپور اور نسیم صاحب کی علمی قابلیت، زبردست مطالعہ اور قوت مشاہدہ کا نچوڑ تھیں۔سفرنامے کی اشاعت مکمل ہوتے ہی ہر روز بے شمار قارئین کی طرف سے اسے کتابی صورت میں شائع کرنے کا مطالبہ ہونے لگا۔چنانچہ اسے کتاب کی شکل میں ایک ایسے سفرنامے کو پیش کیا جا رہا ہے، جو علم وآگہی کا خزانہ ہے۔

برطانوی ریلوے نظام کی حیرت انگیز تفصیلات ہوں یا انگریز ذہنیت کے بارے میں معلومات،انگریز معاشرے میں کثرت طلاق کا ذکر ہو یا برطانوی شہریت کیلئے دھوکہ بازی پر کمر

بستہ ارشد کی کہانی، اولاد کی نافرمانی، اور بے حیائی سے زندہ در گور پاکستانی والدین کا افسانہ غم ہو یا پاکستانی لڑکے لڑکیوں کی شادی کے مسائل کا تذکرہ، لندن کی تاریخی آگ کا ذکر ہو یا دھند کی وجوہات، 1665ء کی غلیظ انگریز قوم کا بیان ہو یا حق کے متلاشی پروفیسر سے ملاقات کی تفصیل۔ نیوگ کے فلسفے سے آگاہی کی بات ہو یا یکسانیت اور مشینی زندگی سے اکتائے انگریز نوجوانوں کی غم ناک کہانی۔ مذاہب عالم کا تقابل ہو یا نبی آخر الزماںؐ کے خطبہ حجتہ الوداع کے بارے میں انگریز پروفیسر کے خیالات۔ چوروں کی سردار گوری قوم کے کارنامے ہوں یا بہائی مذہب کے پیروکاروں سے ملاقات کا احوال۔ الغرض معلومات و دلچسپیوں کے خزانے نسیم صاحب (مرحوم) نے پڑھنے والوں کیلئے مہیا کر دیئے ہیں۔

اس حیرت انگیز اور دلچسپ سفر نامے کے تمام واقعات سچے اور حقیقت پر مبنی ہیں۔ اسی لئے پڑھنے والے کو نہ صرف بیش قیمت معلومات حاصل ہوتی ہیں بلکہ قاری خود کو اس شہر بے مثال میں موجود پاتا ہے۔



کامران امجد خان

ایڈیٹر سیارہ ڈائجسٹ، لاہور

0300-9430206

# لندن کو

مجھے برطانیہ آئے مہینہ بھر ہو چلا تھا۔ اس عرصہ میں میں نے برطانیہ کے خاصے علاقے دیکھ لئے تھے۔ شیفیلڈ اور اس کے نواحی علاقے دیکھے۔ ہمسایہ شہر لیڈز جہاں کی یونیورسٹی ایک عالمگیر شہرت رکھتی ہے دیکھا۔ مانچسٹر شہر دیکھا جو نہ صرف اپنے کپڑوں کے کارخانوں کے لئے مشہور ہے بلکہ لندن کے ہیتھرو ائرپورٹ کے بعد...... برطانیہ کا دوسرا سب سے بڑا ائرپورٹ وہاں واقع ہے۔ اور جہاں کپڑے کے کارخانوں کی وجہ سے کثیر تعداد میں پاکستانی بھی آباد ہیں اور ان کارخانوں میں کام کرتے ہیں۔ Barnslay بارنسلے دیکھا جو زیادہ مشہور تو نہیں لیکن خوبصورت اور قابل دید ہے۔ اس کے علاوہ ڈان کاسٹر بھی دیکھا جس میں کوئی خاص اور قابل ذکر شے نہیں پھر بھی پسند آیا۔ اس کے علاوہ دو ساحلی شہر بلکہ تفریح گاہیں۔ بلیک پول Blackpool اور سکاربرا Scarbrouah بھی دیکھے جو اپنی روشنیوں' جوا خانوں اور تفریحی مقامات کی وجہ سے بہت مشہور ہیں لیکن لندن ابھی تک نہ دیکھا تھا اور ظاہر ہے جس نے لندن نہ دیکھا اس نے برطانیہ میں کچھ بھی نہ دیکھا۔ دراصل لندن کے متعلق میں اتنا کچھ پڑھ اور سن چکا تھا کہ وہ میرے خوابوں کی دنیا بن کے رہ گیا تھا اور اسے دیکھنے کی آرزو بھی بہت تھی۔

جب میں نے لندن جانے کا ارادہ کیا تو میرے دوست طارق نے مجھے مشورہ دیا کہ اس دفعہ میں بجائے سڑک کے ٹرین کے ذریعے سفر کروں۔ اس نے مجھے اس کی کئی معقول وجوہات بتائیں۔ ایک تو یہ کہ مجھے ایک نیا تجربہ حاصل ہوگا۔ دوسری وجہ یہ کہ ٹرین کا سفر آرام دہ اور پرلطف ہوگا۔ گو یہ مہنگا ضرور ہوتا ہے۔ لیکن وقت کی پابندی کی وجہ سے لوگ بسوں اور کوچوں میں سفر کرنا پسند کرتے ہیں کیونکہ وہ بروقت تیار ملتی ہیں۔ اس لئے ٹرینوں میں جگہ کھلی ڈلی مل جاتی ہے بلکہ بعض اوقات ٹرینیں خالی چلتی ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ چونکہ برطانوی ریل کو یہ بھی علم ہے کہ وہ

لوگوں میں زیادہ مقبول نہیں اس لئے کمائی کی خاطر زیادہ سے زیادہ سہولیات مہیا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ بعض علاقوں میں تو ریل اور کوچ میں باقاعدہ مقابلہ ہوتا ہے اور ایک دوسرے کے مقابلے میں کرائے کم بھی مقرر کئے جاتے ہیں۔ اس لئے بہتر ہوگا کہ اس دفعہ تم بذریعہ ٹرین ہی سفر کرو۔

بھابی ایڈنا سے جب میں نے مشورہ مانگا تو پہلے تو وہ مسکرائیں پھر کہنے لگیں۔ چاہے ٹرین سے جاؤ چاہے کوچ سے پہنچو گے لندن ہی۔ ! بس یہ یاد رکھو کہ لندن ایک دوست شہر (Friendly city) نہیں۔ گو یہ برطانیہ کا دارالحکومت ہے لیکن پھر بھی یہ برطانوی شہر نہیں۔ برطانیہ کی بجائے یہ دنیا بھر کے لوگوں کا شہر بن کر رہ گیا ہے۔ اہل لندن لندن میں نہیں اس کے مضافات میں بستے ہیں، صبح سویرے کام کاج کے لئے شہر آتے ہیں اور شام ہوتے ہی واپس چلے جاتے ہیں۔ دنیا بھر کے کنگلے سیاح۔ غلیظ ہپی، چور، گرہ کٹ اور مجرم اس شہر میں جمع ہیں اور یہ لوگ کبھی بھی بھروسے کے قابل نہیں ہوتے۔ خود ہم برطانوی کہتے ہیں کہ لندن میں کبھی بھی اپنے سامان کی طرف پشت کرکے کھڑے نہ ہونا چاہئے کیونکہ نظر کے ہٹتے ہی مال کا پتہ نہیں چلتا، اس لئے محتاط رہنا......"

ایک انگریز کی طرف سے سب سے بڑے انگریزی شہر کی یہ تعریف کچھ زیادہ ہی حیران کن تھی جو میں نے پلے باندھ لی۔

رادھرم شہر جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ شیفیلڈ سے پانچ چھ میل کے فاصلے پر واقع ہے ان دونوں کو ایک بڑا برساتی نالہ جدا کرتا ہے وگرنہ راولپنڈی اسلام آباد کی طرح یہ دونوں بھی جڑواں شہر ہیں۔ رادھرم اسلام آباد کی طرح جدید، صاف ستھرا اور کھلا کھلا۔ اور شیفیلڈ راولپنڈی کی طرح پرانا ہے۔ شیفیلڈ ایک خاصا بڑا اور صنعتی شہر ہے جو اپنی لوہے کی فیکٹریوں اور ملوں اور لوہے کے سامان خصوصاً چھریوں چمچوں اور کانٹوں کی تیاری کے حوالے سے مشہور ہے۔ لندن سے تقریباً پونے دو سو میل دور ہے۔ بس یہ سمجھ لیجئے جیسے راولپنڈی سے لاہور۔

لندن کے علاقہ ایسٹ ہائیم میں میرے ایک سسرالی عزیز اقبال صاحب رہتے تھے۔ سب سے پہلے تو میں نے ٹیلی فون پر انہیں اپنے آنے کی اطلاع دی تو ارشاد ہوا کہ "لندن میں ایسٹ ہائیم کے اسٹیشن پر پہنچ کر پانچ پی (پنس) خرچ کرنا اور ٹیلی فون پر مجھے اطلاع دینا۔ میں آ کے تمہیں لے جاؤں گا"۔

دوسرا کام یہ کیا کہ شام کو بازار جا کے کریانے کی ایک دکان سے اگلے دن کے لئے لندن

کا ٹکٹ خرید لیا۔ برطانیہ میں ریل کا ٹکٹ لینے کے لئے ضروری نہیں کہ ریلوے اسٹیشن ہی جایا جائے۔ یہ بازار میں عام دکانوں پر بھی ملتا ہے۔ لوگ اسے کمیشن پر بھی بیچتے ہیں' بالکل اسی طرح جیسے پاکستان کے بڑے بڑے شہروں میں ریلوے بکنگ ایجنسی سے ٹکٹ خریدے جا سکتے ہیں۔ برطانیہ کے شہروں میں ایسی ایجنسیاں بے حساب ہوتی ہیں۔ اور ہر جگہ سے ٹکٹ باآسانی دستیاب ہو سکتے ہیں۔

دوسرے دن جب میں تیار ہو رہا تھا تو ایڈنا پھر میرے پاس آئی اور کچھ ہچکچاتے اور جھجکتے جھجکتے جیسے اسے افسوس ہو رہا ہو۔ بولی...... "دیکھو لندن کے متعلق جو کچھ میں نے تمہیں کل بتایا تھا وہ اتنا غلط بھی نہیں۔ بس ایک بات کا دھیان رکھنا کہ لندن میں کسی پر بھروسہ نہ کرنا۔ دراصل لندن میں بھروسے کے قابل کوئی ہوتا بھی تو نہیں...... !یہ محض لندن کی بات نہیں ہے۔ دنیا کے ہر بڑے شہر میں جہاں سیاح کثیر تعداد میں جاتے ہیں ایسی سماجی بیماریاں پیدا ہو ہی جاتی ہیں۔ پیرس' نیویارک' ٹوکیو' بمبئی' کلکتہ' ہر جگہ تمہیں ایسے لوگ ملیں گے اور ایسے ہی حالات بھی جیسے لندن میں ہیں"۔

ایڈنا کے لہجے سے معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اپنے آپ کو سمجھا رہی ہو۔ آخر کو انگریز تھی اور انگریز اپنے آپ کو دنیا کی باقی مخلوق سے بہتر اور اپنے شہروں کو دنیا کے ہر شہر سے برتر سمجھتا ہے۔ حقیقت کا اعتراف کرنا پڑ جائے تو اس کا جواز بھی تلاش کر کے رکھتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ایڈنا پھر بولی۔ "لندن پہنچتے ہی کسی بھی اسٹیشن۔ بس کے اڈے یا ڈاک گھر کہیں سے بھی لندن کا نقشہ ضرور لے لینا اور اس کے مطابق سیر کرنا۔ ورنہ گم ہو کر رہ جاؤ گے۔ لندن بہت بڑا شہر ہے۔ اکیلے دکیلے آدمی کا ویسے بھی پتہ نہیں چلتا اور سن لو کہ لندن کا نقشہ مفت ملتا ہے۔ قیمتاً نہیں اور ہاں ایک بات اور یاد رکھو۔ زیادہ رات گئے تک بازاروں میں مت گھومنا۔ سورج ڈوبتے ہی شہر کچھ خطرناک بھی ہو جاتا ہے۔"

دوسرے دن صبح ہی صبح ایڈنا مجھے رادھرم کے ننھے منے اسٹیشن پر چھوڑ گئی جس کی حالت ہمارے دیہاتی اسٹیشنوں سے بھی گئی گزری تھی۔ بلند و بالا اکلوتے شیڈ کے نیچے ایک ہی بینچ پڑا تھا جس پر ایک ہی بوڑھا مسافر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ میں بھی خاموشی سے بینچ پر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا اور ٹرین کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ٹرین آ گئی۔ اونگھتا ہوا مسافر بھی اٹھا اور ہم دونوں ہی سامنے کھڑے ہوئے ڈبے میں سوار ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ پورے ڈبے میں ہم دو ہی مسافر ہیں۔ بوڑھے مسافر نے بیٹھتے ہی دوبارہ اونگھنا شروع کر دیا اور میں اس سے

دور دوسرے کونے میں بیٹھ کر باہر کا نظارہ کرنے لگا۔ گاڑی فوراً ہی چل دی اور لگ بھگ بارہ پندرہ منٹ میں شیفیلڈ پہنچ گئی۔ اونگھتا ہوا مسافر ہوشیار ہوا اور فوری طور پر ٹرین سے اتر کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے بھی اپنا سوٹ کیس سنبھالا بمعہ ٹرین سے اتر آیا۔ مسافر نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا۔ گرم جوشی سے خدا حافظ کہا اور اس سے قبل کہ میں کچھ کہہ سکتا اس نے اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور تیزی سے چلتا بنا۔ میں کچھ حیران بھی ہوا اور مسکرایا بھی کہ کیا انداز ہیں انگریزی اخلاق کے......! اس طویل سفر کے ساتھی کو الوداع کہنا بھی تو ضروری تھا ورنہ انگریزی اخلاق کا کیسے پتہ چلتا!

شیفیلڈ کا ریلوے اسٹیشن لاہور کے ریلوے اسٹیشن سے زیادہ مختلف نہیں۔ بس چھوٹائی بڑائی کا فرق ہے۔ لاہور کا ریلوے اسٹیشن بہت بڑا ہے۔ وہی انداز، وہی بلند و بالا شیڈ اور ان میں آر پار اترتی ہوئی سیڑھیاں جیسے لاہور اسٹیشن کی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہاں گورے لوگ چل پھر رہے تھے لیکن بہت کم...... اس لئے خالی خالی لگ رہا تھا جبکہ لاہور کا اسٹیشن ہر وقت بھرا رہتا ہے لوگوں سے بھی اور ٹرینوں سے بھی۔

معلوم ہوا کہ جس ٹرین سے ہم آئے تھے وہ شیفیلڈ پر ہی ختم ہو جاتی تھی۔ اب شمال سے ایک اور ٹرین آئے گی جو ہمیں لندن لے جائے گی اور اس کے آنے میں ابھی آدھ گھنٹہ باقی ہے۔ چنانچہ آدھ گھنٹہ کی فرصت تھی کہ گھوم پھر لیں۔ میں نے بلا مقصد اس لق و دق اسٹیشن کا چکر لگایا پھر کونے میں بنے چائے کے اسٹال سے ایک کپ چائے کا خریدا اور ایک بینچ پر بیٹھ کر چسکیاں لینے لگا۔ اتنے میں باہر کی طرف سے ایک بڑی بی ایک بھاری سا سوٹ کیس اٹھائے تیز تیز قدموں سے ہانپتی کانپتی اسٹیشن کے اندر داخل ہوئیں۔ سامنے ہی وہ بینچ تھا جس پر میں بیٹھا چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔ وہ تیر کی طرح آئیں اور سیدھے سبھاؤ اپنا سوٹ کیس بینچ پر دھر دیا اور دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر کھڑی ہو گئیں۔ کچھ دیر مجھے گھورتی رہیں جیسے اندازہ کر رہی ہوں کہ یہ کون ہو سکتا ہے۔ پھر آہستہ سے بینچ پر میرے ساتھ ہی بیٹھ گئیں اور ادھر اُدھر نظریں دوڑانے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد ریلوے کے ایک ملازم کا ادھر سے گزر ہوا تو اسے اشارے سے بلایا جب وہ قریب آیا تو ڈپٹ کر پوچھا۔ کیا تم یہاں کوئی بڑے افسر ہو۔؟ "Are you a big gun here.?"۔ غریب ملازم اس ناگہانی افتاد سے گھبرا گیا اور گھگھیا کر بولا "نہیں مادام۔!" اس پر بڑی بی تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور تحکمانہ لہجے میں بولیں۔ "میرا سوٹ کیس اٹھاؤ اور دو نمبر پلیٹ فارم پر لے چلو۔ میں نے اسکاٹ لینڈ کے لئے P-125 ٹرین پکڑنی ہے"۔ غریب ملازم نے بغیر چوں

چرا کئے سوٹ کیس اٹھایا اور بڑی بی کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گیا۔ میرے لئے یہ واقعہ نہ صرف دلچسپ بلکہ حیرت انگیز بھی تھا کیونکہ اس قسم کے واقعات جاگیرداری ماحول میں ہی ممکن ہیں تو کیا مادر جمہوریت برطانیہ میں ابھی بھی جاگیردارانہ نظام کہیں کہیں سر چھپائے بیٹھا ہے؟

شیفیلڈ کے وسیع و عریض ریلوے اسٹیشن کے سنسان پلیٹ فارم پر پورا آدھا گھنٹہ بوریت سے بھرپور انتظار کرنا پڑا تب جا کر دندناتی ہوئی ایک تیز رفتار ٹرین پلیٹ فارم پر آ کے رکی۔ میں نے بھی جلدی سے اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور جو بھی ڈبہ سامنے آن کے رکا اس میں سوار ہو گیا۔ یہ ٹرین لندن جا رہی تھی لیکن اسٹیشن کی طرح یہ بھی کم و بیش خالی تھی۔ میرے ڈبے میں بھی اکا دکا مسافر علیحدہ علیحدہ سیٹوں پر بیٹھے تھے اور ایک دوسرے سے قطعی بے زار لگ رہے تھے۔ ڈبے میں داخل ہوتے ہی دائیں طرف ایک کمرہ سا بنا ہوا تھا جس میں تہ بہ تہ بینچیں سی بنی ہوئی تھیں اور ان بینچوں پر مسافروں کے سوٹ کیس اور دیگر سامان دھرا تھا۔ دائیں طرف دو سائیکلیں کھڑی تھیں۔ یہ کمرہ مسافروں کے سامان رکھنے کی جگہ تھی اور مسافر ڈبے میں داخل ہوتے ہی اپنا سامان اس کمرہ کی بینچوں پر رکھ دیتے اور خود اپنی اپنی سیٹوں پر جا کے براجمان ہو جاتے اسی لئے کسی بھی مسافر کے پاس کوئی سامان نہ تھا۔ پاکستان میں یہ ناقابل تصور ہے کہ مسافر اپنے سامان سے علیحدہ رہے۔ اگر رکھنا بھی ہو تو اس کے لئے ٹرین میں لگیج علیحدہ ہوتا ہے جہاں سامان رکھنے کے بعد باقاعدہ رسید حاصل کی جاتی ہے۔ اس طرح اللہ بھروسے پر سامان رکھنے کا کوئی تصور نہیں ورنہ منزل مقصود تک پہنچتے پہنچتے ایک بھی سوٹ کیس یا سامان باقی نہ بچے۔ بھلا جہاں مسافر کے ساتھ رکھا ہوا سامان بعض اوقات محفوظ نہیں رہتا وہاں اللہ توکل رکھے سامان کا اللہ ہی حافظ ہوتا ہے میں نے بھی اپنا پاکستانی تشخص برقرار رکھا اور اپنا سوٹ کیس اپنے پاس ہی رکھا بلکہ اسے سیٹ پر کھڑکی کے ساتھ رکھ کر اس سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک کالا حبشی ٹکٹ چیکر آیا۔ مجھے اور میرے سوٹ کیس دونوں کو دیکھ کر مسکرایا مگر کچھ بولا نہیں۔ تھوڑی دیر بعد میں نے سوٹ کیس اٹھا کے سیٹ کے نیچے رکھ دیا اور کھڑکی سے لگ کر آرام سے بیٹھ گیا۔

ڈبے کے آخر میں ایک کیبن سا بنا ہوا تھا جس پر کھانے پینے کی اشیاء فروخت ہوتی تھیں۔ وہاں ایک خاتون ایپرن پہنے بڑے آرام سے بیٹھی مسافروں کا تماشا دیکھ رہی تھیں۔ کبھی کبھار کوئی مسافر خاتون کو زحمت دیتا اور بسکٹ' چاکلیٹ یا چائے قسم کی کوئی چیز خرید لاتا۔ بڑی بی لحہ بھر کے لئے اپنی جگہ سے ہلتیں۔ چیز پکڑاتیں۔ دام وصول کرتیں۔ تھینک یو کہتیں اور پھر آرام

سے اپنے اسٹول پر بیٹھ کر تماشا دیکھنے میں مشغول ہو جاتیں۔ ''واہ یہ تو بڑا اچھا انتظام ہے۔!'' میں نے بھی دل ہی دل میں داد دی۔

ادھر ٹرین کے ہر ڈبے میں کئی کئی لاوڈ اسپیکر لگے ہوئے تھے جن سے اعلانات کئے جاتے تھے۔ یہ ایک نئی چیز تھی کیونکہ پاکستان میں یہ انتظام نہیں۔ ہاں البتہ بڑے بڑے اسٹیشنوں پر لاوڈ اسپیکر کا انتظام ہے جہاں سے ٹرینوں کے آنے اور جانے کے اعلانات سنے جاسکتے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد اعلان ہوا کہ شیفیلڈ جنکشن سے لندن کے لئے ٹرین روانہ ہونے والی ہے اور صرف برمنگھم پر رکے گی۔ بیچ کے مسافر از راہ کرم اس میں نہ بیٹھیں۔

ٹھیک پندرہ منٹ بعد ٹرین نے جھٹکا لیا اور رینگنے لگی۔ پلیٹ فارم اور اس پر کھڑے ہوئے لوگ پیچھے کھسکنے لگے۔ یک لخت ہر طرف روشنی سی ہوگئی۔ اتنی دیر تک اندھیرے میں رہنے کے بعد ایک دم جو باہر نکلے تو آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ معلوم ہوا کہ ہم شیڈ سے باہر نکل آئے ہیں اور اب سورج کی روشنی میں رواں دواں ہیں۔ ٹرین نے تھوڑی دیر میں ہی سپیڈ پکڑ لی اور جب شہر سے باہر نکل رہی تھی تو واقعی فراٹے بھر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہی کالا کنڈیکٹر تھکا ماندہ میرے برابر آکے بیٹھ گیا۔ کانی آنکھ سے میرے سوٹ کیس کی طرف دیکھا اور اسے نہ پاکر بلکہ مجھے سوٹ کیس کی جگہ دیکھ کر مسکرا دیا۔

اسی کنڈیکٹر نے بتایا کہ برطانوی ٹرین کی انتہائی رفتار اسی اور نوے میل کے درمیان ہوتی ہے اور یہ کہ یہ ٹرین لندن تک کا پونے دوسو میل کا فاصلہ تین گھنٹے میں طے کرے گی اس دوران فقط ایک شہر یعنی برمنگھم پر رکے گی۔ راستہ میں کراسنگ وغیرہ کا سلسلہ بھی نہیں۔ اس لئے تین گھنٹے میں لندن پہنچ جائے گی۔ پاکستان میں ٹرینوں کی انتہائی رفتار ساٹھ میل فی گھنٹہ ہے اور بالعموم چالیس اور پچاس کے درمیان چلتی ہیں۔ راستہ میں کراسنگ وغیرہ بھی ہوتی ہے۔ پھر یہ کہ وقت پر پہنچنے کی اتنی پرواہ بھی نہیں کی جاتی۔ دیر ہوتی ہے تو ہو جائے چنانچہ اوسط رفتار تیس میل سے بھی کم رہ جاتی ہے۔ چنانچہ عام ٹرینیں لاہور سے راولپنڈی کا پونے دوسو میل کا فاصلہ چھ سے سات گھنٹے میں طے کرتی ہیں۔

چلتی ٹرین سے باہر کا نظارہ چاہے باہر چٹیل میدان ہی کیوں نہ ہوں ہمیشہ دلچسپ ہوتا ہے۔ لیکن یہاں تو باہر...... ہرے بھرے کھیت اور ان کے درمیان چھوٹی چھوٹی ماڈرن بستیاں آباد تھیں۔ چنانچہ یہ سفر بڑا دلچسپ اور دل موہ لینے والا ثابت ہو رہا تھا۔ ان نظاروں میں وقت کا

پتہ ہی نہیں چلا بس ایک خلل اس وقت آیا جب اچانک ہی بڑی بڑی عمارتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ٹرین کے ساتھ لوہے کے جنگلے دوڑنے لگے۔ ٹرین کی رفتار یکدم کم ہو گئی اور پھر اچانک ہی ایک اسٹیشن پر رک گئی۔ برمنگھم شہر آ گیا تھا۔ برطانیہ کا یہ جدید شہر پاکستان میں اس لئے مشہور ہے کہ یہاں پاکستانی کثیر تعداد میں آباد ہیں۔

برطانیہ کے تین شہروں کو پاکستانیوں نے اپنے لئے خاص طور پر پسند کیا ہے۔ ان میں پہلا بریڈفورڈ ہے جہاں زیادہ تر وہ پاکستانی آباد ہیں جو کم تعلیم یافتہ اور مزدور پیشہ ہیں۔ ان میں زیادہ تر میرپور آزاد کشمیر کے رہنے والے ہیں۔ یہ پاکستانی یہاں اس وقت سے آنا شروع ہوئے جب پاکستان میں منگلا بند بننا شروع ہوا۔ منگلا بند میں پورا کا پورا میرپور ڈوب گیا چنانچہ ان لوگوں کی زمینوں کے عوض حکومت پاکستان نے انہیں جی کھول کر پیسہ دیا۔ ان میں سے چند لوگ رقم حاصل کرتے ہی ولایت دیکھنے کے چاؤ میں برطانیہ جا پہنچے جہاں مزدوروں کی کمی تھی چنانچہ ان لوگوں نے اپنے رشتہ داروں کو بلانا شروع کر دیا۔ پھر تو یہ حال ہوا کہ جس کسی کو بھی رقم ملتی سیدھا بریڈفورڈ کا رخ کرتا۔ چنانچہ یہاں کثیر تعداد میں پاکستانی آباد ہیں' اور یہ وہ لوگ ہیں جن کی عجیب وغریب حرکتوں کی وجہ سے پاکستان خاصا بدنام ہو رہا تھا۔ ان لوگوں کی دوسری نسل پڑھ لکھ کر انگریزی تہذیب سے آشنا ہو گئی چنانچہ شکایات بھی کم ہونے لگیں اب تیسری نسل پروان چڑھ چکی ہے۔ جس کا پاکستان سے کوئی واسطہ نہیں لیکن اپنے رنگ کی وجہ سے پاکستانی ہی کہلاتے ہیں۔

دوسرا...... مشہور صنعتی شہر گلاسگو ہے جو اسکاٹ لینڈ میں واقع ہے۔ پاکستان کے تاجر طبقے نے اسے اپنی رہائش کے لئے پسند کیا۔ اس طبقہ نے محنت اور ایمانداری سے تجارت کر کے اپنے ملک کا نام بلند کیا۔ گلاسگو اور اس کے نواح میں پاکستانیوں نے بڑے بڑے تجارتی مراکز اور بہت بڑے بڑے سپر اسٹور قائم کر رکھے ہیں۔ خود انگریز سینکڑوں کی تعداد میں ان پاکستانیوں کی ملازمت کرتے ہیں' انگریز بذات خود ایک تاجر قوم ہے اس لئے گلاسگو کے پاکستانیوں کی بہت عزت کرتی ہے۔ گلاسگو کے پاکستانی مل جل کر رہتے ہیں انہوں نے کئی کمیونٹی سینٹر بھی قائم کر رکھے ہیں جہاں نہ صرف تقریبات ہوتی ہیں بلکہ پاکستانی مل بیٹھ کر اپنے مسائل بھی حل کرتے ہیں۔ یہاں کے پاکستانیوں نے لاکھوں پونڈ صرف کر کے ایک بہت بڑی مسجد بنائی ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

تیسرا...... شہر برمنگھم ہے جو پڑھے لکھے اور شاعر و ادیب قسم کے پاکستانیوں سے بھرا پڑا

ہے۔ شاید اس شہر کو ایسے ہی لوگ راس آتے ہیں کیونکہ اس شہر سے لگ بھگ پچیس میل دور شیکسپیئر پیدا ہوا تھا اور اس کی یادگار اب تک وہاں باقی ہے، برمنگھم میں بڑے بڑے مشاعرے اور محفلیں ہوتی ہیں جن میں پاکستان، ہندوستان بلکہ دنیا بھر سے اردو کے شعرا اور ادباء کو مدعو کیا جاتا ہے۔ ان پاکستانیوں کو عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

برمنگھم اسٹیشن پر خاصی رونق بلکہ رش تھا کیونکہ جمعہ کا دن تھا اور اگلے دو دن تعطیلات تھیں اس لئے لوگ بڑی تعداد میں لندن جا رہے تھے۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے ہمارا ڈبہ بھی کم وبیش بھر گیا لیکن اب بھی نشستیں مسافروں سے زیادہ ہی تھیں اتنے میں آٹھ دس نوخیز و نوجوان لڑکیوں کا ایک گروہ بچوں کی طرح ہنستا اور شور مچاتا داخل ہوا تو خاموشی کی نیند میں سویا ہوا ڈبہ اک دم جاگ اٹھا اور اک رونق سی آ گئی۔ یہ شوخ وچنچل لڑکیاں ہنسی مذاق کرتی ہوئی داخل ہوئیں اور ادھر ادھر دیکھ کر میری اور میرے سامنے والی بینچوں پر بیٹھ کر شور مچانے لگیں۔ ڈبے کے مسافر بھی ان کی طرف متوجہ ہو گئے اور مڑ مڑ کر دیکھنے لگے۔ کچھ نے نگاہوں کے ذریعے ناراضگی کا اظہار بھی کیا لیکن جواب میں ان لڑکیوں نے قہقہے تیز کر دیئے نتیجہ یہ ہوا کہ ناراض نگاہیں خاموشی سے واپس آ گئیں۔ کچھ بڑے بڑبڑائے بھی لیکن خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ لڑکیاں بدستور ہنسی مذاق کرتی رہیں ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ سب نے مل کر اپنے میں سے ہی ایک کو نشانہ بنا رکھا ہے اور سب مل کر اسے تنگ کر رہی تھیں وہ بھی غریب کبھی کبھار ایک آدھ جواب دے کر حساب برابر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

باہر پلیٹ فارم پر دلچسپ نظارہ تھا۔ دو حضرات اونچی اونچی آواز میں لڑ رہے تھے۔ دونوں مہذب اور پڑھے لکھے لگتے تھے۔ دونوں نے عمدہ تراش کے سوٹ پہن رکھے تھے۔ معاملہ یہ تھا کہ ان میں پہلے سے کچھ بحثا بحثی چل رہی تھی۔ ان میں سے جو کمزور سا تھا اس نے غالباً اپنی بات پر زور دینے کے لئے اتفاقاً مخالف کے سینے پر انگلی سے ٹھوکا سا لگایا تھا جس پر ٹھوکا کھانے والے صاحب یکدم بھڑک اٹھے تھے اور اب اپنی دونوں انگلیوں کا ٹھوکا بنا کر بار بار اسے مارے جا رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ تم نے کیا سمجھ کر مجھے ٹھوکا مارا تھا۔ میں بھی تمہیں ٹھوکا مار سکتا ہوں۔ اصل موضوع تو ایک طرف رہ گیا تھا اور یہ ٹھوکا بازی جاری تھی۔ دوسرے صاحب ٹھوکا کھاتے جا رہے تھے اور شور مچاتے جا رہے تھے۔ لطف کی بات تھی کہ ان کے مشترکہ شور کی وجہ سے متوجہ سب ہی تھے لیکن آگے کوئی نہیں بڑھ رہا تھا۔ کوئی حیران ہو رہا تھا کوئی زیرلب مسکرا رہا تھا۔ ہمارے ڈبے کے قریب کھڑا ایک نوجوان اپنی ساتھی لڑکی سے کہہ رہا تھا کہ "کم بخت دونوں ہی اسکاٹ معلوم

ہوتے ہیں'' اور لڑکی مسکرا مسکرا کر اس کی تائید میں سر ہلا رہی تھی۔

اتنی دیر میں لاؤڈ اسپیکر پر گاڑی کی روانگی کا اعلان ہو گیا۔ ابھی گاڑی نے کھسکنا ہی شروع کیا تھا کہ ایک نوجوان خاتون ایک چھوٹا سا بیگ اٹھائے تیزی سے دوڑتی ہوئی ڈبہ میں داخل ہوئی۔ ادھر ادھر دیکھا پھر تیزی سے میرے سامنے والی سیٹ جو خالی تھی۔ کی طرف تیزی سے بڑھی اور اس پر بیٹھ کر تیز تیز سانس لینے لگی۔ پھر میری طرف خالی نظروں سے دیکھتے ہوئے خود کلامی سی کرنے لگی۔ ''آخر کار۔ میں نے ٹرین پکڑ ہی لی۔ اب میں اپنے اینڈریو سے ملونگی اور ضرور ملونگی...... کسی کی طرف سے جواب نہ پا کر اس نے اپنا سنہری چشمہ اتارا۔ بیگ میں سے رومال نکال کر پسینہ پونچھا اور پھر آرام سے سیٹ پر ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

اتنی دیر میں ٹرین نے اسٹارٹ لے لیا تھا۔ لڑتے نوجوان پیچھے رہ گئے۔ اسٹیشن بھی پیچھے کی طرف دوڑنے لگا اسٹیشن پر بنی بینچوں پر بیٹھے ہوئے لوگ خوانخواہ ہی ہاتھ ہلا ہلا کر ٹرین کے مسافروں کو الوداع کہنے لگے۔ یہ منظر خاصا دلچسپ تھا اور میں پوری طرح اس میں محو تھا۔ جب ریلوے لائن کے ساتھ بنی ہوئی ریلنگ بھی پیچھے رہ گئی تو یکدم احساس ہوا کہ سامنے بیٹھی ہوئی خاتون مجھ سے کچھ کہہ رہی ہے۔

''جی فرمایئے......!'' میں نے عاجزی سے دریافت کیا۔

خاتون نے کچھ کہے بغیر بائیں طرف اشارہ کر دیا جہاں اس شریر گروہ کی تین لڑکیاں کھڑی تھیں۔ لجائی شرمائی۔

مجھے متوجہ دیکھ کر تینوں نے ایک دوسرے کو ٹھوکے مارنے شروع کر دیئے جیسے ایک دوسرے سے کہہ رہی ہوں کہ ''تم پوچھو......!''

ایک دو منٹ تو یہ تماشا چلتا رہا۔ پھر درمیان والی لڑکی جو قد میں دونوں سے کچھ لمبی تھی۔ کہنے لگی۔

''ایکسکیوزمی "Excuse me"......! ہم آپ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔ آپ برا تو نہیں مانیں گے۔؟''

میں نے جواب دیا...... ''یہ تو سوال پر منحصر ہے۔! ویسے پوچھیئے۔ کیا پوچھنا چاہتی ہیں آپ۔؟''

اس لڑکی نے کانوں میں خوبصورت لمبے بندے پہن رکھے تھے جو ہلتے ہوئے

خوبصورت لگتے تھے اور وہ انہیں جان بوجھ کر ہلا رہی تھی۔ اس نے جھجکتے جھجکتے پوچھا...... ''کیا آپ مسلمان ہیں۔؟''

''الحمدللہ...... میں ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''لیکن۔ دراصل...... آپ کیا ہیں؟۔'' بائیں طرف کھڑی ناٹے قد کی شوخ لڑکی نے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ خدا کا شکر ہے کہ میں مسلمان ہوں۔ لیکن میں حیران ہوں کہ اس معاشرے میں جہاں عورت کی عمر۔ مرد کی تنخواہ اور کسی کا مذہب پوچھنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ مجھ سے ایسا سوال کیا جارہا ہے۔ حیرانگی کی بات ہے؟''

ڈبے میں خاموشی سی چھا گئی۔ گاڑی کی گڑگڑاہٹ کچھ بڑھ گئی۔ اردگرد کے مسافر ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔

میرے سوال کے جواب میں لڑکیاں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔ پھر لمبی لڑکی نے ہمت سے کام لیا اور عجیب سی لجاجت سے بولی۔

''میں...... بلکہ ہم سب معافی چاہتے ہیں، واقعی ایسا سوال ہمارے معاشرے میں معیوب سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ہم کسی خاص مقصد سے یہ سوال پوچھ رہے ہیں۔ ہمارا مقصد آپ کی نجی زندگی ٹٹولنا یا آپ کی بے عزتی کرنا نہیں ہے۔ ہم تو آپ سے فقط چند معلومات حاصل کرنا چاہتی ہیں؟ جو صرف ایک مسلمان ہی مہیا کر سکتا ہے۔ اب آپ بتائیں کیا آپ ہندوستانی ہیں۔؟''

پہلے سوال کی طرح یہ بھی ایک معیوب سوال تھا۔ میں نے جواب میں کہا۔

''جی نہیں...... میں پاکستانی مسلمان ہوں۔!''

تینوں لڑکیاں جیسے خوش ہو گئیں اور سامنے کی خالی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ پہلی لڑکی نے ایک لمبی سی سانس لی اور جیسے مطمئن سی ہو کر بولی۔

''میرا ایک مسئلہ ہے۔ میرا ایک بوائے فرینڈ ہے۔ پاکستانی مسلمان...... لاہور سے تعلق رکھتا ہے۔ ہماری دوستی عرصہ سے ہے۔ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ مجھے اس سے محبت ضرور ہے لیکن مسلمانوں سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ مسلمان بلکہ پوری مسلمان قوم ہی عیاش ہوتی ہے کیونکہ ان کا مذہب انہیں چار شادیوں کا حکم دیتا ہے۔ ان کے پیغمبر نے بھی دس سے زیادہ شادیاں کی تھیں۔ مسلمانوں کے عام طور پر بڑے بڑے حرم ہوتے ہیں۔ وہ عورتوں کی قطعی

پرواہ نہیں کرتے۔ ان کو پاؤں کی جوتی سمجھتے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر طلاق دے دیتے ہیں۔ شادی سے پہلے تو خوب محبت کرتے ہیں۔ شادی کے بعد غیرت کے نام پر بیوی کو قید کر کے گھر میں بٹھا دیتے ہیں۔ باہر نکلنے نہیں دیتے...... کیا یہ سچ ہے۔؟ میرا بوائے فرینڈ تو کہتا ہے کہ یہ سب کچھ غلط ہے لیکن مجھے اس کی بات کا یقین نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بھی حرم بنانا چاہتا ہو۔ اور اپنے مطلب کے لئے مجھ سے جھوٹ بول رہا ہو۔ ہم کسی مسلمان پادری سے نہیں پوچھنا چاہتے جو ظاہر ہے اپنے مذہب کی خاطر ضرور جھوٹ بولے گا۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ کسی ایسے راہ چلتے مسلمان سے یہ باتیں پوچھیں جو ہمیں جانتا تک نہ ہو۔ مزید یہ کہ اس سے دوبارہ ملنے کا امکان تک نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص جھوٹ کیوں بولے گا؟۔ خوش قسمتی سے آپ نظر آ گئے تو ہم نے فیصلہ کیا کہ آپ سے ان سوالات کا جواب حاصل کیا جائے۔!

ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ یہ لڑکی نہیں بول رہی تھی بلکہ عیسائی پادریوں اور نام نہاد مستشرقین کا صدیوں پرانا جھوٹ بول رہا تھا۔ وہ لڑکی غریب کرے بھی کیا جس کو بتایا ہی یہ گیا ہو کہ پوری مسلمان قوم ہی عیاش ہے اور ہر مسلمان کو چار چار شادیوں کا حکم دیا گیا ہے اس لئے ہر مسلمان چار چار بلکہ چھ چھ شادیاں کرتا ہے اور جو نہیں کرتا وہ سچا مسلمان نہیں کہلاتا۔ آخر صدیوں کا پروپیگنڈہ اپنا کچھ تو اثر رکھتا ہے۔

میں نے جواب دیا۔ "ہماری رفاقت تھوڑی ہے۔ اور اس مختصر سے وقفے میں اتنے سارے سوالوں کا جواب دینا مشکل ہے۔ صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ جو کچھ تم نے سنا ہے وہ سب غلط ہے اور بے بنیاد پروپیگنڈہ ہے جو عرصے سے تمہارے ذہنوں میں انڈیلا جا رہا ہے۔ اگر میں تمہیں بتاؤں کہ اسلام ہی دنیا میں ایک ایسا مذہب ہے جو عورت کی عزت کرنا سکھاتا ہے تو کیا تم یقین کرو گی؟ اگر تم تھوڑی سی بھی تاریخ پڑھو تو تمہیں خود بخود پتہ چل جائے گا کہ اسلام سے قبل عورت ذات کو نجس اور ناپاک چیز سمجھا جاتا تھا۔ خود آپ کی عیسائیت اپنی ابتدائی صدیوں میں اس بات پر غور کرتی رہی کہ آیا عورت انسان بھی ہے یا نہیں؟ مرد نے کبھی بھی عورت کو اپنے برابر کا درجہ نہیں دیا تھا لیکن یہ اسلام ہی ہے جو دونوں کو برابر قرار دیتا ہے اور ایک دوسرے کا لباس بتلاتا ہے۔ اسلام سے قبل شادیوں پر کوئی قید نہیں تھی۔ مرد اپنے اپنے حرم بنایا کرتے تھے اور اس میں بھیڑ بکریوں کی طرح عورتیں بھر لیا کرتے تھے۔ جس کے پاس جتنی زیادہ عورتیں ہوتی تھیں اتنا ہی معزز شخص گنا جاتا تھا۔ رومن شہنشاہیت کی تاریخ پڑھیں۔ یونانی تاریخ کی ورق گردانی کریں۔ اس طرح کی

داستانوں سے پُر ملیں گی۔ تاریخ عالم میں اسلام نے پہلی دفعہ ان درجنوں اور سینکڑوں کی تعداد کو چار تک محدود کیا کہ اس سے زیادہ نہیں کی جاسکتیں۔ پھر یہ حکم نہیں فقط اجازت ہے وہ بھی کٹھن شرائط کے ساتھ اور محض اس لئے کہ جنگ میں کام آنے والے سپاہیوں کی بیواؤں اور لاوارث عورتوں اور بچوں کو سنبھالا جاسکے تاکہ وہ بدکاری کی راہ پہ نہ چل نکلیں۔ وگرنہ ایک سے دوسری شادی کے لئے اتنی سخت شرائط ہیں کہ دانتوں تلے پسینہ آجائے۔ اب آپ مجھے بتائیں کہ آپ کے یہاں طلاق یافتہ یا بیوہ ہونے کی صورت میں عورت کیا کرتی ہے۔ کیا کوئی اس کا والی وارث بنتا ہے؟ کیا وہ کمانے کے لئے نہیں نکلتی اور غیر مردوں کے ہاتھوں کھلونا نہیں بنتی؟۔ اسلام نے ہر عورت کسی نہ کسی مرد کی ذمہ داری میں دی ہے۔ بچی ہوتی ہے تو باپ ذمہ دار ہوتا ہے۔ باپ کی عدم موجودگی میں بھائی۔ شادی کے بعد خاوند۔ پھر بیٹے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اگر ان میں سے بھی کوئی نہ ہو تو خاندان کا کوئی بھی فرد ان کا ذمہ دار ہوتا ہے اگر وہ بھی نہ ہو تو حکومت ذمہ دار ہوتی ہے۔ یہ عورت کے تحفظ کا کتنا سنہری نظام ہے۔

اب رہی بات طلاق کی۔ تو طلاق دینا اسلام میں کوئی کھیل یا مذاق نہیں۔ اس کے لئے بھی کڑی شرائط ہیں اور ہمارے یہاں طلاق دینے اور لینے والے کو معاشرہ اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔ اس لئے اسلام میں طلاقیں آپ لوگوں کی نسبت دس فیصد بھی نہیں ہوتیں۔ باقی رہی بات قید کرنے کی کہ عورت شادی کے بعد قید کردی جاتی ہے تو سچی بات یہ ہے کہ آپ نے پاکستان دیکھا نہیں۔ وہاں کی عورتیں انگلستان کی عورتوں سے زیادہ آزاد ہیں لیکن وہ خود باہر نکلنا اور آوارہ گردی کرنا پسند نہیں کرتیں۔ ہمارے ملک میں حکومت کے اعلیٰ ترین عہدے سے کم ترین عہدے سب پر عورت ملے گی۔ عورتیں پائلٹ۔ جج۔ ٹیچر غرض ہر شعبہ میں ملیں گی۔''

پھر یکایک میں نے ایک سوال داغ دیا۔ ''برمنگھم شہر میں لگ بھگ دس ہزار پاکستانی خاندان آباد ہیں۔ ان میں سے کئی گھرانوں سے تم لوگ بھی واقف ہوگی۔ اب تم یہ بتاؤ کہ ان میں سے کتنوں کے گھر میں ایک سے زائد بیویاں ہیں؟''۔

لڑکیاں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں جیسے سوال کا جواب سوچ رہی ہوں۔ پھر یکایک وہ لمبی سی لڑکی بولی۔ ''چار پانچ گھرانوں سے تو میں بھی واقف ہوں۔ ان میں تو ایک ایک بیوی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تمہارا جائزہ صحیح ہے۔ تم اگر پاکستان بھی جا کے دیکھو تو وہاں بھی تمہیں

شاذونادر ہی کسی گھر میں دوسری بیوی ملے گی۔ تیسری اور چوتھی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ اگر دوسری بھی ہوگی تو وہ زمانے کی ستائی ہوئی بیوہ قسم کی ہوگی جس کی مدد یا سہارے کے لئے اس کے خاوند نے شادی کی ہوگی۔!"

ہماری بحث خاصی طویل ہوتی جارہی تھی کہ اچانک ٹرین ایک طویل پل پر سے گزری۔ گڑگڑاہٹ کی آواز ایک شور میں بدل گئی جس کی وجہ سے بات چیت کچھ عرصہ کے لئے تھم گئی۔

پل گزرنے کے بعد جب شور تھما۔ تو میں نے مدافعت کی بجائے جارحیت اختیار کرلی۔

تم خودسوچو۔ حضرت عیسیٰؑ کو لگ بھگ تین سال کے لئے پیغمبری ملی۔ ان کی عمر 27 سال اور بعض ذرائع کے مطابق 30 سال تھی گویا وہ اپنی جوانی کے عروج پر تھے لیکن نبوت کی ذمہ داری کے باعث انہیں شادی کا موقع نہ مل سکا اس لئے ازدواجی زندگی کا خانہ خالی رہا۔ اس لئے عیسائیت میں ازدواجی زندگی کی تربیت اس طرح نہ ہوسکی جیسے پیغمبر اسلامؐ نے کی۔ چنانچہ عیسائیت میں فقط احکامات ہی احکامات ہیں۔ ان پر پیغمبر عمل کر کے نہ دکھا سکے۔ عیسائیت میں فقط ایک ہی شادی کی اجازت ہے اور طلاق کا کوئی تصور نہیں خصوصاً رومن کیتھولک میں تو سخت ممانعت ہے۔ اب فرض کرو۔ شادی کے بعد میاں بیوی میں سے کوئی بدکار نکل جائے۔ بدقسمتی سے پاگل ہو جائے یا جسمانی طور پر بیمار یا معذور ہو جائے ...... یا پھر دونوں میں ذہنی ہم آہنگی نہ ہوسکے تو کیا خیال ہے دوسرا ساتھی کیا ساری عمر کڑھتا رہے یا جہنم میں جلتا رہے اور اس سے نجات پانے کا کوئی ذریعہ نہ ہو۔ گویا زندگی عذاب میں کٹے۔ یہ غیر فطری چیز ہے۔ جو لوگ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے ساتھ رہنے پر مجبور ہوں وہ ضرور اس سے فرار کا راستہ ڈھونڈتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ راستہ بدکاری کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ چنانچہ دیکھ لیں یورپ بھر میں کس قدر بدکاری پھیلی ہوئی ہے۔ میاں بیوی کھلم کھلا ایک دوسرے کے سامنے ہی غیر کے ساتھ چلے جاتے ہیں۔ اسلام نے اس عذاب سے نجات پانے کا ایک فطری اور باعزت طریقہ یا راستہ تجویز کیا ہے وہ طلاق ہے کہ میاں بیوی اگر یہ سمجھیں کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی نہیں گزار سکتے تو وہ ایک دوسرے کے اعصاب پر سوار ہونے کی بجائے باعزت طریقہ سے علیحدہ ہو جائیں۔ اس ضمن میں خاوند کے لئے خاص ہدایات ہیں کہ وہ بغیر کسی وجہ کے طلاق نہ دے۔ طلاق دے تو خوش دلی کے ساتھ اور بیوی کو احسن طریقے سے مال و دولت دے کر رخصت کرے اور پھر اگر مطلقہ دوسری شادی کرنا چاہے تو اس میں رکاوٹ نہ بنے۔ اس طرح اسلام نے بدکاری کے ذریعے کو جڑ سے ہی کاٹ دیا

ہے۔"

میری پر جوش تقریر جاری تھی۔ تینوں لڑکیاں بت سی بنی کھڑی سن رہی تھیں۔ لمبی لڑکی کے چہرے پر اطمینان کی لہریں کھیل رہی تھیں کہ اچانک میں نے محسوس کیا کہ ڈبے کے سارے مسافر ہماری طرف متوجہ ہو چکے ہیں اور ان میں سے چند اٹھ کے میری سیٹ کے قریب آ کے سن رہے ہیں.....اور وہ بھی دلچسپی اور حیرت کے ساتھ۔ جب میری بات ختم ہوئی تو ایک سنجیدہ سے شخص نے پوچھا۔

"اگر آپ کا مذہب اتنا ہی صاف ستھرا ہے تو یہ جو عرب اور دیگر مالدار اشخاص ہیں وہ یہاں کیا کرنے آتے ہیں؟ شراب آپ کے یہاں حرام ہے۔ عیاشی منع ہے۔ یہ سب کام تو یہ لوگ کرتے ہیں۔ انگریز لڑکیوں سے شادی تک کر لیتے ہیں۔ آپ کا مذہب ان کو کیوں منع نہیں کرتا؟"

اس سوال کا مطلب تھا کہ بات چیت جو پہلے چند لڑکیوں تک محدود تھی۔ نہ صرف پورے ڈبے میں پھیل چکی ہے بلکہ سنجیدہ مراحل میں داخل ہو چکی ہے۔ میں چوکنا ہو گیا کہ کہیں یہ سنجیدگی خطرناک پہلو نہ اختیار کرے لہٰذا احتیاط ہونا لازمی تھا۔ میں نے جواب میں کہا۔

"میں اس ملک میں اسلام پھیلانے یا تبلیغ کرنے نہیں آیا ہوں اور نہ ہی میں کوئی عالم دین قسم کی چیز ہوں جو مناظرہ کے لئے تیار رہتا ہو۔ لیکن آپ کی اس بات کا مختصر سا جواب ضرور دونگا۔ دنیا میں کوئی مذہب کوئی شریعت۔ کوئی تحریک ایسی نہیں گزری جس کے ماننے والوں کے ایک مختصر سے گروہ نے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر اس کی خلاف ورزی نہ کی ہو۔ اسے استعمال نہ کیا ہو یا اسے کھلونا نہ بنالیا ہو۔ لیکن ان کی ان حرکتوں کے ذمہ دار وہ خود ہوتے ہیں.....اس سے شریعت یا مذہب کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ مجھے جواب دیجئے کہ عیسائیت میں طلاق اور دوسری شادی کا کوئی تصور نہیں۔ خود حضرت عیسیٰؑ نے اس سلسلے میں سختی سے احکامات صادر فرمائے ہیں جو آپ لوگوں کو انجیل مقدسہ میں مل جائیں گے لیکن خود ہی دیکھ لیجئے خود عیسائیت کے ماننے والے اس کی کتنی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ یورپ بھر میں سب سے زیادہ طلاقیں برطانیہ میں ہوتی ہیں دور کیوں جائیں ایک مشہور فلم ایکٹریس نے حال ہی میں آٹھویں شادی کی ہے اور یہ سلسلہ جانے کہاں جا کر رکے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان میں سے اکثر طلاق کے نتیجہ میں ہوئیں حالانکہ طلاق عیسائیت میں منع ہے۔ کیا آپ کا مذہب ان کو منع نہیں کرتا؟۔ نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ اپنے

اعمال کے ذمہ دار یہ لوگ خود ہیں اس سے عیسائیت کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بالکل اسی طرح مسلمانوں میں بھی کچھ لوگ ہیں جو شراب بھی پیتے ہیں۔ عیاشی بھی کرتے ہیں اس کے وہ خود ذمہ دار اور جواب دہ ہیں۔ اسلام کے سنہری اصولوں پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا!

میری یہ بات سن کر سب کو سانپ سونگھ گیا۔ میں نے پھر کہنا شروع کیا۔

''میں آپ لوگوں کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے تحمل سے میری باتیں سنیں۔ دراصل میں تو ان تین پیاری پیاری سی لڑکیوں کی بات کا جواب دینا چاہ رہا تھا اس کے سوا کچھ نہیں۔ افسوس صرف اتنا تھا کہ ان کو میرے دین کے متعلق غلط باتیں بتائی گئی تھیں اور وہ ان کی تصدیق چاہ رہی تھیں۔ سو بحیثیت مسلمان میرا یہ فرض تھا کہ انہیں اصل حقیقت سے آگاہ کروں سو کر دیا۔ اس سے آگے میں کچھ نہ کہونگا۔ مبادا میرے منہ سے کوئی ایسی بات نکل جائے جس سے آپ کے جذبات مجروح ہو جائیں''۔

یہ سن کر لوگ آہستہ آہستہ اپنی اپنی سیٹوں پر واپس چلے گئے۔ لڑکیاں بھی اپنی جگہ پر چلی گئیں اور میں مطمئن ہو کر باہر کا نظارہ کرنے لگا جہاں ایک ننھا منا گاؤں اپنے سرخ سرخ کھپریلوں والے مکانات کے ساتھ تیزی سے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ ہرے بھرے کھیت جن پر سنہری دھوپ کا جال پھیلا ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ پیچھے کھسک رہے تھے۔ ٹرین کی رفتار میں کمی آ چکی تھی۔

''شاید لندن آ رہا ہے۔!'' میں نے جیسے بے خیالی میں اپنے آپ سے پوچھا۔

''لندن تو ابھی ساٹھ ستر میل دور ہے۔ گھنٹہ بھر سے زائد سفر ابھی باقی ہے''۔ یہ جواب جیسے آسمان سے ٹپکا۔

میں نے حیرانگی سے آواز کی سمت دیکھا۔ سامنے بیٹھی سنہری چشمے والی سمارٹ سی خاتون مسکرا مسکرا کر مجھے دیکھ رہی تھی۔ مجھے متوجہ دیکھ کر بولی: ''میرا نام ایلس ہے۔ میں بھی لندن جا رہی ہوں۔ ان لڑکیوں سے آپ کی جو بات چیت ہوئی ہے میں نے بہت دلچسپی سے سنی ہے۔ میرے ذہن میں بھی اسلام اور مسلمانوں کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں تھیں پر ہم کریں بھی تو کیا۔ ہمیں بتایا ہی یہ جاتا ہے اور پھر اس کی تردید کرنے والا بھی تو کوئی نہیں۔ آج پہلی دفعہ میں نے اس تردید پر کچھ سنا ہے۔ اگر اسلام اور اس کے احکامات ایسے ہی ہیں جیسے آپ نے بیان کئے ہیں تو یہ بہت ہی قابل قدر ہیں۔ لیکن ہمارے پادری اور عالم حضرات تو اس مذہب اور اس کے ماننے والوں کو اس

طرح پینٹ paint کرتے ہیں جیسے کہ یہ لڑکیاں بیان کر رہی تھیں۔آپ نے عورتوں کی حفاظت کے جس اسلامی اصول کے متعلق بتایا ہے اگر ایسا ہو تو کس قدر اچھا ہے۔'' وہ کچھ دیر خاموش رہی جیسے کچھ فیصلہ کر رہی ہو۔پھر بولی۔

''مجھ ہی کو لو۔مثال کے طور پر۔جب میں اسکول میں پڑھتی تھی تو میرا ایک ہم جماعت مجھ پر مرمٹا۔اس نے شادی کی پیشکش کی جسے میں نے قبول کرلیا۔بالغ ہوتے ہی یعنی اٹھارہ سال کی عمر میں میں نے اس سے شادی کر لی۔کچھ عرصہ تک معاملات ٹھیک ٹھاک رہے اس کے بعد اس کی دلچسپی مجھ میں کم ہوتی گئی۔وجہ اس کی یہ ہے کہ یہاں قدم قدم پر لڑکیاں ملتی ہیں اور بغیر حجاب کے دوستی کرتی ہیں۔اب ان میں سے کسی کی آنکھیں خوبصورت ہیں تو کسی کے بال۔کسی کے جسمانی خدوخال دلکش ہوتے ہیں تو کسی کی ادائیں دل لبھانے والی ہوتی ہیں۔یہ مرد کی فطرت ہوتی ہے کہ وہ حسن کی طرف لپکتا ہے اور جب اسے پالیتا ہے تو اس میں اس کی دلچسپی کم ہو جاتی ہے اور اچانک ہی اسے دوسری چیزیں زیادہ حسین دکھائی دینے لگتی ہیں اور وہ پہلی کو چھوڑ کر دوسری کی طرف لپکتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس معاشرے میں ہر لڑکی ہر وقت چوکنا رہنے پر مجبور ہے۔بلکہ اپنے آپ کو حسن کے ہر ممکنہ حربے سے مسلح رکھنے پر مجبور ہے تا کہ اس کی حدود میں کوئی دوسری چھاپہ مار لڑکی نہ گھس آئے اور اس کے خاوند کو اچک لے جائے۔اس لئے ہر لڑکی ہر وقت بنی ٹھنی رہتی ہے۔اپنے آپ کو دلکش اور جسم کو پرکشش رکھنے کے لئے سوسو جتن کرتی ہے تا کہ اس کا خاوند اس کی طرف ہی متوجہ رہے۔ورنہ دروازہ......گلی اور ہر دفتر کے باہر ایک اور لڑکی ان حربوں سے مسلح موجود ہے۔جہاں وہ غریب چوکی۔وہیں ماری گئی......'' ایلس نے ٹھنڈی سانس بھری اور کچھ لمحے توقف کرنے کے بعد بولی۔

''میرے حسن کے باوجود میرا خاوند ایک شوخ و چنچل لڑکی کی اداؤں میں پھنس کر رہ گیا اور مجھے ایک بچے کا تحفہ دے کر چلا گیا۔اس ملک میں اس ظلم کے خلاف موثر قانون موجود ہے اور میں چاہتی تو اس کا سہارہ لے سکتی تھی لیکن میری غیرت نے گوارانہ کیا' کیوں کہ جب دل ہی نہ مل رہے ہوں تو زبردستی ساتھ رہنے کا کیا فائدہ......؟ مجھے گزارہ الاؤنس بھی مل سکتا تھا لیکن میں اسے خیرات سمجھتی ہوں اور میں خیرات پر نہ تو زندگی بسر کرسکتی ہوں نہ ہی اپنے بچے کی پرورش کرسکتی ہوں۔چنانچہ میں نے بچے کو لندن کے ایک اسکول میں داخل کرا دیا اور خود برمنگھم میں ملازمت کرلی۔لندن میں رہنا میرے لئے مشکل ہے کیونکہ لندن ایک خاصا مہنگا شہر ہے۔خصوصاً رہائش

بہت مہنگی ہے اور میری تنخواہ کم۔اس لئے مہینہ میں ایک دفعہ اپنے بیٹے سے ملنے لندن جاتی ہوں۔ شام اور رات اپنے بچے کے ساتھ گزارتی ہوں اور اتوار کی شام کی ٹرین سے برمنگھم واپس چلی جاتی ہوں۔میرے دو بھائی اور ایک بہن اسی لندن شہر میں رہتے ہیں لیکن وہ اپنے حال میں اس قدر غرق ہیں کہ میری مدد تو کجا۔انہیں کبھی میرا خیال تک نہ آتا ہوگا۔انہوں نے میرے بارے میں کبھی سوچا بھی نہ ہوگا...... میں جس جگہ کام کرتی ہوں وہاں محنت کافی کرنا پڑتی ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ اپنے افسران کو خوش رکھنا پڑتا ہے اور اپنی مرضی کے خلاف کام کرنے پڑتے ہیں۔ان کم بختوں نے مجھے کھلونا بنا رکھا ہے...... لیکن کیا کروں۔اچھی ملازمت ملنا آسان نہیں۔نوکری چھوڑ دوں تو خود تو بھوکی مروں سو مروں میرا بچہ بھی تعلیم حاصل نہ کر سکے گا۔لہٰذا مجبوراً سب کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔اس صورت حال میں۔ابھی میں سوچ رہی تھی کہ اگر وہ اسلامی نظام ہمارے یہاں ہوتا کہ جس میں ہر عورت کا کوئی نہ کوئی ذمہ دار ہوتا ہے۔تو کتنا اچھا ہوتا۔کم از کم میری عزت تو محفوظ رہتی۔"

یہ کہہ کر وہ تو خاموش ہوگئی لیکن میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ اس سے کیا کہوں۔بس خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔وہ خوبصورت بھی بہت تھی اور جوان بھی۔پتہ نہیں اس نے اپنا کچا چٹھا کیوں کھول دیا تھا۔شاید میرے بتائے ہوئے اسلامی اصولوں سے اپنا موازنہ کرنے کے بعد وہ اس امر پر مجبور ہوگئی ہو۔

تھوڑی دیر بعد اچانک چند مکانات گزرے جن کے درمیان سڑکوں پر سفید اور پیلی پیلی لکیریں دکھائی دیں جو انگلینڈ میں ٹریفک کی علامات ہیں۔ایک بڑے سے مکان کے گرد پیلی لکیر نے نیم دائرہ سا بنا رکھا تھا۔اسے دیکھ کر ایلس بولی:۔

"لو بھئی۔لندن شروع ہوگیا۔ویسے ہماری منزل یعنی کنگس کراس ابھی پورے چالیس میل دور ہے یعنی لندن کا مرکز چالیس میل دور ہے لیکن یہاں کے رہنے والے احمق یہی سمجھتے ہیں کہ وہ لندن میں رہ رہے ہیں اس خوش فہمی کا کیا علاج ہے۔؟"

ایک سال پہلے میں بھی کراچی جا رہا تھا۔جب ٹرین پپری اسٹیشن سے گزری جہاں اسٹیل مل واقع ہے اور کراچی سے پورے پینتیس میل دور ہے تو ٹرین میں یکدم شور مچ گیا کہ کراچی آ گیا۔کراچی آ گیا۔حالانکہ کراچی پہنچنے میں ابھی پورا ایک گھنٹہ باقی تھا۔غالباً پپری یا اسٹیل مل کے قرب وجوار میں رہنے والے اپنے تئیں یہ سمجھتے ہیں کہ وہ کراچی میں رہ رہے ہیں۔

اس کے بعد ٹرین لگ بھگ گھنٹہ بھر خاصی سست رفتار سے چلتی رہی جیسے شہر کے وسط سے گزر رہی ہو اور شہر ختم ہی ہونے میں نہ آ رہا ہو۔ ہر طرف ٹریفک کا شور تھا۔ بڑی بڑی بلڈنگیں، چھوٹے بڑے مکانات، باغ، پل، پلوں کے نیچے بہت ٹریفک سب ہی گزرتا جارہا تھا اور یہ ثابت کر رہا تھا کہ ہم لندن شہر کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ یہ نظارے نہ صرف نئے تھے بلکہ بہت دلچسپ بھی۔ اتنے میں گاڑی ایک بہت بڑے پل پر سے گزری جس کی گڑگڑاہٹ نے ایلس کو چونکا دیا اور وہ بولی۔

''کنگس کراس اسٹیشن آنے ہی والا ہے۔ بس تیار ہو جائیں۔''

تھوڑی دیر بعد اچانک ہی اسٹیشن آ گیا۔ گاڑی ایک بڑے سے شیڈ کے اندر گھس گئی جس سے چمکیلا روشن دن شام کے اندھیرے میں بدل گیا۔ پلیٹ فارم ساتھ ساتھ دوڑنے لگا۔ پلیٹ فارم پر کھڑے لوگ پیچھے کی طرف جاتے دکھائی دیئے۔ پھر ایک جھٹکا سا لگا اور گاڑی رک گئی۔

لندن شہر آ چکا تھا اور ہم لوگ کنگس کراس اسٹیشن پر کھڑے تھے۔ میری مدتوں کی آرزو پوری ہو چکی تھی۔ میں لندن کی سرزمین پر کھڑا تھا اور حیرت اور مسرت سے لوگوں کو تک رہا تھا۔

سب سے آخر میں ٹرین سے میں اترا۔ خیال تھا کہ اس مختصری رفاقت کے بعد سب لوگ اپنی اپنی راہ پر چل پڑے ہونگے لیکن یہ دیکھ کر حیرت اور مسرت ہوئی کہ شریر لڑکیوں کا گروہ ایک طرف کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا جوں ہی میں نے زمین پر قدم رکھا پورے گروہ نے مجھے گھیرے میں لیا اور ان میں وہ لمبی لڑکی جس سے ٹرین میں بات ہوئی تھی۔ عین میرے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

''میرا نام سمینتھا ہے'' وہ بولی...... ''ہماری آپ سے ملاقات خاصی مختصر رہی ہے۔ لیکن ہم آپ سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔ ہم آپ سے اور بھی بہت کچھ معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ میں آپ کو اپنی والدہ اور ارشد سے ملوانا چاہتی ہوں۔ آپ پلیز میری مدد کریں اور انہیں وہ سب کچھ بتا دیں جو مجھے بتایا ہے۔''

میں حیران و ہکا بکا رہ گیا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ لڑکی۔ جس کا نام ابھی ابھی سمینتھا معلوم ہوا ہے۔ اپنے عشق میں اس قدر ثابت قدم واقع ہوگی۔ کہ مجھ جیسے مکمل اجنبی شخص سے بھی مدد لینے سے دریغ نہ کرے گی۔ ایک لمحے کے لئے مجھے خیال آیا کہ میں اس شہر میں اجنبی ہوں۔ گلی کوچہ سے ناواقف۔ آج ہی بلکہ ابھی ابھی ٹرین سے اترا ہوں۔ مجھے بھی تو لندن کی سیر کے لئے ایک عدد گائیڈ کی ضرورت ہوگی۔ اگر ہاں کر دوں تو نہ صرف یہ کہ مجھے بھی

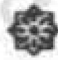
گائیڈمل جائے گی اور میں ان لوگوں میں اسلام کی باتیں بھی کرسکونگا۔ چنانچہ میں نے ہاں کہنے کا ارادہ کرلیا۔

میں نے کہا...... ''میں ایک شرط پر آپ کے کام آسکونگا۔ اگر آپ اس لندن شہر میں میرے لئے کم از کم تین دن کے لئے گائیڈ بن جائیں اور مجھے یہاں کے قابل دید مقامات دکھلا سکیں تو میں خوشی سے آپ کے ساتھ ہر اس جگہ جانے اور ہر شخص جس سے آپ ملوانا چاہیں' ملنے کو تیار ہوں۔''

لڑکی کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ نہ صرف اس نے بلکہ پورے گروپ نے ''منظور ہے کا' نعرہ لگایا۔

میں نے بتایا کہ فی الحال میں ایسٹ ہائیم East Hiem جا رہا ہوں جہاں میرے سسرالی عزیز رہتے ہیں۔ انشاء اللہ کل ملاقات ہوگی اور باقی پروگرام بنائیں گے۔

سمیلتھا بولی...... ''منظور ہے۔ کل آپ ڈاؤن ٹاؤن Down Town یعنی پکاڈلی سرکس پر صبح دس بجے پہنچ جایئے گا۔ وہاں ملاقات ہوگی......''



# کنگز کراس اسٹیشن

## (Kings Cross Station)

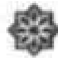
ہم نے پر جوش طریقہ سے ہاتھ ملائے اور رخصت ہوئے۔ سمیلتھا اور اس کا گروپ گیٹ کی طرف چلا گیا۔ چونکہ مجھے ایسٹ ہائیم کے لئے زیر زمین ٹرین جسے ٹیوب کہتے ہیں۔ پکڑنی تھی اس لئے میں نے اس طرف کا رخ کیا جہاں دیوار پر ڈھیر ساری رنگین لائنیں بنی ہوئی تھیں جو مختلف حصوں کی طرف لے جاتی تھیں ان میں سے سرخ لکیر ٹیوب کی طرف جا رہی تھی۔ میں نے اس لکیر کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیا جو مجھے بیسیوں سیڑھیاں اتار کر ٹیوب اسٹیشن پر لے گئی۔ اس اسٹیشن کا نام بھی "کنگس کراس" تھا۔

اسٹیشن میں داخل ہوتے ہی میں ایک بڑے سے ہال میں پہنچ گیا جس میں دائیں طرف دو تین کاونٹر دیوار کے اندر اسی طرح بنے ہوئے تھے جیسے عام پاکستانی اسٹیشنوں پر ہوتے ہیں۔ جن پر ٹکٹ ملتے ہیں۔ سامنے ہی یہاں سے وہاں تک بڑی سی مشین پڑی ہوئی تھی جس کا دوسرا سرا ہال سے باہر کہیں گم ہو رہا تھا۔ اس مشین پر لگ بھگ نو انچ چوڑا پٹہ برق رفتاری سے گھوم رہا تھا۔ میں سمجھ نہ سکا کہ یہ کیا چیز ہے۔ ٹکٹ خریدنے کے لئے میں نے جیب سے ایک پونڈ کا نوٹ نکالا اور ٹکٹ کلرک کے حوالے کیا۔ کلرک نے نوٹ گلے میں پھینکا اور ایک ٹکٹ میرے سامنے پھینک دیا۔ میں منتظر تھا کہ اتنا بڑا نوٹ میں نے دیا ہے اس کے بقایا جات تو واپس کرے گا لیکن یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ وہ ہنسی روک کر حیرت سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ جب کلرک ٹس سے مس نہ ہوا تو میں نے ٹکٹ غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ ٹکٹ پر مالیت ہی ایک پونڈ لکھی ہوئی تھی۔ اس زمانے میں ایک پاؤنڈ پورے بائیس روپے کا ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ کھسیانہ سا ہو کر میں ایک طرف ہو گیا۔

ساتھ ہی اس مہنگے کرایہ کو کوسنے لگا کہ پاکستان میں اتنے فاصلے کا کرایہ زیادہ سے زیادہ ایک روپیہ ہوگا...... پھر ہمت کر کے میں نے کلرک سے لندن کا نقشہ مانگا جو اس نے بخوشی مجھے دے دیا۔

اب مسئلہ پلیٹ فارم پر داخل ہونے کا تھا۔ ہال کا ایک ہی دروازہ پلیٹ فارم کی طرف کھلتا تھا اور سختی سے بند تھا اس پر کوئی ٹکٹ چیکر بھی موجود نہ تھا۔ مزید کوئی حماقت کرنے کے بجائے میں نے سوچا کہ انتظار کر کے دیکھ لیا جائے کہ دروازہ کس طرح کھلتا ہے۔ چند ہی سیکنڈ بعد ایک بڑی اماں ہال میں داخل ہوئیں۔ ایک پونڈ کا نوٹ پھینک کر ٹکٹ حاصل کیا اور اسے سامنے لگی مشین کے پٹہ پر رکھ دیا جو اس تیزی سے چل رہا تھا کہ ٹکٹ یکدم غائب ہو گیا اور ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔ خاتون کھٹ کھٹ کرتی جلدی سے پلیٹ فارم پر چلی گئی......

اوہو...... تو یہ ہے میری مشکل کا حل۔! یہ مشین صاحبہ ہی ٹکٹ کلکٹر کا کام کر رہی ہیں۔ میں نے حیرت سے سوچا اور جو دوسرا حصہ اس مشین کا اس ہال سے باہر ہے۔ یقیناً پلیٹ فارم پر ہوگا۔



# پلیٹ فارم پر

بائیس روپے کا قیمتی ٹکٹ اللہ کا نام لے کر میں نے پٹے پر رکھنا چاہا تو پٹے نے جھپٹ کر میرے ہاتھ سے چھین کر اسے غائب کر دیا ساتھ ہی پلیٹ فارم کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا۔ میں نے بھی سوٹ کیس اٹھایا اور جلدی سے پلیٹ فارم پر آ گیا کہ مبادا دروازہ بند نہ ہو جائے۔ مشین کے غائب حصے پر نظر ڈالی تو وہ پلیٹ فارم پر موجود تھا اور میرا چھینا ہوا ٹکٹ پٹے کے اختتام پر پڑی ہوئی ٹرے میں پڑا میرا انتظار کر رہا تھا۔

پلیٹ فارم پر پہنچ کر ایسا محسوس ہوا جیسے میں کسی بڑی سی سرنگ میں داخل ہو گیا ہوں جس میں بہت سی ٹیوب لائٹس جل رہی تھیں اور پلیٹ فارم دن کی طرح روشن تھا۔ سامنے نیچے ریلوے کی پٹڑی روشنی میں چمک رہی تھی۔ ہاں البتہ اس سرنگ کے دونوں اطراف جہاں پلیٹ فارم ختم ہوتا تھا۔ گھپ اندھیرا تھا۔ سرنگ میں اوپر کی طرف دو تین نیون سائن بورڈ لٹکے ہوئے روشنی میں چمک رہے تھے اور ان پر نامانوس سے نام اور ان کے سامنے سرخ زرد اور سیاہ لکیریں جل بجھ رہی تھیں۔ عجیب خواب آلودہ سا ماحول تھا اس لئے میں خاصا حیرت زدہ ہی نہیں بلکہ سحر زدہ ہو رہا تھا۔

ہاں البتہ پلیٹ فارم بالکل اسی طرح کا تھا جیسے پاکستانی پلیٹ فارم ہوتے ہیں۔ پلیٹ فارم مسافروں سے بھرا ہوا تھا۔ کچھ بینچوں پر بیٹھے تھے کچھ ٹہل رہے تھے۔ بچے دوڑنے کی مشق میں مشغول تھے اور چند خواتین بھی تھیں جو آپس میں شد و مد سے بحث میں مصروف تھیں شاید اپنے اپنے خاوند کی بُرائی کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہی ہوں۔

مجھے حیرت زدہ بلکہ کھویا ہوا دیکھ کر دو تین حضرات میری طرف بڑھے۔ ایک صاحب نے بالکل صاف اردو میں پوچھا۔

''معلوم ہوتا ہے آپ پہلی دفعہ آئے ہیں کیونکہ پہلی دفعہ آنے والا اسی طرح اچنبھے کا شکار ہوتا ہے پھر عادی ہو جاتا ہے۔ ویسے بائی دی وے آپ نے کہاں جانا ہے۔؟''

میں نے بوکھلا کر جواب دیا۔۔۔" جانا تو ایسٹ ہائیم ہے لیکن ٹرین دائیں طرف سے آئے گی یا بائیں طرف سے۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ ایسٹ ہائیم ہے کہاں۔؟"

وہ صاحب ہنس پڑے۔ کہنے لگے۔" پہلی دفعہ ایسا ہی ہوتا ہے۔! ہمت کریں۔ فکر کی بات نہیں۔ نیون سائن پر جو جلتی بجھتی روشنیاں اور ان پر اسٹیشنوں کے نام دیکھ رہے ہیں یہ بتا رہی ہیں کہ ٹرین کہاں سے آ رہی ہے، اب کس اسٹیشن پر ہے۔۔۔ زرد لکیریں یہ ظاہر کر رہی ہیں کہ وہ کون کون سے اسٹیشن پر رکے گی۔ دیکھئے بائیں طرف سے ٹرین آنے والی ہے۔ یہ آپ کو ایسٹ ہائیم بلکہ اس سے بھی آگے لیجائے گی۔ یاد رکھئے یہ ٹرین مکمل طور پر آٹومیٹک ہے۔ اس میں ڈرائیور ہوتا ہے نہ کنڈیکٹر۔۔۔ مقرر وقت کیلئے اسٹیشن پر رکتی ہے۔ دروازے خود بخود کھلتے ہیں اور ایک منٹ کے وقفے کے بعد خود بخود بند ہو جاتے ہیں اور پھر ٹرین بغیر کسی انتباہ کے روانہ ہو جاتی ہے۔ اس لئے مسافر کو خود ہی تیار رہنا پڑتا ہے۔ چڑھنے میں دیر ہوئی تو ٹرین نکل جائے گی۔ اترنے میں دیر ہوئی تو آپ اسٹیشن پر پہنچ جائیں گے اور پھر کوئی ذمہ دار بھی نہ ہوگا۔"

یہ قیمتی معلومات پا کر میں نے ان حضرت کا شکریہ ادا کیا اور سوٹ کیس اٹھا کر بالکل تیار کھڑا ہو گیا۔

## ٹیوب

تھوڑی دیر میں پورا اسٹیشن گڑگڑاہٹ سے گونج اٹھا۔ پلیٹ فارم پر ہلچل مچ گئی۔ ٹرین آگئی ٹیوب آگئی۔ معاً ایک سفید سی بغیر انجن کی ٹرین تیزی سے سرنگ میں داخل ہوئی اور اتنی ہی تیزی سے رکنے لگی۔ اس کے سفید سفید ڈبے سامنے سے گزرتے ہوئے کچھ دور جا کے یکدم ایسے رک گئے جیسے کسی نے سختی سے بریک لگا دی ہو۔ ٹرین کے رکتے ہی دروازے یکدم کھل گئے اور مسافر دھکم پیل کرتے ہوئے اس میں گھسنے لگے۔ میں بھی۔۔۔ سامنے کھڑے ہوئے ڈبے میں یکدم گھس گیا۔ صاف ستھرے ڈبے میں مسافر زیادہ نہ تھے اسلئے مجھے آسانی سے سیٹ مل گئی۔

ابھی بیٹھ کر پوری طرح اطمینان کا سانس بھی نہ لیا تھا کہ دروازے کھٹ کھٹ بند ہونے شروع ہو گئے اور پھر بغیر کسی سیٹی یا سائرن یا گارڈ کی سبز جھنڈی کے۔۔۔ گاڑی نے رینگنا شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے رفتار پکڑ لی اور سامنے گھپ اندھیرے میں گھس گئی۔ اس کیساتھ ہی ڈبہ یکدم جگمگا اٹھا کیونکہ روشنیاں ایک دم جل اٹھی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد چکا چوند کر دینے والی روشنی ہو گئی۔ پتہ لگا کہ ہم سرنگ سے باہر دن کی روشنی میں نکل آئے ہیں۔ ٹرین ابھی رفتار پکڑ ہی رہی تھی

کہ اچانک آہستہ آہستہ ہو کر رک گئی۔ معلوم ہوا کہ اگلا اسٹیشن آ گیا ہے۔ پھر دروازے کھلے۔ کچھ مسافر اترے کچھ چڑھے۔ پھر دروازے بند ہوئے پھر ٹرین بغیر انتباہ کے روانہ ہو گئی۔ یہ ایک دلچسپ منظر تھا۔ ہر کام خود بخود ہو رہا تھا۔۔۔ کوئی کسی کا انتظار نہیں کر رہا تھا۔ اور ٹرین روشنی اور اندھیرے سے آنکھ مچولی کھیلتی دوڑتی چلی جا رہی تھی۔

میں ان مناظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اچانک میرے ساتھ بیٹھے ہوئے صاحب کہنے لگے۔ ''جناب والا۔۔۔ دو اسٹیشن بعد ایسٹ ہائیم آئے گا۔ تیار رہئے گا۔۔۔!'' اس پر میں سوٹ کیس مضبوطی سے پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اس پر وہ صاحب ہنس پڑے۔ کہنے لگے۔۔۔ ''اتنی بوکھلاہٹ بھی مناسب نہیں۔ ایسٹ ہائیم کے آنے میں ابھی دیر ہے۔ اطمینان سے اتریئے گا۔''

ٹیوب۔ عام ٹرینوں کی طرح کھٹا کھٹ کرتی ہوئی زیادہ سرنگوں سے گزرتی رہی۔ کبھی کبھی سطح زمین پر آ جاتی اور یوں لگتا جیسے کھلے بازاروں میں سے گزرتی جا رہی ہے۔ بلکہ بسوں، ٹیکسیوں سے ریس لگا رہی ہے۔ باہر نظارہ کرتے کرتے یکدم اندھیرا سا چھا جاتا پتہ لگتا کسی سرنگ میں گھس گئے ہیں۔ سرنگ میں داخل ہوتے ہی بتیاں روشن ہو جاتیں اور دن کا سماں پیدا کر دیتیں۔

خدا خدا کر کے ایسٹ ہائیم کا اسٹیشن آیا۔ دروازہ کھلتے ہی میں نے سوٹ کیس مضبوطی سے پکڑ کر پلیٹ فارم پر گویا چھلانگ سی لگا دی کہ کہیں گاڑی مجھے ساتھ ہی نہ لے جائے لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ ٹرین خاصی دیر تک کھڑی رہی۔ مسافر آرام سے اترتے چڑھتے رہی بلکہ جب اترنے والے اتر چکے تب بھی دروازے کھلے ہی رہے اور کافی دیر کے بعد بند ہوئے۔ ٹرین بھی آہستہ آہستہ روانہ ہوئی۔ سامنے دھری سرنگ میں آہستہ آہستہ داخل ہوئی اور تھوڑی تھوڑی کر کے اس میں غائب ہوتی گئی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ چونکہ ٹیوب میں سوار ہونے کا میرا پہلا تجربہ تھا اس لئے میں عجیب وغریب احساسات کا شکار ہو گیا تھا اور پھر کچھ ان صاحب نے بوکھلا دیا تھا۔ ورنہ ایسی تو کوئی بات نہیں تھی۔ ہر چیز کا پہلا تجربہ دیر پا و یادگار ہوا کرتا ہے۔ اس لحاظ سے میرا یہ پہلا تجربہ خاصا دلچسپ رہا۔

## ٹیلی فون کا تجربہ

ایسٹ ہائیم کا اسٹیشن خاصی گہرائی میں ہے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ چار منزلہ عمارت کی چھت پر سے دیکھیں تو نیچے اسٹیشن اور پٹری چمکتی دکھائی دے گی۔ چنانچہ دوسرا مرحلہ پچاس ساٹھ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچنا اور پھر باہر نکلنا تھا۔ سوٹ کیس کے ساتھ یہ بھی ایک مرحلہ دکھائی دیا۔

بہر حال یہ مرحلہ بھی جوں توں طے کیا اور پہنچ کر ٹکٹ چیکر کے حوالے کیا اور باہر نکلا تو ایسے لگا جیسے کسی نئی دنیا میں آ گیا ہوں۔ کیونکہ ایک خاصا مصروف اور بارونق شہر میرا منتظر کھڑا تھا۔

میرے میز بانوں نے مجھے ہدایت کی تھی کہ ایسٹ ہائیم اسٹیشن سے میں انہیں ٹیلی فون کر دوں پھر وہ خود ہی آ کے مجھے لے جائیں گے۔ چنانچہ بازار میں آتے ہی ٹیلی فون بوتھ کی تلاش کی جو مجھے سامنے ہی نظر آ گیا۔ میں نے پانچ پی (پینس کو پی کہا جاتا) کا سکہ نکالا۔ بوتھ میں ڈالا۔ نمبر ڈائل کیا تو محسوس ہوا لائن مل گئی ہے لیکن بات نہ ہو سکی۔ دوسری دفعہ سکہ ڈال کر کوشش کی اس دفعہ بھی ناکامی ہوئی۔ اس طرح تین دفعہ مزید کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اپنے پچیس پی کے بلاوجہ ضائع ہونے کا افسوس ہوا۔ چنانچہ ہدایت کے مطابق دفتر شکایات کا نمبر اندر پڑی ڈائریکٹری سے معلوم کیا اور اسے فون کیا تو پتہ چلا کہ ٹیلی فون تو لگ بھگ ایک ہفتہ سے خراب پڑا ہے۔ ٹیلی فون پیسے وصول کر لیتا ہے، لائن ملا دیتا ہے۔ لیکن آواز نہیں آتی۔ یہ محض میری اطلاع کیلئے بتایا گیا۔ جب میں نے شکایت کی کہ میری چھ کالیں (بشمول اس کال کے) ضائع ہو گئی ہیں اس کا ذمہ دار کون ہوگا۔ اگر ٹیلی فون پر ''خراب ہے'' کا بورڈ لگا دیا جاتا تو مجھے مفت کا جرمانہ بھرنا پڑتا۔۔۔''

اس پر آپریٹر کے سنہری قہقہوں کی آوازیں بلند ہوئیں جو کہہ رہی تھی۔ ایک ہفتہ میں لوگوں کے پچاسوں پونڈ ضائع ہو گئے ہونگے لیکن کسی شریف آدمی جنٹلمین نے شکایت نہیں کی۔ آپ ضرور کوئی غیر ملکی ہونگے۔۔۔!''

''جی ہاں۔۔۔۔'' میں نے بھی جل کر کہا۔ ''غیر ملکی ہوں۔ انگریزوں کی طرح احمق نہیں کہ رقم گنوا کر شکایت بھی نہ کروں۔'' ٹیلی فون کھٹ سے بند ہو گیا۔

## انگریزی ذہنیت

اب مجھے تلاش ہوئی کسی پرائیویٹ ٹیلی فون کی۔ سامنے ایک بہت بڑا سا روم تھا اور اس پر ''رینٹ اے کار'' ''Rant A Car'' کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ کاؤنٹر پر ایک ادھیڑ عمر شخص سنہری چشمہ لگائے۔ سوٹ پہنے اور ہاتھ میں تمباکو پینے کا پائپ لئے کھڑا تھا۔ میں نے اسے سارا قصہ سنایا کہ ٹیلی فون پر میری چھ کالیں یعنی تیس پی ضائع ہو چکے ہیں پھر بھی میں اپنے میز بانوں کو اپنے آنے کی اطلاع نہیں دے سکا۔

میں ایک عدد کال کرنا چاہتا ہوں۔ اگر وہ اجازت دیں......

اس شریف شخص نے پہلے تو صاف ہی انکار کر دیا کہ اس کی کمپنی میں ٹیلی فون ہے ہی

نہیں۔ پھر کہنے گا۔۔۔ ہے تو سہی لیکن کسی غیر کو کال کرنے کی اجازت نہیں۔۔۔ پھر آہستہ سے کہنے گا۔

کال میں کروادونگا لیکن دام دگنے یعنی دس پی ہونگے۔ جب میں نے آمادگی ظاہر کی تو پہلے اس نے اپنا دایاں ہاتھ پھیلا دیا کہ پہلے پیسے دو۔ دس پی کا سکہ لے کر اسے دونوں طرف سے اچھی طرح پرکھا پھر مطمئن ہو کر جیب میں ڈال لیا۔ پھر کاؤنٹر کے نیچے سے ٹیلی فون نکال کر سامنے دھرا۔ مجھ سے صاحب خانہ کا نمبر لیکر خود ڈائل کیا۔ پھر ایک دو باتیں پوچھ کر ریسیور میرے حوالے کیا۔ صاحب خانہ کی بیگم بول رہی تھی انہوں نے بتایا کہ جب دو تین بار ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو وہ سمجھ گئے کہ میں ہی ٹیلی فون کر رہا ہونگا کیونکہ میری آمد کی اطلاع انہیں تھی۔ چنانچہ صاحب خانہ مجھے لینے روانہ ہو چکے ہیں۔ اور یہ کہ میں اسٹیشن سے دور نہ جاؤں۔ قریب ہی رہوں۔

میں مطمئن ہو کر ریسیور رکھ دیا تو صاحب بہادر نے اپنا دایاں ہاتھ پھر پھیلا دیا اور کہا ۔''ڈائل کرنے کی خدمت کا عوضانہ۔ پانچ پی مزید''۔۔۔ میں نے۔۔۔ پانچ پی کا ایک سکہ نکال کر اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا اور پوچھا۔۔ ''بائی دی وے۔ آپ یہاں کس حیثیت سے کام کرتے ہیں؟''

تو فخریہ کہنے لگا۔ ''کام کیسا؟ میں اس کمپنی کا ملک ہوں۔!''

انگریزوں کی ایمانداری کے قصے بہت سنے تھے لیکن آزمانے کا موقع پہلی دفعہ ملا تھا۔ نپولین بوناپارٹ نے سچ ہی کہا تھا۔ ''انگریز دکانداروں کی قوم ہے۔ پیسہ ہی اس کا دین ایمان ہے۔'' لیکن معمولی رقم کے لئے کمینگی کی اس حد تک وہ گر سکتا ہے، میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ کبھی سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ ایک اچھی بھلی کمپنی کا مالک ایسی کمینگی کر سکتا ہے۔۔۔ ویسے پیسے کمانے کا ایک ڈھنگ یہ بھی ہو سکتا ہے۔

بہر حال ایک انگریز سے میرا یہ پہلا معاملہ تھا جس نے اس کی اصلیت ظاہر کر دی۔

دکان سے نکلا تو اقبال صاحب سامنے ہی کھڑے تھے۔ انہوں نے مجھے میرے سوٹ کیس سمیت اپنی کھٹیچر سی گاڑی میں لادا اور تھوڑی دیر میں ہم ایسٹ ہائیم میں ان کے گھر پہنچ گئے جہاں ان کی بیوی اور بچے میرا انتظار کر رہے تھے۔ یہ لندن میں میرا پہلا دن تھا۔ پہلا تجربہ تھا جو ملا جلا رہا۔



# لندن سے ملئے

## (چھوٹا اور اصلی لندن)

یہ بڑی دلچسپ کہانی ہے، ایک ننھے منے گاؤں سے ارتقائی منازل طے کرتے کرتے لندن کے ایک عظیم شہر بن جانے کی داستان کسی بھی بڑے شہر کی داستان سے مختلف نہیں۔ انگریزوں کا دعویٰ ہے کہ لندن بہت پرانا شہر ہے۔ان کے مطابق آثار قدیمہ کے شواہد بتاتے ہیں کہ یہ شہر قدیم رومی دور میں بھی ایک سرگرم مرکز تھا۔ یہ چھوٹا سا گاؤں صدیوں پہلے دریائے ٹیمز کے کنارے اس طرح بسایا گیا کہ دریا ایک طرف سے اس کی حفاظت کرتا تھا۔ ظاہر ہے جس زمانے میں پورا برطانیہ ہی ایک بہت بڑے گاؤں کی حیثیت رکھتا تھا اس کا ایک چھوٹا سا منظم آباد حصہ خاصی اہمیت رکھتا ہوگا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ جن دنوں مسلمانوں کی تہذیب ہسپانیہ میں عظمت کی بلندیوں کو چھو رہی تھی ان دنوں لندن ایک چھوٹے سے گاؤں کی حیثیت رکھتا تھا جہاں بنجر اور دلدلی زمین پر چند جھونپڑی نما کچے مکانات تھے کچی سڑکیں تھیں جیسی آج بھی ہمارے دیہی علاقوں میں پائی جاتی ہیں۔ان پر مشعل یا لالٹین کی کمزوری سی روشنیاں ٹمٹماتیں بارش ہوتی تو سڑکیں دلدلی ہو جاتیں اور لوگ گھٹنوں گھٹنوں کیچڑ میں دھنس جایا کرتے۔لوگ بھی زیادہ تر وحشی اور غاروں کے باسی تھے۔ مشہور ہے کہ جب یہاں کی فوج شیر دل رچرڈ کی قیادت میں صلیبی جنگوں میں حصہ لینے گئی تو اس کی اکثریت کھالوں میں ملبوس تھی۔ مورخین کہتے ہیں کہ مسلمان فوج کے لباس اور ہتھیار دیکھ کر یہ فوجی دنگ رہ گئے تھے۔

**1258**ء کے سقوط بغداد کے عظیم المیے کے بعد جب تہذیب و تمدن کا سورج مغرب میں طلوع ہوا تو یورپی اقوام نے اپنے شہر منظم کرنے شروع کیے۔ یورپ میں شہر بسانے کا طریقہ

مشرق سے قدرے مختلف ہے۔ مغرب میں پہلے کوئی یادگار مثلاً فوارہ یا گھنٹہ گھر قسم کی چیز تعمیر کر کے اس کے گرد ایک بہت بڑا گول چوراہا بنایا جاتا ہے۔ اس چوراہے سے کچھ فاصلے پر گرداگرد گولائی میں مکانات بننے شروع ہو جاتے ہیں جن کے درمیان گلیاں اور سڑکیں چھوڑی جاتی ہیں۔ مکانات اس چوراہے کو گھیرتے ہوئے گھومتے جاتے ہیں اس طرح شہر وجود میں آجاتا ہے۔ اس چوراہے کو عام طور پر ڈاؤن ٹاؤن (Down Town) کہا جاتا ہے۔

اس کے برعکس مشرق میں پہلے ایک سیدھا طویل بلکہ مستطیل بازار تعمیر کیا جاتا ہے جس کے گرداگرد رہائشی مکانات تعمیر کئے جاتے ہیں جو اس بازار کو گھیرتے ہوئے پھیلتے جاتے ہیں چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ یورپی شہر گولائی میں آباد ہیں جبکہ مشرقی شہر مستطیل ہیں! انگریزوں نے برصغیر ہندوپاک میں جو شہر آباد کیے ان میں اپنا انداز اختیار کیا۔ اس کی سب سے بہترین مثال پاکستانی شہر فیصل آباد کی ہے جو ایک گھنٹہ گھر کے گرد آباد ہے۔ یہی اصول جدید گوجرانوالہ میں برتا گیا ہے۔ ہندوپاک کے دوسرے شہروں میں ایک بازار مثلاً شاہی بازار ہے جس کے گرد شہر آباد ہوا۔

پرانا بلکہ اصل لندن ایک بہت بڑے فوارے کے گرد آباد ہے جس کا نام پکاڈلی سرکس ہے۔ یہ ڈاؤن ٹاؤن بھی کہلاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں یہاں پکاڈلی نام کا ایک بڑا سرکس ہوا کرتا تھا جس میں لوگوں کی تفریح کے لئے تماشے دکھائے جاتے تھے۔ مشہور ہے کہ اس سرکس میں برطانیہ کا نامور ڈرامہ نگار شیکسپیئر بھی کام کرتا تھا۔ اس فوارے کے چاروں طرف چھ بازار اس طرح نکلتے ہیں۔ جس طرح فیصل آباد کے گھنٹہ گھر سے نکلتے ہیں یہ بازار آدھ میل لمبے ہیں اور اصلی شہر لندن کی بس یہی حدود ہیں یوں سمجھ لیجئے کہ لندن شہر ایک میل لمبا اور ایک میل چوڑا ہے اور اسی کو لندن شہر کہا جاتا ہے۔ اس کی کل آبادی چھ ہزار سے زائد نہیں۔

اگر فیصل آباد میں گھنٹہ گھر کے بجائے ایک فوارہ نصب کر کے اس کے گرد بازاروں کی لمبائی کو ایک آدھ میل تک محدود کر دیا جائے تو لندن اور فیصل آباد کے نقشے اور رقبے میں کوئی فرق نہ ہوگا۔

## عظیم تر لندن

جب دور دور کی دولت سمٹ کر لندن پہنچی تو اس کی کشش لوگوں کو کھینچنے لگی اور لوگ روزگار کی تلاش میں یہاں آنے لگے۔ چنانچہ لندن کی آبادی اتنی تیزی سے بڑھی کہ کچھ ہی عرصہ میں

دعویٰ کیا جانے لگا کہ یہ دنیا کا سب سے بڑا شہر ہے۔چند ہزار کی آبادی کے لئے بنایا جانے والا شہر لاکھوں کی آبادی کا شہر بن گیا اور کئی مسائل نے جنم لیا۔ان مسائل کو حل کرنے لئے تجویز کیا گیا کہ شہر کی اندرونی آبادی کو منتقل کیا جائے اور شہر کی آبادی کو ایک حد سے آگے کبھی بڑھنے نہ دیا جائے۔

مشہور ہے کسی نے مچھیرے سے پوچھا کہ مچھلیاں پکڑنے والا جال بنانے کا کیا طریقہ ہے؟ مچھیرے نے بہت عمدہ ترکیب بتائی ”بہت سارے سوراخ جمع کرلیں اور پھر ایک ایک کرکے انہیں ایک دوسرے سے باندھتے چلے جائیں جال تیار ہو جائے گا۔“

چنانچہ شہر لندن کے گرد مضافاتی بستیاں اسی اصول کے تحت بنائی گئی اور انہیں مکمل شہروں کے اختیارات دیے گئے۔۔۔چنانچہ لندن شہر سے کہیں بڑے بارہ شہر لندن کے گرد 1945ء میں آباد کئے گئے۔ان شہروں کو ہوم کاؤنٹیز (Home Counties) کہا جاتا ہے۔برطانیہ بھر میں ایسے شہروں یعنی کاؤنٹیوں کی تعداد بتیس ہے جن میں سے بارہ لندن میں ہیں۔لندن شہر اور اس کی کاؤنٹیوں کا کل رقبہ 610 مربع میل ہے اور یہ اسی میل کے نصف قطر میں پھیلا ہوا ہے۔ اسے ہی عظیم تر لندن (Greater London) کہا جاتا ہے۔

## ریلوے...زبردست نظام

برطانیہ والے دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے یہاں دنیا کا بہترین ریلوے نظام موجود ہے۔ اسے اگر مبالغہ آمیز بھی سمجھا جائے تو کچھ ایسا غلط بھی نہیں۔خود خیال کیجئے جب کسی شہر میں گیارہ بارہ لاکھ افراد روزانہ داخل ہوتے ہوں ان میں سے بھاری تعداد شہر کے اندر گھومتی پھرتی اور حرکت کرتی ہو اور پھر شام کو واپس بھی جاتی ہو تو اس کیلئے کتنے بڑے پیمانے پر ٹرانسپورٹ کی ضرورت ہے۔یہی وجہ ہے کہ لندن شہر میں ایک نہیں بلکہ چھ ریلوے اسٹیشن ہیں جو دائرے کی شکل میں لندن شہر کو گھیرے ہوئے ہیں۔یہ بہت بڑے بڑے اور ایک دوسرے سے فاصلے پر واقع ہیں۔ان میں مسافروں سے بھری ریل گاڑیاں چاروں اطراف سے آتی ہیں انہیں اتارتی اور واپس جانے والے مسافروں کو بھرتی ہوئی لوٹ جاتی ہیں۔

تین اسٹیشن یونی کنگرز کراس سینٹ پینکر یاس (St. Pancrias) اور یوسٹین (Euston) قریب قریب واقع ہیں اور وسطی برطانیہ (جسے مڈلینڈ کہا جاتا ہے) اور اسکاٹ لینڈ سے آنے والی ریل گاڑیوں کیلئے مخصوص ہیں۔درحقیقت پورے برطانیہ میں سب سے زیادہ مسافر

آتے بھی انہیں علاقوں سے ہیں۔ان سے بائیں طرف چلئے تو پیڈنگٹن (Pedington) کا مشہور ریلوے اسٹیشن ہے جہاں ویلز اور آکسفورڈ سے آنے والی ریل گاڑیاں اختتام پذیر ہوتی ہیں۔اس کے بعد وکٹوریہ کا مشہور زمانہ ریلوے اسٹیشن ہے جہاں جنوب سے آنے والی ریل گاڑیاں دریائے ٹیمز کو پار کرکے داخل ہوتی ہیں۔یہیں سے سمندر پار جانے کیلئے جہاز اور کشتیاں چلتی ہیں۔

اس سے ذرا ہٹ کر دریائے ٹیمز کے پار واٹر لو کا اسٹیشن ہے جہاں سے برائٹن (Brighton) کے لئے ریل گاڑی چلتی ہے جو جنوبی ساحل پر مشہور شہر اور تفریح گاہ ہے۔آگے چل کر لندن برج کا اسٹیشن ہے جہاں سے ڈوور (Dover) یعنی برطانیہ اور فرانس کے درمیان حائل سمندر اور یورپ کیلئے ریل گاڑیاں چلتی ہیں یا پھر واپس آکر ختم ہوتی ہیں۔اس سے اوپر لیور پول کا اسٹیشن آتا ہے جہاں کیمبرج سے آنے والی ریل گاڑی کا اختتام ہوتا ہے۔چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ برطانوی ریلوے کا سب سے بڑا اور اہم مرکز لندن ہی ہے۔ یہاں کے اسٹیشنوں پر ہر گیارہ سیکنڈ کے بعد ایک ریل گاڑی آکر رکتی ہے لیکن صرف رش کے اوقات میں یہاں لگ بھگ چار دہائی قبل پی۔125 کے نام سے ایک نئی تیز رفتار برقی ریل گاڑی متعارف کرائی گئی جس کی رفتار 125 میل فی گھنٹہ ہے اور یہ براستہ لیڈز،ایڈنبرا تک جاتی ہے۔

مجھے برطانوی ریلوے نظام کی یہ خوبی سب سے زیادہ پسند آئی کہ سفر کے کسی بھی اختتام پر آپ کو اسٹیشن سے باہر نکل کر دوسری سواری کیلئے مارا مارا پھرنا نہیں پڑتا ہے۔جہاں ایک سواری کا اختتام ہوتا ہے وہیں دوسری منزل کیلئے سواری موجود ہوتی ہے۔چنانچہ ریلوے کے تمام اسٹیشنوں کے پاس سے ٹیوب گزرتی ہے بلکہ ہوائی اڈوں کو بھی چھوتی ہوئی جاتی ہے۔یہ انتظام بندرگاہ پر بھی موجود ہے۔

## لندن کے ہوائی اڈے

لندن میں ایک نہیں تین تین ہوائی اڈے موجود ہیں۔ہیتھرو (Heathrow)، گیٹ وک اور تیسرا حال میں تعمیر شدہ سٹان سٹیڈ (Stansted)۔ہیتھرو کے متعلق برطانوی حکام کہتے ہیں کہ یہ دنیا کا سب سے بڑا معروف ہوائی اڈہ ہے کیونکہ اس سے تقریباً ساڑھے چار کروڑ مسافر سالانہ سفر کرتے ہیں حالانکہ جدہ کے شاہ عبدالعزیز ہوائی اڈے کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا کا مصروف ترین ہوائی اڈا ہے۔اس کے علاوہ دنیا کے اور بھی بہت سے مصروف ہوائی

اڈے ہیں لیکن ہیتھرو کی اپنی اہمیت ہے۔

برطانوی ریلوے کی اس ہوائی اڈے سے پنڈینگٹن تک ایک تیز رفتار برقی ریل گاڑی چلتی ہے۔تا کہ جہاز سے اترتے ہی مسافر ریل میں بیٹھ کر اپنی منزل کو روانہ ہوسکیں۔گیٹ وک کا ہوائی اڈہ نسبتاً جدید اور زیادہ خوبصورت ہے اور یہ بھی خاصا مصروف ہے۔اسے ریل کے ذریعے وکٹوریہ اسٹیشن سے ملایا گیا ہے۔یہاں اوپر کی منزل پر مسافر جہاز سے اترتا ہے اور نچلی منزل پر ریل اس کا انتظار کر رہی ہے جو اسے وکٹوریہ اسٹیشن لا کر اتار دیتی ہے۔سٹان سٹیڈ کا ہوائی اڈہ حال ہی میں مکمل ہوا ہے اس کا رابطہ بھی بذریعہ برقی ریل لندن سے قائم ہے۔

علاوہ ازیں فرانس سے زیر زمیں راستے کے ذریعے سفر کر کے آنے والوں کیلئے واٹر لو اسٹیشن پر ایک بڑا اڈہ قائم کیا جا رہا ہے۔لندن کی بندرگاہ پر اترنے والوں کیلئے بھی ایک ہلکی ریل گاڑی (از قسم ٹرام) چلتی ہے جو بندرگاہ کو دریائے ٹیمز کے کنارے موجود اسٹیشن سے ملاتی ہے۔ اس کی کل لمبائی ساڑھے سات میل یا 12 کلومیٹر ہے اور اس پر چھوٹے چھوٹے پندرہ اسٹیشن واقع ہیں۔اس کا سفر خاصا تفریحی ہوتا ہے۔



## ٹیوب...زیرزمین ریلوے

ہندوستان اور پاکستان کے علاقوں سے برطانیہ آنے والوں کیلئے بہت بڑا اعجوبہ زیر زمین ریل گاڑی ہے جسے عرف عام میں ٹیوب کہتے ہیں۔کہا جاتا ہے کہ دنیا بھر میں سب سے پہلی زیر زمین ریل گاڑی 1863ء میں لندن میں چلائی گئی تھی۔اس کا بڑا حصہ 1914ء میں ہونے والی جنگ عظیم سے پہلے ہی مکمل کر لیا گیا لیکن اس کے اضافی حصے دوسری جنگ عظیم کے دوران بنائے گئے۔اس کا سب سے اہم حصہ جسے جوبلی (Jubilee) کا خوبصورت نام دیا گیا ہے 1979ء میں مکمل ہوا۔ٹیوب کا احاطہ شمالاً جنوباً 35 کلومیٹر یا 22 میل اور شرقاً غرباً 56 کلومیٹر یا 35 میل ہے۔پٹڑیوں کی کل لمبائی چار سو کلومیٹر یعنی 254 میل ہے۔اس میں سے 169 کلومیٹر یا 105 میل زیر زمیں ہے۔اس کے 1272 اسٹیشن ہیں اور رش کے اوقات میں 478 گاڑیاں ادھر اُدھر دوڑنے اور مسافروں کو منزل مقصود پر پہنچانے میں مصروف رہتی ہیں۔لندن کا کوئی مقام ایسا نہیں جو اس کی دسترس سے باہر ہو۔اس وقت بڑا لطف آتا ہے جب نیچے اسٹیشن پر ریل گاڑی سے باہر نکلے اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے تو اپنے آپ کو بھرے بازار میں کھڑا پایا۔

ٹیوب میں ٹکٹ خریدتے اور اسٹیشن میں داخل ہوتے ہوئے معائنہ ہوتا ہے یا پھر باہر نکلتے وقت ٹکٹ واپس لیا جاتا ہے دوران سفر کوئی ٹکٹ چیکر یا کنڈیکٹر تنگ نہیں کرتا اس لئے شوقین لوگ اور بے کار نوجوان ایک دفعہ ٹیوب میں داخل ہو جائیں تو سارا دن اس میں بیٹھے بیٹھے سفر کرتے یا پکنک مناتے رہتے ہیں اور شام ہی کو باہر آتے ہیں۔ نوجوان اور بوڑھے خالی ریل گاڑی میں اس سہولت سے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔

## ذرائع آمد و رفت

دریائے ٹیمز لندن کے عین درمیان سے کسی بڑے اژدھے کی طرح لہراتا اور بل کھاتا نکل گیا ہے۔ اسے بھی برطانوی قوم نے نہیں بخشا، اس میں ایک تیز رفتار دریائی بس چلتی ہے جو وسطی لندن سے شروع ہو کر مسافروں کو بندرگاہ تک پہنچاتی ہے اور راستے میں ہوائی اڈے کو بھی چھوتی جاتی ہے۔ اس کا سفر خاصا دلچسپ ہوتا ہے۔ دریا میں بے شمار چھوٹے چھوٹے جہاز کشتیاں اور بجرے وغیرہ رواں دواں رہتے ہیں اور سیاحوں کو دریا کی سیر کراتے ہیں۔ اس کے علاوہ دریائے ٹیمز کو نقل و حمل کے ایک بڑے ذریعے کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

لندن کی سرخ رنگ کی دو منزلہ بسیں ساری دنیا میں مشہور ہیں بلکہ یوں کہیے کہ لندن کا قومی نشان ہیں۔ یہ خاصی تیز رفتار ہوتی ہیں اور عظیم تر لندن میں آمد و رفت کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔ مقامی کارپوریشن بھی سیاحوں کی خاطر خصوصی بسیں چلاتی ہے جو سیاحوں کو پورے لندن کے قابل دید مقامات دکھاتی ہیں۔ ان میں بعض بسیں خاص طور پر بغیر چھت کے بنائی گئی ہیں تاکہ مسافر اپنے آپ کو بازار میں محسوس کر سکیں۔ ان کے علاوہ ایک اور سہولت بھی ہے کہ ایک مخصوص رقم یعنی ڈھائی پونڈ ادا کر کے پورے دن کا سفری اجازت نامہ حاصل کیا سکتا ہے، اس پر چوبیس گھنٹے یعنی رات بارہ بجے سے دوسری رات بارہ بجے تک لندن بھر میں کہیں بھی اور جتنا جی چاہے سفر کیا جاسکتا ہے۔ لندن میں پانچ ہزار بسیں ہیں جو 490 روٹوں پر تقریباً تین ہزار کلومیٹر یا 1867 میل لمبی سڑکوں پر رواں دواں رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ تقریباً سولہ ہزار ٹیکسیاں بھی عوام کی خدمت کیلئے سڑکوں پر دوڑتی پھرتی ہیں۔

شہریوں کی تفریح بلکہ انہیں گھٹن سے بچانے کیلئے شہر کے گرد ایک چوڑی پٹی (گرین بیلٹ) بنائی گئی ہے۔ دوسری طرف شہر کے اندر بھی بے شمار پارک یا باغ بنائے گئے ہیں۔ ان میں قدیم بھی ہیں اور جدید بھی۔ شاہی محل (بکنگھم پیلس) کے عقب میں نہایت خوبصورت سرسبز گرین

پارک واقع ہے جو خالصتاً شاہی استعمال میں ہے۔اسی طرح ریجنٹ پارک بھی ایک شاہی باغ تھا لیکن اب اس میں عوام بھی گھومتے پھرتے ہیں۔تیسرا سب سے علیحدہ اور منفرد شہرت کا حامل ہائیڈ پارک (hydepark) ہے جو حکومت کی عملداری میں نہیں ہے۔یہاں جس کا جی چاہے بول سکتا ہے چاہے وہ حکومت کے خلاف ہو چاہے شاہی خاندان کے خلاف اسے نہ کوئی روک سکتا ہے نہ اس کے خلاف کوئی اقدام کر سکتا ہے۔

ہائیڈ پارک کے مغربی کونے میں ایک جگہ گوشۂ خطابت (اسپیکرز کارنر) کہلاتی ہے جہاں خوش دل بے فکرے ہر شام اکھٹے ہو کر اور لکڑی کے بنے ہوئے کریٹوں پر کھڑے ہو کر مختلف موضوعات پر بے دھڑک تقریریں کرتے ہیں۔وہ حکومت کو گالیاں تک دے سکتے ہیں حکومتی پالیسی پر کڑی تنقید اور دوسرے مذاہب پر حملہ کر سکتے ہیں سوائے ہاتھاپائی یا دھینگا مشتی کے وہ سب کچھ کر سکتے ہیں کیونکہ اس کام کو روکنے کیلئے وہاں پولیس موجود ہوتی ہے۔ان مقررین کو میچ باکس اسپیکر (Match Box Speaker) کہا جاتا ہے۔اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی مقرر کو ایک بھی سامع نہیں ملتا پھر بھی وہ بولے چلا جاتا ہے۔کئی سامعین مقرر پر فقرے بھی چست کرتے اور اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔دونوں میں لطیفہ بازی اور جملے بازی بھی خوب چلتی ہے۔لوگ خوب لطف لیتے ہیں،کوئی کسی کو سنجیدگی سے نہیں لیتا۔

ہائیڈ پارک محبت کرنے والے جوڑوں کے لئے بھی جنت ہے اور یہاں جس کا جو جی چاہے کرتا ہے، کسی کو کسی سے غرض نہیں ہوتی۔میں نے اپنی آنکھوں سے سخت بے حیائی کے مناظر دیکھے ہیں۔پارک کے اندر دو چھوٹی سی مصنوعی جھیلیں ہیں جن میں باقاعدہ کشتی رانی ہوتی ہے۔بطخیں وغیرہ بھی تیرتی رہتی ہیں۔مجموعی طور پر بہت اچھی سیر گاہ ہے۔اس کے علاوہ رچمنڈ پارک گرین ووڈ گرین وے بھی عمدہ تفریحی باغ ہیں۔

## کھیل کی شوقین قوم

برطانوی کھیلوں کے دیوانے ہیں۔لندن میں بھی کھیل کے بہت سے مراکز ہیں۔کرکٹ کا کون سا شائق ہے جو کرکٹ کے صدر دفتر اور عجائب گھر لارڈز سے واقف نہیں یہاں میچ کھیلنا ہر بلے باز کا خواب ہوتا ہے۔اس کے ساتھ ہی دوسرا تاریخی کرکٹ میدان اوول (Oval) بھی لندن میں واقع ہے۔یہ وہ میدان ہے جہاں پاکستان نے برطانیہ کے خلاف اپنا پہلا کرکٹ ٹیسٹ میچ جیتا تھا۔اور پاکستانی مایہ ناز بولر فضل محمود نے اتنی عمدہ بولنگ کرائی تھی کہ کہا جانے لگا کہ انگلینڈ

کی ٹیم کو فضلڈ آؤٹ کر دیا گیا۔ گویا ایک نئی اصطلاح وجود میں آ گئی۔ لارڈز اور اوول دونوں ہی لندن کی رونق کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔ فٹ بال کا عالمی شہرت رکھنے والا میدان ومبلے اسٹیڈیم (Wimbley Stadium) بھی لندن میں ہے۔ اس کے علاوہ ٹینس کا مشہور کلب ومبلڈن بھی یہاں ہے جہاں ہر سال ومبلڈن ورلڈ چمپئن شپ کے مقابلے ہوتے ہیں۔

## یادگاروں کی بہار

ثقافتی یادگاروں سے تو لندن اٹا پڑا ہے۔ جس زمانے میں برطانیہ کا طوطی دنیا بھر میں بولتا تھا اور جس کے متعلق انگریز فخر یہ کہا کرتے تھے کہ ان کی سلطنت میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا اس زمانے میں اس قوم کو دنیا بھر سے جس طرح بھی اور جو بھی نوادر ملے انہیں لندن لے جایا گیا۔ اس کام کیلئے چاہے برطانیہ کو چوری کرنا پڑی، ڈاکے ڈالنے پڑے، زبردستی کرنی پڑی، لالچ دینا پڑا اس نے ہر کام بلا کسی جھجک کے کیا۔ نتیجہ یہ کہ دنیا بھر کی یادگار چیزیں چاہے اس میں ہندوستان کا کوہ نور ہیرا، تختِ طاؤس، بیگمات اودھ کے ہیرے، جواہرات، کتابی نوادرات، مخطوطات شامل ہوں یا مصر کی ممیاں پتلیاں خزانے اور چین کے نوادر۔۔۔ سب کچھ لندن جا پہنچے۔ لطف اس کی بات یہ ہے کہ آنے والے چوروں اور ڈاکوؤں کو عوام نے قومی ہیروؤں کا درجہ دیا۔ اب یہ حال ہے کہ یہ نوادر لندن کے چپے چپے پر بکھرے پڑے ہیں۔ بکنگھم پیلس، سائنس میوزیم، نیشنل ہسٹری میوزیم، وکٹوریہ البرٹ میوزیم، نیشنل گیلری، انڈیا لائبریری اور سب سے بڑھ کر ٹاور آف لندن میں محفوظ کیے گئے نوادر انگریز قوم کی ملکیت کہلاتے ہیں۔

## آکسفورڈ سٹریٹ

لندن کا سب سے زیادہ خوبصورت اور بارونق حصہ اس کے وہ چھ عدد بازار ہیں جو پکاڈلی سرکس سے ایک دوسرے کی مخالف سمت نکلتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ بارونق آکسفورڈ اسٹریٹ ہے۔ یہاں فٹ پاتھ پر اتنا رش ہوتا ہے کہ کھوے سے کھوا چھلتا ہے اور چلنے کیلئے جگہ بھی نہیں ملتی۔ لیکن لطف کی بات ہے اس رش میں بھی مجمع باز اپنے اردگرد لوگوں کا ہجوم اکٹھا کیے چیزیں بیچتے نظر آتے ہیں اور پولیس کو دیکھتے ہی رفو چکر ہو جاتے ہیں۔ ان بازاروں میں عمارتیں انتہائی شاندار اور بلند و بالا ہیں جن میں دفاتر کی بھرمار ہے اور ان میں کام کرنے والے دور دور سے سفر کرنے آتے ہیں۔ صبح کے وقت بہت ہجوم ہوتا ہے۔ جب دفاتر کھلتے ہیں اس وقت فٹ پاتھ پر راستہ تلاش کرنا بھی دشوار ہوتا ہے یہی حال دوسرے بازاروں کا بھی ہے۔

## ٹریفک پر قابو پانے کے طریقے

اس انسانی جنگل میں بے پناہ ٹریفک پر قابو پانے کے لئے انتظامیہ نے کمال حسن تدبر سے کام لیا ہے۔ مختلف مواقع پر گھر سے نکلنے والوں کے لئے مختلف اوقات کا انتخاب کیا ہے۔ مثلاً بچوں کے اسکول اور کالج صبح سات بجے شروع ہوتے ہیں چنانچہ یہ وقت بچوں کیلئے مخصوص ہے۔ بچوں کو لے جانے کیلئے بسیں اور گاڑیاں مخصوص ہوتی ہیں۔ اس میں کوئی شخص دفتر یا مارکیٹ جاتا نظر نہیں آتا۔

نو بجے دفتر شروع ہوتے ہیں اس لئے ساڑھے آٹھ بجے سے نو بجے تک بابو صاحبان بسوں کیلئے لپکتے نظر آئیں گے اور کوئی بچہ یا خاتون خریداری کیلئے جاتی نظر نہیں آتی۔ مارکیٹیں اور ڈیپارٹمنٹل اسٹورز دس بجے کھلتے ہیں چنانچہ یہ وقت خواتین کی خریداری کیلئے مخصوص ہوتا ہے۔ اس طرح گویا وقت بانٹ لیا گیا ہے۔ اس طریقے سے ٹریفک میں آسانی ہو جاتی ہے۔ یہاں پاکستان والا طریقہ کار نہیں ہے کہ بچوں کے اسکول بڑوں کے دفاتر اور دکانیں مارکیٹیں سب ایک ہی وقت پر کھلتی ہیں لہٰذا ایک وقت میں سب بھاگتے دوڑتے نظر آتے ہیں ٹریفک پر بے انتہا دباؤ پڑ جاتا ہے۔ پھر دباؤ بھی فقط گھنٹہ بھر کیلئے ہوتا ہے۔ اس کے بعد بسیں ویگنیں سب خالی نظر آتی ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو اگر پاکستان میں بھی وقت کو بانٹنے کا اصول اپنا لیا جائے اس سے ٹریفک کا مسئلہ خاصی حد تک حل ہو سکتا ہے۔

## معاشرتی مسائل

دنیا میں جب بھی کسی قوم نے عروج حاصل کیا اور اسکے یہاں مال و دولت کی ریل پیل ہوئی تو اردگرد کے ممالک سے مختلف قوموں کے افراد اپنی قسمت آزمائی کیلئے ادھر دوڑ پڑے۔ ان افراد میں علماء فضلاء ہنرمند غیر ہنرمند ہر قسم کے لوگ شامل ہوتے ہیں جو نئے ملک کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس کی روشن مثالیں تاریخ میں عام ملتی ہیں۔ مغلیہ حکومت جب مستحکم ہوئی تو ایران تو ایران ہر جگہ سے لوگ ہندوستان آئے یہاں تک یورپ اور افریقہ سے بھی پہنچے۔

چین میں قبلائی خان کی حکومت مشہور ہوئی تو یورپ سے مارکوپولو تک اس کے دربار میں پہنچا۔ بغداد میں دولت کے چرچے ہوئے تو ساری دنیا سے لوگ دربار خلافت میں پہنچے۔ کچھ عرصہ قبل تک دوبئی کا چرچا تھا آج کل امریکہ کا شہرہ ہے جہاں پہنچنے کیلئے چین اور جاپان تک کے لوگ

بیقرار ہیں۔ پچھلی صدی کی کئی کئی نسلیں برطانیہ میں گزر چکی ہیں لیکن مخصوص رنگت ناک نقشے سے وہ لوگ صاف پہچانے جاتے ہیں کہ انگریز نہیں...... اگر چہ وہ خالص انگریزی لہجے میں بولتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ہر شخص اپنے ہم قوم وہم مذہب کے ساتھ رہنا پسند کرتا ہے اس لئے ان تارکین وطن نے اپنی اپنی بستیاں بسالی ہیں۔ ایسی ہی ایک بستی سکھوں اور ہندوؤں نے لندن میں ساؤتھ آل کے مقام پر بسائی ہے جسے دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ بندہ لندن میں گھوم رہا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ بمبئی یا امرتسر میں ہے۔ وہی ہندو اور سکھ کی مل جلی ثقافت وہی دودھ دہی پکوڑے کی دکانیں اور اسی طرح سکھ مکان سے باہر چارپائیاں ڈالے ہوا کا مزہ لیتے نظر آتے ہیں۔ سینما گھروں میں ہندوستانی اور پاکستانی فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ ریستورانوں اور ہوٹلوں میں لتا اور نورجہاں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں اور ٹھیٹھ پنجابی لہجے میں ایک دوسرے کو آوازیں دی جاتی ہیں وہی بے ہودہ ہنسی مذاق بھی ہوتا ہے۔۔۔غرض سب کچھ ہے لیکن اس علاقہ میں کوئی انگریز نہیں پایا جاتا۔

اسی طرح چائنہ ٹاؤن بھی موجود ہے جو چینی تارکین وطن کا آباد کردہ چھوٹا سا چین ہے اور چینی ثقافت کا زندہ نمونہ! ویسٹ انڈیز کے کالوں کے تو کئی محلے آباد ہیں۔ ہسپانوی بھی اپنی ثقافت کو زندہ رکھے ہوئے ہیں غرض کہ دیس دیس کا باشندہ اپنی اپنی بولی بولتا ہوا ملے گا۔ ایک اندازے کے مطابق شہر میں ایک سو ساٹھ مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ حکومت ان تارکین وطن کو انگریزی لکھنا پڑھنا اور سب سے بڑھ کر بولنا سکھا رہی ہے۔

## انگریز معاشرہ......خودغرضی کا اسیر

پچھلے وقتوں میں جو برطانوی معاشرہ تھا اس وقت شاید ایک دوسرے کیلئے خلوص محبت پیار اور قربانی کا جذبہ ہوا کرتا تھا لیکن اب تو خالصتاً خودغرضی اور نفسانفسی کا دور دورہ ہے۔۔ نصف صدی قبل ایک نعرے نے بہت مقبولیت حاصل کی تھی۔۔۔ ''کیا میں اپنے بھائی کا ذمہ دار ہوں؟ جس کا مطلب یہ تھا کہ مجھ پر صرف میری ذات کی ذمے داری ہے میں کسی اور کا ذمے دار نہیں۔''

آج کا برطانوی معاشرہ اس کی منہ بولتی تصویر ہے۔ ہر انگریز جو کچھ کماتا ہے اسے فقط اپنی ذات کیلئے مخصوص سمجھتا ہے، اس میں کسی اور کو شامل نہیں کرتا حتیٰ کہ سولہ سال سے زائد عمر کے بچوں کو بھی ارشاد ہوتا ہے۔ ''اپنے لیے کماؤ'' اس لیے خاندان کا ہر فرد جلد از جلد کماؤ پوت بنا اور خودمختار ہونا

پسند کرتا ہے۔ جب سب ہی کماتے ہوں تو ایک دوسرے کا لحاظ کس لیے؟ لہٰذا لوگوں میں خلوص و محبت کم ہی ہوتا ہے اور ہر چیز کو ذاتی مفاد کے نقطہ نظر سے پرکھا جاتا ہے۔

کسی انگریز کو کھانے پینے کی کوئی چیز یا سگریٹ ہی پیش کریں تو وہ بڑی مسکراہٹ خوشی اور شکریہ سے قبول کر لی جائے گی۔ لیکن انگریز خود کوئی چیز پیش نہیں کرے گا اپنا سگریٹ اکیلے پیے گا اور اپنا کرایہ خود ادا کرے گا۔ کتنے ہی آدمی کھائیں اپنا اپنا بل خود ادا کریں گے۔ اکٹھے بیٹھ کر کھائیں گے تو اپنا اپنا کھانا کھائیں گے کوئی کسی اور کو پیشکش نہیں کرے گا۔ ہمارے یہاں کسی کو کھانے کی دعوت دینی ہو تو کہا جاتا ہے۔ ''میرے گھر کھانا تناول کر کے میری عزت بڑھائیں۔'' انگریز یوں کہے گا '' آؤ میں تمہیں کھانا خرید کے دوں۔۔۔'' امریکیوں نے یہ انداز انگریز ہی سے لیا ہے۔ یہ رویہ پرایوں ہی سے نہیں اپنوں سے بھی ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں نفسا نفسی اتنی بڑھی ہے کہ خاندان جلد ٹوٹ جاتا ہے اور اس کی پروا بھی نہیں کی جاتی۔

## طلاق میں سب سے آگے

دوسری جنگ عظیم سے قبل انگریز عورت یورپ کی سب سے زیادہ ڈھکی چھپی باپردہ قسم کی انسان تھی۔ شرم و حیا میں بھی سب سے آگے تھی۔ جب جنگ عظیم میں مردوں کی کثیر تعداد کام آ گئی تو ملکی کاروبار چلانے کیلئے عورت کو میدان میں نکلنا پڑا۔ اسے ہر اس چیز کو چھوڑنا پڑا جو محنت مزدوری یا کام کاج میں رکاوٹ بنے اور ہر اس بات کو اپنانا پڑا جو کام کاج میں مدد دے۔ نتیجتاً پہلے بال چھوٹے ہوئے پھر شرم و حیا رخصت ہوئی۔ بے باکی آئی غیر ضروری کپڑوں کا بوجھ اتار اگیا۔ ٹخنوں تک لمبا اسکرٹ چھوٹا ہوتے ہوتے فقط چھ انچ لمبا رہ گیا اور منی اسکرٹ کہلایا۔ فیشن بڑھنے لگا یہاں تک کہ اس کے بغیر عورت کا باہر نکلنا محال ہو گیا۔۔۔ جب تنخواہ ہاتھوں میں آئی تو خود مختاری کا احساس جاگا۔ عورت نے مرد کی حیثیت اور حاکمیت کو چیلنج کرنا شروع کیا مرد کیساتھ عورت کے حقوق کی بات ہوئی اور مساوات کا دعویٰ ہوا۔ عورت کی ذہنی سطح اس بات پر جا ٹھہری کہ جب وہ کماتی ہے تو مرد کی بات کیوں سنے۔ چنانچہ گھر میں رخنہ پڑا اور بات جدائی پر جا ٹھہری۔ برطانیہ میں صرف سو سال پہلے طلاق دینا بڑی سخت معیوب بات سمجھی جاتی تھی لیکن آج برطانیہ کے مرد و خواتین طلاقیں دینے اور لینے میں سب سے آگے نکل گئے ہیں۔ یورپ بھر میں سب سے زیادہ طلاقیں لندن میں ہوتی ہیں جہاں سینکڑوں وکیل صرف طلاق دلانے کا کام کرتے ہیں۔

## لندن کا رہنے والا نہیں ملتا!

ایک دن میں اپنے دوست کے ہمراہ ہاتھی چوک (Elephant Square) پر کھڑا تھا۔ یہ ایک بہت بڑی وسیع، گول سیر گاہ ہے جہاں ہزاروں کی تعداد میں لوگ ہر شام تفریح کی غرض سے آتے ہیں۔ ہم دونوں نے تقریباً لوگوں سے پوچھنا شروع کیا "ایلیفنٹ اسکوائر کہاں ہے؟"

پہلا شخص ایک جرمن تھا جو پتلون اور قمیض پہنے اور چشمہ لگائے خاصا پڑھا لکھا نظر آ رہا تھا۔ سنتے ہی بولا "مجھے نہیں معلوم، میں آج ہی برلن سے آ رہا ہوں۔"

اگلا فرانسیسی نکلا، بولا کہ "میں نے تو یہ نام کبھی نہیں سنا۔"

تیسرا ایک شامی باشندہ تھا اسنے تلخی سے جواب دیا "مجھے کیا معلوم، کسی اور سے پوچھو۔"

چوتھا ایک امریکی تھا اسنے منہ سے پائپ نکالا اور بولا "ایلیفنٹ اسکوائر نام کی چیز کم از کم برطانیہ میں تو نہیں۔"

پانچواں ایک سکھ تھا بولا "اساں تے جی اپنی گرل فرینڈ نوں ملن آئے سی، تسی تے ایویں ای مل گئے او۔ آپاں نوں کی پتہ ایہ ایلی کی ہوندا اے" (ہم تو جی اپنی گرل فرینڈ سے ملنے آتے تھے آپ تو خواہ مخواہ ہی مل گئے۔ ہمیں کچھ نہیں معلوم کہ یہ ایلی کیا ہوتا ہے۔)

چھٹا برازیلی باشندہ تھا اس نے نفی میں سر ہلا دیا، کچھ نہ بولا اور آگے چل پڑا۔ ساتواں ایک شریف سا جاپانی تھا کہنے لگا "لمبی پرواز سے سیدھا ٹوکیو سے آ رہا ہوں کسی سے معلوم کر کے بتا سکتا ہوں۔" پھر میرے دوست کو دیکھ کر بولا۔ "کل آپ اس مقام پر ملیں۔"

آٹھواں سکاٹ لینڈ کا باشندہ تھا، کہنے لگا "مجھے برطانیہ میں رہتے ہوئے دس برس ہو چکے ہیں میں نے یہ نام کبھی نہیں سنا۔ میں ڈنڈی (اسکاٹ لینڈ کا چھوٹا سا شہر) سے کل ہی لندن میں وارد ہوا ہوں۔"

لندن میں کسی کو ایلیفینٹ اسکوائر کا علم نہ تھا حالانکہ سب اسی سیر گاہ پر کھڑے ہوئے تھے۔ سچ ہے لندن میں سب کچھ ملتا ہے بس ایک لندن کا رہنے والا نہیں ملتا۔



# لندن کی سیر

ایسٹ ہائیم لندن کے مرکز یعنی پکاڈلی سرکس سے لگ بھگ ستائیس اٹھائیس میل دور ایک ایسا علاقہ ہے جہاں زیادہ تر تارکین وطن اور خاص طور پر پاکستانی' ہندوستانی اور بنگلہ دیشی آباد ہیں۔ انگریز اس علاقہ میں بہت کم نظر آتے ہیں۔ کم و بیش تمام تر دکانیں اور کاروبار ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے ہاتھوں میں ہے۔ اردو' پنجابی ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے اور انگریزی کا تو بس تکلف ہی ہوتا ہے۔

محترمی اقبال صاحب اسی ایسٹ ہائیم کے مرکزی علاقے میں مرکزی سڑک پر بڑے ''گرجا گھر'' کے سامنے ایک دو منزلہ مکان میں رہتے بھی تھے اور کاروبار بھی کرتے تھے۔ نیچے ان کی دکان یا اسٹور تھا جو خوب چلتا تھا۔ پیچھے اور اوپر ان کی رہائش تھی جس میں وہ اپنی بیوی دو بیٹوں اور ایک بیٹی کے ساتھ رہتے تھے۔ سامنے ہی دو تین اسکول تھے جن کے ننھے منے طالب علم ان کے بڑے اچھے گاہک تھے اور وقفہ میں ان کی دکان پر اُن کا جمگھٹا سا لگ جاتا تھا۔

اقبال صاحب اس صدی کی چھٹی دھائی میں عام پاکستانی کی طرح سہانے مستقبل کا خواب آنکھوں میں سجائے کشتیاں جلا کر لندن آئے تھے۔ یہاں آ کے بقول ان کے انہوں نے بہت دھکے کھائے۔ پاپڑ بیلے۔ کئی گھٹیا کام کئے حتیٰ کہ لوڈر (بوجھ اٹھانے والے) کا کام بھی کیا لیکن واپسی کا خیال تک نہ کیا۔ اس مستقل مزاجی کا یہ ثمرہ تھا کہ آج وہ خود ایک چھوٹے سے سٹور کے مالک تھے جس میں وہ ان کی بیوی۔ بیٹی سب ہی کام کرتے تھے۔ بقول ان کے وہ ایک بہت ہی سخت زندگی گزار رہے تھے۔ صبح چار بجے اٹھ کے دکان کھولتے تھے کیونکہ اس وقت اخبار دکان پر آ جاتے تھے اور بکنا شروع ہو جاتے تھے۔ اس کے بعد سے رات کے بارہ بجے تک وہ مسلسل مشغول رہتے تھے۔ اس مشغولیت کی بنا پر ان کی کوئی سوشل زندگی نہ تھی۔ ملنا ملانا بہت کم تھا۔ ان کے نزدیک تفریح کا کوئی تصور نہ تھا اور نہ ہی وہ اس کے قائل تھے اور یہی وجہ تھی کہ ان کے بچے اور

بیوی گھر سے باہر جانے کے لئے ترستے تھے۔اتوار کے اتوار کبھی وہ بچوں کو باہر لے جاتے تھے وہ بھی اس لئے کہ اتوار کو ان کے سٹور کی چھٹی ہوا کرتی تھی اور یہ قانونی مجبوری تھی۔

اس طویل جدوجہد و محنت نے ان کے ان تمام اعلیٰ انسانی تصورات کو تہہ و بالا کر دیا تھا جو ان کے انتہائی نیک و پاک باز باپ نے انہیں سونپے تھے۔اب وہ روپیہ کو ہی دین وایمان سمجھتے تھے اور انسانی اعلیٰ اقدار کو فضول گردانتے تھے۔شراب پینے میں حرج نہ سمجھتے تھے گو اپنے بچوں کے سامنے احتیاط برتتے تھے لیکن پتہ سب ہی کو تھا۔

عیاشی سے بھی گریز نہ تھا اگر سستی دستیاب ہو جائے۔کبھی کبھی وطن کی یاد میں بے طرح آہیں بھرتے تھے لیکن واپس جانے کا نام نہ لیتے تھے کہ پاکستان میں ان کے لئے کچھ نہ دھرا تھا۔

دوسری صبح خاصی سرد تھی دھوپ بھی زرد زرد اور کمزور سی تھی۔ میں نے اپنا سیاہ سوٹ نکالا سفید قمیض پر سیاہ ٹائی لگائی اور بن ٹھن کر لندن فتح کرنے نکلا۔میری فرمائش پر گھر والوں نے دو عدد سینڈوچ بنائے پنی میں لپیٹے اور میرے حوالے کئے۔یہ میرا دوپہر کا لنچ تھا۔اس کے بعد یہ میرا معمول بن گیا کہ میں لندن کے قیام کے دوران روزانہ یہی لنچ لے کر لندن کی سیر کو نکل جاتا اور رات دس بجے کے لگ بھگ واپس آتا۔

میں نے کوٹ کی ایک جیب میں لنچ ڈالا اور دوسری میں کیمرہ ڈال کے کاؤنٹر پر کھڑے ہوئے اقبال صاحب کے حضور جا پہنچا جو ایک گاہک کو سودا دینے میں مصروف تھے تا کہ ان سے لندن کے قابل دید مقامات کے متعلق معلومات حاصل کر سکوں اور کچھ ہدایات بھی لے سکوں۔

اقبال صاحب نے سب سے پہلے تو میرے لئے بس کا ایک پاس تیار کیا۔لندن شہر میں بسیں چلانے والی کمپنی ''لندن ٹرانسپورٹ'' نے سیاحوں کی آسانی کے لئے پاس سسٹم کا اجرا کیا ہے۔اس پاس کی قیمت 1982ء میں دو پاؤنڈ تیس پنس ہوا کرتی تھی اور یہ چوبیس گھنٹے یعنی ایک رات کے بارہ بجے سے دوسری رات کے بارہ بجے تک کے لئے کارآمد ہوتا تھا۔اس عرصہ میں اس کی مدد سے لندن کی بسوں پر جتنا جی چاہے سفر کیا جا سکتا تھا۔بڑے لطف کی بات ہے کہ ایک دفعہ پاس خرید لیجئے پھر سارا دن کے لئے چھٹی۔سارا لندن گھومتے پھریئے اور وہ بھی بلا کرایہ......

پاس دیتے ہوئے اقبال صاحب نے یہ لحاظ کئے بغیر کہ میرے اور ان کے درمیان کتنا نازک رشتہ ہے جو ان کی بے تکلفی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ہدایت دیتے ہوئے فرمایا......

''سامنے سے پچیس نمبر بس چلتی ہے اس کو پکڑ لینا۔یہ آپ کو سیدھی وکٹوریہ اسٹیشن لے

جائے گی۔لمبا سفر ہے۔کم از کم ایک گھنٹہ تو لے گی۔وکٹوریہ اسٹیشن سے ایک اسٹاپ پہلے اتر جانا۔ وہاں سے دائیں ہو جانا۔تھوڑے فاصلے پر پکاڈلی سرکس ہے۔شہر کا مرکز' ڈاؤن ٹاؤن اس کا فوارہ' محبت کرنے والوں کے لئے ملنے کی اچھی جگہ ہے۔وہاں خوب نظارے ہوتے ہیں۔جی خوش ہو جاتا ہے۔اس کے سامنے ہی ایک گلی اندر کی طرف جاتی ہے جس پر تھوڑی سی چڑھائی بھی ہے۔اس چڑھائی کے بعد سوہو کا علاقہ آ جاتا ہے جہاں لندن کی طوائفیں کاروبار کرتی ہیں۔یہاں سب کچھ مل جاتا ہے۔اس کی زیارت بھی کر لینا۔پکاڈلی کے بائیں طرف آکسفورڈ اسٹریٹ ہے۔بڑا زبردست شاپنگ سینٹر ہے۔اس سے آگے نکلو گے تو ماربل آرچ ہے جس کے سامنے ہی ہائیڈ پارک ہے۔یہاں مست جوڑے آپس میں ملتے ہیں۔بڑی مزے کی جگہ ہے۔بڑا اہلا گلا ہوتا ہے۔اس سے ذرا فاصلہ پر ریجنٹ پارک ہے۔اچھی جگہ ہے۔اندر نوجوان جوڑوں کے چھپنے کی جگہیں بھی ہیں۔اور ہاں پکاڈلی سرکس سے ذرا نیچے ہٹ کر ٹریفالگر اسکوائر ہے جسے ہم پاکستانی ''طفیل گڑھ'' بھی کہتے ہیں۔یہاں کبوتر بہت ہوتے ہیں اور انسانوں سے مانوس بھی بہت ہیں' ان سے ملنا''۔

اس لمبی تقریر کے بعد انہوں نے سانس لیا۔قدرے توقف کیا اور بولے۔

''خیال رکھنا۔لندن رات میں گھومنے کی جگہ نہیں۔یہاں پاکستانیوں کے دشمن گنجے اسکن ہیڈ گھومتے پھرتے ہیں اور اکیلے اکیلے پاکستانی کی ٹھکائی بھی کر دیتے ہیں اس لئے جلدی پلٹ آنا۔سورج چھپنے کے بعد لندن خطرناک ہو جاتا ہے......!''

مجھ میں اس سے زیادہ لذت بھری ہدایات لینے کی تاب نہ تھی۔میں نے انہیں بتایا کہ میں سیدھا پاکستانی ہائی کمیشن جاؤں گا جہاں میرے کئی دوست کام کرتے ہیں ان میں سے کسی کو گائیڈ لے لونگا۔آپ کی مزے دار ہدایات کا شکریہ!

اقبال صاحب تو دوسرے گاہک کے ساتھ مصروف ہو گئے۔میں ان کی ہدایات کو ان ہی کے پاس چھوڑ کر باہر نکل آیا۔اور سڑک پار کر کے دوسرے کنارے پر بنے بس اسٹاپ پر کھڑا ہو گیا۔تھوڑی دیر بعد 25 نمبر بس آ گئی اور میں اس پر سوار ہو کر لندن شہر دیکھنے روانہ ہو گیا......خیال تھا کہ لندن سٹی یا ڈاؤن ٹاؤن جلد ہی پہنچ جاؤں گا لیکن بس کم بخت تیز رفتاری سے چلتی ہی رہی لیکن وکٹوریہ اسٹیشن کا کہیں پتہ نہ تھا۔لندن کی بسیں خاصی تیز رفتار ہیں ورنہ علاقے اتنے دور دور ہیں کہ ان کا سمیٹنا مشکل ہو جائے۔پورے ایک گھنٹہ بعد پکاڈلی کا اسٹاپ آیا۔میری بے صبری دیکھتے

ہوئے بس کنڈ یکٹر نے ہنس کے بتایا کہ ایسٹ ہائیم پکاڈلی سے پورے اٹھائیس میل دور ہے اور ابھی یہ شہر کے مرکز سے نزدیک ترین علاقوں میں شمار ہوتا ہے۔ سبحان اللہ اگر یہ نزدیک ترین علاقوں میں سے ہے تو دور کے علاقوں کا تو اللہ ہی حافظ ہے۔

بس کنڈیکٹر نے وکٹوریہ اسٹیشن سے ایک اسٹاپ پہلے مجھے اتار دیا جو ایک تنگ سی گلی میں واقع ہے یہ گلی آگے چل کے ایک بڑی سڑک سے مل جاتی ہے۔ بس بڑی سڑک پر پہنچ کر بائیں طرف مڑ گئی جہاں وکٹوریہ اسٹیشن واقع ہے۔ پکاڈلی سرکس چونکہ دائیں طرف واقع ہے اس لئے میں دائیں طرف مڑ گیا اور آگے بڑھنا شروع کیا۔ یہ سڑک خاصی چوڑی اور پر رونق ہے اس پر بلڈنگیں خاصی بڑی اور شاندار قسم کی ہیں۔ سڑک کے پار بائیں طرف ایک باغ سا نظر آ رہا تھا جس کے باہر دو تین پولیس والے بڑی بڑی روایتی سرخ اور سنہری ٹوپیاں پہنے کھڑے ہوئے تھے۔ اس منظر میں کوئی بھی بات ایسی نہ تھی جو توجہ کھینچ سکتی۔ میں مزے مزے سے ٹہلتا ہوا اس کے سامنے سے گزرتا چلا گیا۔ راستہ میں ایک دکان سے میں نے سرخ رنگ کا ایک خوبصورت سا اسکارف خریدا تا کہ پہلی ملاقات پر سمینتھا کو تحفہ دے سکوں۔

لگ بھگ دو فرلانگ کے بعد سڑک اچانک ہی ختم ہو گئی۔ اختتام پر نیلے رنگ کا ایک اسٹریٹ بورڈ تھا جس پر جلی حروف میں پکاڈلی سرکس لکھا ہوا تھا۔ دو قدم مزید چلنے پر اچانک ہی ایک عظیم الشان چوراہا بلکہ چھ راہا نمودار ہو گیا جس کے بیچوں بیچ ایک دیوہیکل ......فوارا نصب تھا جس کے عین وسط میں بچوں کی سی معصوم شکل صورت اور جسم والا۔ ہاتھ میں تیر کمان لئے کیوپڈ کا مجسمہ اس پر سایہ کر رہا تھا جس کا مطلب یہ ظاہر کرنا تھا کہ یہ چوک محبت کرنے والوں کے لئے ہے۔ فوارے کی دیوار سے لگے درجنوں جوڑے دھوپ سینک رہے تھے اور آپس میں چہلیں بھی کر رہے تھے۔ فوارے کے گرداگرد بہت سے بینچ پڑے ہوئے تھے جن پر زیادہ تر بوڑھے حضرات بیٹھے جوانوں کا تماشا دیکھ رہے تھے اور اس طرح شاید اپنی جوانی کو یاد کر رہے تھے۔ فوارے پر جیسے میلہ سا لگا ہوا تھا اور ایسے محسوس ہوتا تھا کہ شاید سارا لندن ہی یہاں جمع ہو گیا ہو اور لوگوں کو سوائے تفریح کے کوئی کام ہی نہ ہو۔ ادھر ادھر درجنوں افراد کیمرے لئے ایک دوسرے کی تصویریں بنا رہے تھے اور ہر شخص کی خواہش تھی کہ تصویر میں فوارا ضرور آئے۔ فوارے کے گرد کھڑے ہوئے لوگ ان کی اس خواہش سے واقف معلوم ہوتے تھے اس لئے ہٹنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ ان نوجوانوں میں کئی نوخیز جوڑے بھی شامل تھے۔ ابھی میں اس منظر سے لطف اندوز ہی ہو رہا تھا کہ

ایک جاپانی جوڑا میری طرف بڑھا اور اپنا کیمرہ میرے ہاتھ میں تھما کر بولا۔

''اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو ہماری ایک تصویر بنا دیں۔''

یہ کہہ کر وہ دونوں فوارے کی دیوار کے پاس جا کر ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کھڑے ہو گئے اور میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگے۔ میں نے جھٹ سے کیمرے کا بٹن دبا دیا۔ اس کے بعد میری باری تھی میں نے کیمرہ جاپانی کے ہاتھ میں تھمایا اور خود فوارے کی دیوار کے ساتھ جا کے کھڑا ہو گیا۔ میرے برابر میں ایک نوجوان جوڑا ضرورت سے کچھ زیادہ ہی مست ہو رہا تھا لڑکے کو لڑکی نے دیوار کے ساتھ دبا رکھا تھا۔ اور چٹاچٹ کی آواز سے فضا گونج رہی تھی۔ جاپانی نے جھٹ بٹن دبا دیا۔ میں اب بھی کبھی اس تصویر کو دیکھتا ہوں تو اس میں سے چٹاچٹ کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

جاپانی جوڑا رخصت ہوا تو میں بھی ایک بنچ پر جا بیٹھا اور خدا کی قدرت کا تماشا دیکھنے لگا۔ بے تحاشہ لوگ آ جا رہے تھے۔ زیادہ تر نوجوان جوڑے تھے جو ہاتھ میں ہاتھ ڈالے یا ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے جا رہے تھے۔ بعض من چلے جوڑوں نے ایک دوسرے کی ہپ پاکٹ میں ہاتھ ڈال رکھا تھا۔ غرضیکہ ایک ہنگامہ بپا تھا۔ اچانک میری توجہ ایک جانب مبذول ہو گئی۔ فوارے سے ٹیک لگائے ایک جوڑا ضرورت سے زیادہ ہی ایک دوسرے سے فری ہو رہا تھا۔ خصوصاً لڑکا تو حد سے گزر رہا تھا۔ لڑکی نے پہلے تو نرمی سے منع کیا پھر جھڑکا بھی لیکن لڑکا نہ مانا۔ پہلے لڑکی کے رخسار پر زوردار چٹکی لی پھر ایک انتہائی نامعقول حرکت کرنے کی کوشش کی تو لڑکی نے زور سے گھٹنا اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان دے مارا۔ چوٹ خاصی شدید تھی۔ لڑکا بلبلا اٹھا۔ ضرب کی جگہ ہاتھ رکھ کر دہرا ہو گیا اور اسی عالم میں ایک ٹانگ پر ناچنے لگا۔ لڑکی پہلے تو اسے خونخوار نظروں سے گھورتی رہی پھر غصے کے عالم میں ایک طرف چل دی۔ لڑکے نے جب دیکھا کہ لڑکی جا رہی ہے تو سارا درد بھلا کے اس کے پیچھے بھاگا اور تھوڑی دیر میں اسے جا پکڑا۔ تھوڑی دیر میں دونوں پھر ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے جا رہے تھے۔ مجھے یہ منظر کبھی نہ بھولے گا۔ میرے برابر بیٹھے ہوئے پوپلے منہ والے بڑے میاں پہلے تو دلچسپی سے یہ منظر دیکھتے رہے پھر مسکرا کر کہنے لگے۔ ''بہت شریر ہو گئے ہیں آج کل کے بچے...... ہیں نا۔؟''

ہلکی سنہری دھوپ میں یہ دلچسپ مناظر دیکھ کر میں لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اچانک پیچھے سے آواز آئی۔ ''اچھا تو دھوپ سے لطف اندوز ہوا جا رہا ہے۔'' ''Enjoying the Sun''

مڑ کر دیکھا تو سمینتھا کھڑی تھی۔

''ہیلو''...... میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''ہیلو''...... سمینتھا نے ہاتھ بڑھا دیا جسے میں نے تھام لیا۔

''آؤ...... بیٹھو...... تماشا دیکھو۔ بڑے پر لطف تماشے ہو رہے ہیں۔ پھر خنکی میں نرم نرم دھوپ بھی لطف دے رہی ہے''۔

سمینتھا بنچ پر بیٹھ کر دلچسپی سے ''تماشے'' دیکھنے لگی اور میں سمینتھا کو دیکھنے لگا۔ کل کے مقابلے میں سمینتھا آج کچھ بڑی بڑی سی لگ رہی تھی اور قدرے صحت مند بھی۔ اس کے سنہری بال قدرے لمبے تھے اور شانوں سے تھوڑا نیچے تک آتے تھے جنہیں اس نے سختی سے کنگھی کر کے پیچھے باندھ رکھا تھا۔ اس سے اس کا گول چہرہ قدرے لمبوترا لگ رہا تھا اور آنکھیں بڑی بڑی جس میں سرمے کی باریک دھار اچھی لگ رہی تھی۔ سفید قمیض اور نیلی ٹائٹ جینز میں وہ لڑکی کی بجائے ایک نوخیز خوبصورت لڑکا نظر آ رہی تھی۔ بس کانوں میں لمبے سے کانٹے جھول رہے تھے جو خاصے بھلے لگ رہے تھے۔ مجموعی طور پر وہ خاصی جاذب نظر بلکہ خوبصورت لڑکی نظر آتی تھی۔

کچھ دیر خاموشی رہی جیسے دونوں طرف سے خاموشی توڑنے کا انتظار ہو۔ پھر دفعتاً سمینتھا بولی۔

''میں نے امی سے آپ کا ذکر کیا تھا۔ وہ بہت خوش ہوئی تھیں اور ملنے کا کہہ رہی تھیں۔ لیکن وہ دو بجے کام سے واپس آئیں گی ہم اس وقت گھر چلیں گے اور ہاں آج دوپہر کا کھانا آپ ہمارے ساتھ کھائینگے۔ امی نے خاص طور پر کہا تھا۔ وہاں باتیں ہونگی۔''

''اور تمہارے ابا جان۔؟'' میں نے سوالیہ لہجہ میں کہا۔

''ان کا تو مدتیں ہوئیں انتقال ہو چکا ہے۔ مجھے تو ان کی شکل بھی یاد نہیں''۔ سمینتھا قدرے مغموم لہجے میں بولی۔ ''میری ممی نے مجھے اور میرے چھوٹے بھائی کو بہت محنت سے پالا ہے۔ میری ممی بہت خوبصورت ہیں لیکن ہماری خاطر انہوں نے دوسری شادی نہیں کی حالانکہ ان کے بہت سارے دوست تھے اور انہیں شادی کی کئی پیشکش بھی ہوئی تھیں۔ ایک صاحب تو ابھی تک ان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ ہم بھی چاہتے ہیں کہ ممی مان جائیں تاکہ تنہائیوں سے انہیں نجات ملے لیکن ہماری وجہ سے وہ مان کے ہی نہیں دیتیں''۔

پھر کچھ ہنس کے بولی۔ ''دراصل ممی ہم سے محبت بھی تو بہت کرتی ہیں۔''

سمینتھا بغیر پوچھے ہی اپنی گھریلو باتیں بتائے جا رہی تھی۔ اس لمحے مجھے محسوس ہوا یا تو وہ بہت ہی بھولی ہے لیکن انگریز لڑکی اور بھولی۔؟ ناممکن ماننے والی بات ہی نہیں...... یا...... پھر بہت ہی چالاک ہے جو خوامخواہ کی ہمدردی بٹورنے کے لئے ایسی باتیں کر رہی ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ واقعی بھولی بھالی اور محبت و توجہ کی بھوکی لڑکی تھی......؟

''سمینتھا......! میں تمہارے لئے ایک چھوٹی سی چیز لایا ہوں۔ ایک ننھا سا تحفہ۔!''

''سچ۔!'' سمینتھا کی آنکھیں جگمگا اٹھیں۔ ''کیا لائے آپ میرے لئے؟''

جب میں نے اسکارف پیش کیا تو وہ بھونچکی سی رہ گئی۔ اس کی آنکھیں پھٹی اور منہ کھلا رہ گیا۔

''میرے لئے۔؟ یہ خوبصورت اسکارف؟ لیکن کس لئے؟ ہم...... تو ابھی ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف بھی نہیں ہوئے۔؟۔ ویسے یہ ہے خوبصورت۔! مجھ پر جچے گا بھی بہت۔!''

سمینتھا آخر ایک انگریز لڑکی تھی۔ اس قوم کی فرد۔ جو کسی بھی آنے والی چیز کو ''نہ'' نہیں کہہ سکتی۔

سمینتھا نے اسکارف گلے میں باندھ لیا جو واقعی اس پر خوب جچا۔ اسکارف پہن کر وہ بہت خوش ہوئی۔ اسی خوشی کے عالم میں میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور کہنے لگی:۔

''یہاں بیٹھے رہنے سے بہتر ہے چلو کہیں گھومتے پھرتے ہیں۔ ابھی تو صرف ساڑھے دس بجے ہیں۔ ممی سے ملنے ہم پونے دو بجے گھر پہنچیں گے۔ ہمارے پاس خاصا وقت ہے۔ چلو چلتے ہیں۔ یہ بتاؤ کسی خاص جگہ کو دیکھنے کا پروگرام ہے تو پہلے وہاں چلتے ہیں......!''

میں نے کہا...... ''سنا ہے بکنگھم پیلس یہاں سے قریب ہی ہے۔ اس کی بہت شہرت سنی ہے۔ اگر کہیں قریب ہی ہے تو پہلے اسے دیکھ لیتے ہیں۔ آخر یہ محل دنیا کی سب سے بڑی طاقت کا محور رہا ہے یہاں دنیا کی طاقت ورترین ہستی رہتی ہے اور یہ بھی سنا ہے کہ برطانیہ کے عوام اس خاندان سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔''

سمینتھا زیر لب مسکرائی۔

''اگر میں بھی برطانیہ سے دور کسی ملک میں بیٹھی ہوتی تو یہی سمجھتی کہ شاہی خاندان برطانیہ میں بہت مقبول اور ہر دلعزیز ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ شاہی خاندان واقعی کبھی برطانوی عوام میں بہت

مقبول تھا اور لوگ اس کی بہت عزت کرتے تھے لیکن دو عظیم جنگوں نے اس کی مقبولیت کے غبارے میں سے ہوا نکال دی ہے۔ رہی سہی کسر شاہی خاندان کے افراد نے اپنی بے تکی چھچھوری حرکتوں سے پوری کردی۔ اب اس کی عزت ووقعت وہ نہیں رہی۔ جب تک ملک میں دولت رہی کسی کو شاہی خاندان کی غلطیوں کی پرواہ نہ تھی لیکن دوسری جنگ عظیم نے برطانیہ کو اقتصادی طور سے تباہ کردیا تو یہ خاندان کھلنے لگا ہے۔ پہلے تو یہ حال تھا کہ کبھی بادشاہ۔ ملکہ یا کسی شہزادہ شہزادی کو معمولی بخار بھی ہو جاتا تھا تو بے چین اور مضطرب عوام کے ٹھٹ کے ٹھٹ بکنگھم پیلس کے باہر جمع ہو جایا کرتے تھے کہ خیریت معلوم کریں اور صحت یابی کی دعا کریں لیکن دونوں جنگوں نے یہ مقبولیت ختم کردی۔ اب لوگوں اور خاص طور پر نوجوان طبقہ میں یہ تاثر عام ہوتا جارہا ہے کہ شاہی خاندان برطانوی عوام پر بوجھ ہے اور اسے ختم ہونا چاہئے۔ اب عوام اس کے اسکینڈلز اور افواہوں میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ شاہی خاندان کے افراد کی معمولی معمولی لغزشوں کو چٹخارے دار قصوں میں بدل کے بڑے مزے سے چھاپا اور سنایا جاتا ہے۔ شہزادیوں تک کو نہیں بخشا جاتا۔ شاہی خاندان کو بدنام کرنے کا کوئی موقع نہیں گنوایا جاتا۔ کہا جاتا تھا کسی زمانے میں...... کہ مستقبل میں بالآخر پانچ بادشاہ رہ جائیں گے۔ چار تاش کے اور پانچواں برطانیہ کا۔ لیکن صورت حال ایسی دکھائی دیتی ہے کہ پانچواں بھی لڑکھڑا ہی رہا ہے۔"

سمینتھا کی طویل تقریر مجھے حیرت زدہ کرگئی۔ میری معلومات میں گراں قدر اضافہ ہوگیا!

"لیکن کیوں۔؟"۔ میری حیرت میں کمی نہ آئی۔ میں نے پوچھا۔ "شاہی خاندان عوام کا کیا لیتا ہے؟" "یہ تو آئینی بادشاہت ہے۔ ملکہ عالیہ تو قطعی بے اختیار ہیں۔ وزیراعظم ہی ملک کا حاکم ہے۔ ملکہ سے تو بس سرکاری تقریبات کا افتتاح ہی کرایا جاتا ہے اور کیا......! وہ غریب کسی کا کیا بگاڑتی ہے۔"

"سمینتھا ہنسی......" شاہی خاندان کے افراد خاصی خدمات انجام دیتے ہیں اور اپنی ہر خدمت کا گراں قدر معاوضہ بھی وصول کرتے ہیں' بلکہ' اس کا خاوند اور بیٹے' لاکھوں پونڈ سالانہ کا وظیفہ حاصل کرتے ہیں۔ اب تو عام لوگ بھی برملا پوچھنے لگے ہیں۔ کہ اس ملک میں جسے "جمہوریت کی ماں" کا درجہ حاصل ہے شاہی خاندان کا کیا کام؟ اس کی ضرورت کیا ہے۔؟ اور شاہی خاندان کی عیاشیوں پر جو پیسہ خرچ ہوتا ہے کیا اسے کسی اچھے مصرف میں نہیں لایا جاسکتا؟۔ لیکن چلئے میں آپ کو بکنگھم پیلس دکھلاتی ہوں۔"

پکاڈلی سرکس پر کھڑے ہو کر اگر آکسفورڈ اسٹریٹ کی طرف منہ کیا جائے تو بائیں طرف کی بڑی سڑک دریائے ٹیمز کو جاتی ہے اور یہی وہ سڑک ہے جس پر چل کر میں پکاڈلی سرکس پہنچا تھا۔ یہ آدھ میل طویل ہے۔ اسی سڑک پر بکنگھم پیلس واقع ہے۔ سمینتھا نے میرا ہاتھ پکڑا اور ہم دونوں اس سڑک پر آہستہ آہستہ چلنے لگے۔

تھوڑی دیر تک ہم خاموشی سے چلتے رہے۔ یکایک ہمارے سامنے سے پرانے ماڈل کی پھٹیچر سی فاکسی ویگن کار گزری اور تھوڑی دور آگے جا کے ایک بہت بڑے سُپر سٹور کے سامنے رک گئی۔ اس کا دروازہ کھلا اور ایک سمارٹ سا نوجوان کود کر باہر نکلا۔ پچھلے دروازہ سے دو تین حسین لڑکیاں برآمد ہوئیں۔ دو لڑکیوں نے نوجوان کی بانہوں میں بانہیں ڈالیں اور سب ٹہلتے ہوئے سُپر سٹور میں گھس گئے۔

''انہیں پہچانا؟۔ یہ کون ہے۔؟'' سمینتھا نے یکا یک سوال کیا۔

ظاہر ہے میں کیا جواب دیتا۔ میرا تو لندن میں پہلا دن تھا۔ کسی سے جان پہچان کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

سمینتھا ایک لمحہ کے لئے خاموش کھڑی انہیں دیکھتی رہی۔ پھر زہر آلود ہنسی ہنسی۔

''یہ ملکہ کا سب سے چھوٹا بیٹا ہے۔ چھوٹا شہزادہ...... جو ہر وقت حسین لڑکیوں کے جھرمٹ میں رہنا پسند کرتا ہے۔''

میرے لئے یہ عجیب سی بات تھی۔ برطانیہ کی عظیم الشان مملکت کا لاڈلا شہزادہ اور پھٹیچر سی فوکسی میں گھومتا پھرتا ہے۔ میرے ملک کے تو عام سے وڈیرے کا بیٹا بھی پجارو سے کم گاڑی پر سفر کرنا اپنی توہین سمجھتا ہے۔ پھر یہ کیا کوئی محافظ بھی ساتھ نہیں......؟

ہم اس سپر اسٹور کے پاس سے گزرے جس میں شہزادہ اپنی گرل فرینڈز کے ساتھ داخل ہوا تھا لیکن وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ شہزادے کو اندر کوئی لفٹ نہیں ملی تھی ورنہ کوئی مجمع تو ضرور ہوتا۔ عام شہریوں کا سا سلوک ہوا ہوگا اس غریب و مظلوم شہزادے کے ساتھ۔!

سمینتھا نے اشارہ کیا اور ہم سڑک کراس کر کے دائیں طرف آ گئے۔ کچھ دور چلنے کے بعد سمینتھا ایک جگہ رک گئی۔ یہ وہ جگہ تھی جس کے سامنے دو تین سپاہی اپنی لمبی لمبی سرخ ٹوپیوں کے ساتھ کھڑے تھے اور جس کے سامنے سے میں گھنٹہ بھر پہلے گزرا تھا اور جس نے مجھے ذرا برابر متاثر نہیں کیا تھا۔ باہر گیٹ تھا۔ اندر دور تک لان تھا اور اس کے بعد ایک غیر متاثر کن عمارت کھڑی

تھی۔

''یہ ہے بکنگھم پیلس......لو دیکھ لو اسے جی بھر کے......!'' سمینتھا نے عمارت کی طرف اس طرح اشارہ کیا جیسے کوئی معصوم سی شرارت کر رہی ہو۔''

میں تو یہ سن کر حیران ہی رہ گیا۔ باہر سے اتنی معمولی نظر آنے والی عمارت کیا ملکہ برطانیہ کا محل ہو سکتی ہے؟ ابھی میری حیرت دور نہ ہوئی تھی کہ یکا یک سمینتھا کہنے لگی۔

''میں ذرا آگے چلتی ہوں۔ آپ ایسے کریں۔ سامنے ڈیوٹی پر کھڑے سپاہی سے پوچھیں کہ ڈیوک آف ایڈنبرا کہاں ہیں۔ دیکھیں کیا جواب ملتا ہے؟''

یہ کہہ کر وہ چل پڑی اور خاصی دور جا کے کھڑی ہو گئی۔

میں سامنے کھڑے سپاہی کے پاس گیا اور بڑے ادب سے پوچھا۔

''ڈیوک آف ایڈنبرا کہاں ہیں۔ مجھے ان سے ملنا ہے۔''

سپاہی تو جیسے جلا بھنا بیٹھا تھا۔ اس نے پہلے تو دو عدد لذیذ سی گالیاں لڑھکائیں ڈیوک کی طرف۔ اس کے بعد ڈیوک آف ایڈنبرا کی شان میں جو کچھ کہا وہ اس قابل نہیں کہ جسے بیان کیا جا سکے۔ ان گالیوں کو سن کر دوسرا سپاہی آگے بڑھا۔ سر سے ٹوپی اُتاری اور پہلے سپاہی سے بھی بڑھ کر غلیظ گالیاں ڈیوک کی شان میں لڑھکا دیں۔

یاد رہے ڈیوک آف ایڈنبرا ملکہ کے خاوند ہیں اور ان کی عیاشیوں کی جھوٹی سچی داستانیں مشہور ہیں جس کے لئے وہ اکثر یورپ کا سفر کرتے رہتے ہیں۔

اب میرے لئے وہاں کھڑا رہنا ناممکن سا ہو گیا تھا۔ میں نے کھسک جانا ہی مناسب سمجھا اور ایک پٹے ہوئے بچے کی طرح وہاں سے چل پڑا۔ سمینتھا کے پاس پہنچا تو وہ ہنسی کے مارے اس طرح دہری ہو رہی تھی جیسے شریر بچہ اپنی شرارت کے کامیاب ہونے پر مسرور ہوتا ہے۔ بڑی مشکلوں سے اس کی ہنسی رکی' کہنے لگی۔

''دیکھ لی شاہی خاندان کی مقبولیت۔!''

میرے پاس ظاہر ہے اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ کیا کہتا۔ ہاں میرے علم میں بیش بہا اضافہ ہو گیا۔

ہم دونوں دریائے ٹیمز کی طرف چہل قدمی کے انداز میں چلتے رہے۔ کبھی کبھی کسی دکان کے باہر سجے ہوئے شوکیس کے پاس کھڑے ہو کر بلاوجہ اس میں سجی چیزیں دیکھنا شروع کر دیتے

جسے انگریزی میں ونڈو شاپنگ **Window Shopping** کہتے ہیں۔ابھی صبح کے گیارہ ہی بجے تھے اور دو بجے تک وقت بھی تو گزارنا تھا۔چلتے چلتے سمینتھا کو نہ جانے کیا سوجھی کہ اس نے اچانک میرے ہاتھ میں اپنا ہاتھ ڈال دیا اور اسے سختی سے پکڑ لیا۔میری جھجک پر کہنے لگی:۔

''اس طرح علیحدہ علیحدہ گھومنا اچھا نہیں لگتا۔انگریز لڑکے گھورنا شروع کر دیتے ہیں۔اگر کوئی جوڑا ہاتھ میں ہاتھ ڈالے جا رہا ہو تو اسے بخش دیا جاتا ہے۔''

دریائے ٹیمز کے کنارے جو سڑک اس کے ساتھ ساتھ چلی جاتی ہے۔وہاں پہنچ کر ہم دائیں طرف مڑ گئے۔اس سڑک پر رش قدرے زیادہ تھا۔اس رش سے بچتے بچاتے اور ونڈو شاپنگ کرتے ہم دونوں لاابالی جوڑے کی طرح آگے نکل گئے اور اچانک گھاٹ پر جا پہنچے جہاں لپلپاتے پانیوں پر ایک چھوٹا وفاقی جہاز اور دو عدد اسٹیمر کھڑے تھے تاکہ سیاحوں کو دریائے ٹیمز کی سیر کرائی جا سکے۔سامنے سیاحوں کا ایک اچھا خاصا ہجوم کھڑا اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔

سمینتھا کے نہ نہ کرتے کرتے میں نے اسٹیمر کے دو ٹکٹ خرید لئے۔سمینتھا خاصی حیران ہوئی کیونکہ انگریزوں میں کسی کے لئے کچھ خریدنے کا رواج نہیں سوائے اس وقت کہ جب کوئی بہت بڑی غرض وابستہ ہو۔گویا کسی کے لئے کوئی چیز خریدنا اسے ایک طرح کی رشوت دینا ہے۔خصوصاً لڑکیوں کو تحفہ دینا تو خاص شک والی بات ہے۔

تھوڑی دیر بعد اسٹیمر کا ہوٹر بجا۔یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ مسافر اسٹیمر میں سوار ہو جائیں۔ہم دونوں اسٹیمر کے عرشے پر چلے گئے اور وہاں پڑی ہوئی بنچ پر بیٹھ گئے جہاں پہلے ہی بہت سے مرد اور عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں اور سامنے کچھ بچے کھیل رہے تھے۔صبح کی خنکی میں سورج کی نرم نرم حدت بہت اچھی لگ رہی تھی۔موسم خاصا خوشگوار اور رومانٹک ہو رہا تھا۔سامنے دریائے ٹیمز کا از حد گدلا پانی ہلکے ہلکے ہلکورے لے رہا تھا۔اتنے میں قریب سے بھونپو بجاتا ایک اسٹیمر تیز رفتاری سے گزر گیا جس سے پانی میں ہلچل مچ گئی اور ہمارا اسٹیمر بری طرح ڈولنے لگا۔سمینتھا نے دونوں ہاتھوں سے میرا بازو تھام لیا اور میرے ساتھ چپک سی گئی۔تھوڑی دیر بعد جب جہاز معمول پر آ گیا تو کچھ معذرت آمیز سے لہجے میں کہنے لگی:۔

''معاف کیجئے گا.....بس کچھ ڈر گئی تھی۔اسٹیمر بری طرح ڈول گیا تھا.....''

اب میری باری تھی۔میں نے ذرا ہنس کر قدرے شوخ لہجے میں کہا:۔

''کمبخت چھوٹا سا اسٹیمر تھا۔ کتنا اچھا ہوتا اگر کوئی بڑا سا جہاز گزرتا تو پھر......تو لطف ہی آ جاتا......''

سمینتھا نے تیز نظروں سے مجھے گھورا......گویا کہہ رہی ہو۔''اچھا۔تو آپ بھی۔؟''پھر خود ہی زور سے ہنس پڑی۔ ایسے محسوس ہوا جیسے فضا میں جل ترنگ بج اٹھے ہوں۔ اس ہنسی میں ایسی معصومیت اور شوخی گھلی ہوئی تھی کہ چند مسافر یکدم ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔ ان میں سے ایک میری طرح کے رنگدار یعنی پاکستانی یا ہندوستانی تھے اور خاصی بڑی عمر کے تھے۔ داڑھی تک سفید ہو رہی تھی۔ کچھ دیر خاموش ہمیں گھورتے رہے پھر عجب سے لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئے:۔

''اماں یار۔ بڑا المباز بردست ہاتھ مارا ہے۔ لونڈیا تو کراری دِکھے ہے''

اس سے کچھ آگے بڑھنا ہی چاہتے تھے کہ میں نے اک دم ٹوک دیا:۔

''بڑے میاں۔ یہ باتیں آپ کو زیب نہیں دیتیں۔ کم از کم اپنی عمر ہی دیکھ لیں۔ یہ آپ کی بچی کے برابر ہے......''

بڑے میاں اک دم تڑق اٹھے۔''اے یہی تو ظلم ہوا ہے ہمارے ساتھ اس عمر میں آئے ہیں ہم یہاں۔!جوانی میں آئے ہوتے تو ماں قسم تمہاری طریوں عیش کر ریئے ہوتے۔''

پھر سمینتھا کو دیکھ کر للچائے......''اماں جانوں ہوں ان کم بختوں کو......کیا کیا نہ کریں ہیں یہ۔!سب جانوں ہوں۔''یہ کہہ کر منہ دوسری طرف کر لیا اور لگے بڑبڑانے۔ نہ جانے کیا کچھ بول رہے تھے لیکن شکر ہے آواز ہم تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ سمینتھا نے کئی دفعہ پوچھا کہ ہوا کیا اور یہ بزرگ شریف آدمی کیا کہہ رہے تھے اور کیوں ناراض ہو رہے تھے۔

اب میں سمینتھا کو کیا بتاتا کہ یہ شریف بزرگ آدمی اپنی گئی گزری جوانی اور اُس کی حسرتوں کو یاد کر رہے تھے اور نہایت ہی گھٹیا طریقہ سے اپنی جنسی خواہش کا اظہار کر رہے تھے۔ میں نے بس یہ کہہ کر ٹال دیا۔ کہ کچھ نہیں بس تمہاری آواز کی تعریف کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ بڑی خوبصورت ہنسی تھی۔

اس پر سمینتھا نے بس ایک ہی جملہ کہا۔''اس قسم کی تعریف اور اس لہجے میں......کم از کم میرے ملک میں تو کوئی نہیں کرتا۔ یہ صاحب تو کچھ زیادہ ہی تعریف کرتے دکھائی دے رہے تھے۔''

بڑے میاں پر ایسا گھڑوں پانی پڑا کہ پھر پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ مجھے ان کی گھٹیا حرکت پر

غصہ تو بہت آیا لیکن اس کا اظہار ۔ بدنامی کی صورت میں نکلتا۔ لہٰذا مناسب یہی سمجھا کہ خاموش رہا جائے اور معاملہ ختم کیا جائے۔

اسٹیمر میں مسافر بھرتے جا رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں کھچا کھچ بھر گیا چنانچہ سیڑھیاں کھینچ لی گئیں۔ اسٹیمر نے ایک زوردار ہارن دیا اور ٹیمز کے گدلے پانی پر کھسکنے لگا۔ بچوں نے تالیاں بجا کر خوشی کا اظہار کیا۔ عورتیں اور مرد اسٹیمر کے کنارے تلے ریلنگ پر جمع ہو گئے اور قریب سے گزرتے ہوئے بجروں اور کشتیوں کو بڑے شوق سے دیکھنے لگے۔

چھوٹی چھوٹی کشتیاں قریب سے گزرتی بہت بھلی لگتیں ان میں سوار مرد اور عورت ہمارے اسٹیمر کے مسافروں کو دیکھ کر شور مچاتے' ہاتھ ہلاتے اور خوش ہوتے' ادھر سے بھی ایسی ہی حرکتیں کی جاتیں۔ کبھی کبھی کوئی خوبصورت سی خاتون دکھائی دے جاتی تو ہوائی بوسہ پھینکنے سے بھی گریز نہ کیا جاتا اس پر دوسری طرف سے ناراضگی کی بجائے خوشی کا اظہار ہوتا اور جوابی بوسہ اچھالا جاتا۔ دونوں طرف کے مسافر خوشی خوشی اس لمحہ بھر کی دورسے ملاقات سے ہی خوش ہو جاتے۔ ہر شخص ہنس رہا تھا خوش ہو رہا تھا۔ بڑا مسحور کن منظر تھا۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس گہما گہمی کی مصروف اور مشینی زندگی میں سے لوگوں نے خوش ہونے کے لئے چند لمحے ادھار لئے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد تالیاں بجیں تو معلوم ہوا کہ ایک پل آ رہا ہے جس کے نیچے سے اسٹیمر گزرے گا۔ پل آیا تو پل پر کھڑے لوگوں نے ہاتھ ہلائے۔ اسٹیمر سے بھی پورا پورا جواب دیا گیا۔ سمیتھا بھی بچوں کی طرح خوش ہو ہو کر ہاتھ ہلا رہی تھی۔ ایک کے بعد دوسرا پل آیا۔ وہاں بھی یہ منظر تھا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ لندن کے بےفکرے تفریح کی تلاش میں جمع ہو گئے ہوں۔ کوئی آدھ گھنٹہ تک سفر کے بعد اسٹیمر واپس ہوا اور ان ہی راستوں سے گزرتا ہوا پھر اس جگہ آ کے کھڑا ہو گیا جہاں سے روانہ ہوا تھا۔ سیر ہو چکی تھی۔ کھیل ختم پیسہ ہضم۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ ہم بھی اسٹیمر سے اتر آئے یہ تفریح واقعی بہت اچھی رہی۔ سمیتھا خصوصاً بہت خوش تھی۔ بچوں کی طرح تالیاں بجاتی رہی۔

دریائے ٹیمز کی سیر کے بعد ہم اس راستہ سے واپس ہوئے جس سے آئے تھے۔ جب بکنگھم پیلس کے سامنے سے گزرنے لگے تو سمیتھا قدرے شوخ لہجے میں بولی۔

''ڈیوک آف ایڈنبرا کا حال تو پوچھ چکے۔ جائیے۔ اب ذرا پرنس آف ویلز کا حال پوچھ آئیے.....''

میں نے کانوں کو ہاتھ لگایا کیونکہ ابھی گھنٹہ بھر پہلے ہی تجربہ حاصل کر چکا تھا۔

بکنگھم پیلس کے سامنے سے گزر کر ہم پکاڈلی سرکس پہنچ کر بائیں طرف آکسفورڈ اسٹریٹ پر آ گئے یہاں زبردست رش تھا اور کھوے سے کھوا۔ چھل رہا تھا۔ بلند و بالا آسمان کو چھوتی عمارتوں کے نیچے سجی سجائی دکانوں اور اسٹوروں پر ہم بلاوجہ ونڈو شاپنگ کرنے لگے۔ ایک جگہ خاصی بھیڑ سی دیکھی۔ قریب پہنچنے پر معلوم ہوا کہ ایک خاتون اور اس کے ساتھی مرد نے فٹ پاتھ پر ہی دکان لگا رکھی تھی۔ شاید کچھ خوشبوئیں فروخت کر رہے تھے۔ مرد ایک طرف کھڑا چوکنے انداز میں چاروں طرف نظریں دوڑا رہا تھا۔ موٹی سی عورت اس سے بے نیاز دو رسالے پکڑے بلند آواز میں تقریر کر رہی تھی۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ ڈیپارٹمنٹل اسٹور والے بڑے چور ہیں بہت زیادہ منافع لیتے ہیں۔ میرے پاس مشہور خوشبو کی فقط چند بوتلیں ہیں جنہیں میں کمپنی کی مشہوری کے لئے آدھی قیمت پر بیچ رہی ہوں۔ جس نے لینا ہو جلدی سے لے لے کہیں ایسا نہ ہو کہ پولیس آ پہنچے اور اس سامان کے ساتھ پکڑ کر مجھے جیل میں بند کر دے اور آپ اس عظیم تحفہ سے محروم رہ جائیں۔

ابھی اس کی ایک دو بوتلیں ہی بکی ہونگی کہ اچانک اس کا ساتھی چلایا...... ''پولیس''۔ یہ سنتے ہی عورت اور اس کا ساتھی چیل کی طرح گتے کے ان ڈبوں پر جھپٹے جن میں بوتلیں موجود تھیں۔ انہیں سر پر اٹھایا اور مجمع کو چیرتے ہوئے یہ جا وہ جا...... مجمع بھی آن واحد میں تتر بتر ہو گیا۔ فقط دونوں رسالے جنہیں خاتون تقریر کے دوران لہرا رہی تھی۔ فٹ پاتھ پر پھڑ پھڑاتے رہ گئے۔ میں یہ منظر اور بالخصوص خاتون اور اس کے ساتھی مرد کی پھرتی پر ہنسنے لگا تو سمینتھا کہنے لگی کہ ان سڑکوں پر مجمع لگا کے بیچنا خلاف قانون ہے لیکن بیچنے والے باز نہیں آتے۔ بس اس قسم کی آنکھ مچولی سارا دن ان لوگوں اور پولیس کے درمیان چلتی رہتی ہے۔ کبھی کبھار ایسے لوگ پولیس کے ہتھے چڑھ بھی جاتے ہیں اور سزا بھی پاتے ہیں لیکن باز نہیں آتے۔

تھوڑی دور چل کر ایک پاکستانی اسٹور نظر آیا جہاں پاکستانی زیورات قسم کی چیزیں بک رہی تھیں۔ یہاں سے میں نے مینا والی سیاہ چوڑیاں خریدیں اور یہ کہہ کر سمینتھا کو پیش کیں کہ اس کی گوری گوری کلائیوں میں خوب جچیں گی۔ اور واقعی جب اس نے پہنیں تو اس پر خوب جچیں۔ سمینتھا نے بڑے شوق سے پہنیں اور بہت ہی خوش ہوئی۔ اظہار تشکر کے طور پر انہیں انگلیوں سے بجاتی اور اپنے گالوں سے لگاتی رہی۔ خوشی سے اس کی آنکھوں میں جو چمک آئی وہ مجھے کبھی نہ بھولے گی

......اسے چوڑیاں بہت ہی پسند آئی تھیں اور ظاہر ہے تحفہ کسے پسند نہیں آتا۔!

اگلی دکان سے میں نے سمینتھا کی ماں کے لئے چاکلیٹ کا ایک بڑا سا پیکٹ خریدا کیونکہ سمینتھا نے مجھے بتایا کہ اس کی ماں کو چاکلیٹ بہت پسند ہیں۔

اس کے بعد میں اور سمینتھا وقت گزاری کے لئے بے مقصد آکسفورڈ اسٹریٹ پر گھومتے اور ونڈو شاپنگ کرتے رہے۔ سمینتھا چھوٹی اور معصوم معصوم سی باتیں کرتی رہی۔ جب میں اسے پاکستان کی کوئی ایسی بات بتاتا جو اس کے لئے نئی ہوتی تو وہ چلتے چلتے رک جاتی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں اور کشادہ ہو جاتیں اور وہ ''اوہ نو'' کہہ کر اپنی حیرت کا اظہار کرتی تو مجھے بڑی اچھی لگتی۔ جب کسی بات پر متفق ہونے کے لئے سر ہلاتی تو اس کے کانوں کے لمبے لمبے بُندے اور لمبی سی پونی ٹیل جھولنے لگتی تو وہ اور بھی زیادہ خوبصورت نظر آنے لگتی۔

ایک بجے کے لگ بھگ ہم ایک بس پر سوار ہوئے جس نے لگ بھگ آدھے گھنٹہ کے سفر کے بعد ایک مضافاتی بستی میں ہمیں اتار دیا۔ سمینتھا کا گھر وہاں سے زیادہ دور نہ تھا۔ وہی انگریزی طرز کا سرخ اینٹوں کا بنا ہوا۔ مکان سرخ کھپریلوں سے ڈھکی ہوئی ڈھلوان چھت اور سامنے شیشے کا بنا ہوا لگ بھگ دس فٹ اونچا اور پانچ فٹ چوڑا شوکیس۔ مکان میں داخل ہوتے ہی بائیں طرف ایک چھوٹا سا لان اور دائیں جانب ایک چھوٹا سا گیراج تھا۔

سمینتھا کی ماں ابھی تک آفس سے نہیں آئی تھی۔ سمینتھا کی منی سی پیاری سی بہن جس نے سر کے پیچھے پونی ٹیل اور ماتھے پر جھالر سجا رکھی تھی اپنے منے سے بھائی کے ساتھ گیند بلا کھیلتے ہوئے شور مچا رہی تھی۔ ہمیں دیکھ کر کھیل رک گیا۔ دونوں منے سے بہن بھائی نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ سمینتھا کے کہنے پر نہ صرف مجھے گڈ نون Good Noon کہا بلکہ میرا ہاتھ بھی چوما۔ میں نے بھی دونوں کو پیار کیا۔ دونوں بچے خاصے خوبصورت۔ صاف ستھرے اور تمیز دار نظر آتے تھے۔ تھوڑی دیر میں ہی مجھ سے گھل مل گئے۔ بچی نے مجھے اسکول میں سیکھی ہوئی پوئم اور رہائیم سنائیں۔ بچہ ابھی اس قابل نہ تھا بس گود میں بیٹھا رہا۔ سمینتھا وقت گزاری کے لئے چائے کا ایک کپ بنا لائی اور پھر میوزک لگا کر اس کی لے پر تھرکنے لگی۔

یہ تماشا ابھی جاری ہی تھا کہ اچانک دروازہ کھلا اور اکٹھی چار پانچ خواتین دھڑ دھڑ کرتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان میں سب سے آگے ایک جوان اور خاصی قبول صورت خاتون تھیں جس کو دیکھتے ہی میں پہچان گیا کہ سمینتھا کی امی ہے۔ باقی سب بوڑھی بوڑھی سی تھیں لیکن

میک اپ سے سب ہی بھرپور تھیں۔ جوان بننے کے شوق میں سب ہی مبتلا نظر آتی تھیں۔

سب سے آگے آنے والی خاتون نے مجھے دیکھتے ہی ایک وسیع وعریض مسکراہٹ چہرے پر سجالی۔اور ہاتھ پھیلا کر بولی:۔

''اوہ.....میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ آپ وہی ہیں جو کل سمینتھا کو ملے تھے اور آج میری درخواست پر مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ میں اپنے گھر میں آپ کو خوش آمدید کہتی ہوں۔ میں سمینتھا کی امی ہوں اور یہ میری عزیز سہیلیاں ہیں۔ یہ چار تو میرے ساتھ کام کرتی ہیں اور یہ پانچویں میری ہمسائی ہیں اور پاکستانی ہیں۔آج انہوں نے جب سنا کہ پاکستان سے کوئی مذہبی عالم آیا ہے اور میری درخواست پر میرے گھر آرہا ہے تو انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ یہ بھی ملنا چاہتی ہیں تو میں انہیں بھی ساتھ لیتی آئی۔امید ہے آپ مائنڈ نہ کریں گے.....!''

اس لمبی تقریر کے بعد انہوں نے اپنی سہیلیوں سے میرا تعارف کرایا جس میں مسز علی حسین بھی شامل تھیں۔ جو تھیں تو ہندوستانی لیکن پاکستانی کہے جانے پر قطعی بُرا نہیں مانتی تھیں۔مسز حسین انگریزوں سے بڑھ کر انگریز لگ رہی تھیں۔بس ذرا رنگ میں مار کھاتی تھیں۔اس کے بعد ہم سب کو چھوڑ کر امی سمینتھا کو لے کر باورچی خانے میں چلی گئیں تاکہ جتنی دیر میں ہم گپ شپ کر کے ایک دوسرے سے متعارف ہوں وہ کھانے کا بندوبست کر سکیں۔

کھانے کی میز پر فقط تین آدمیوں کا کھانا دیکھ کر میں حیران رہ گیا لیکن یہ حیرانی اس وقت دور ہوئی جب چاروں خواتین نے اپنے اپنے پرسوں سے لنچ پیکٹ نکال کر سامنے رکھ لئے۔البتہ مسز علی حسین نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ وہ گھر سے کھا کر آئی ہیں۔اس پر کسی نے ان سے اصرار بھی نہیں کیا کہ وہ ضرور ہی کھائیں یا ایک نوالہ ہی لے لیں۔ چنانچہ تیار کردہ لنچ میں نے سمینتھا نے اور اس کی امی نے کھایا۔ یہ ایک ٹھنڈا لنچ تھا جو ڈبوں سے نکال کر سامنے رکھ دیا گیا تھا۔اس میں سادہ ڈبل روٹی کے ٹکڑے، مکھن، ابلے ہوئے آلو، ابلے ہوئے بیف (گائے کا گوشت) کے ٹکڑے جس میں شوربہ کثرت سے تھا۔ ابلے ہوئے مٹر کے دانے تھے۔سخت بے مزہ کیونکہ اس سارے کھانے میں نہ تو نمک تھا نہ ہی مرچ اور گھی کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کیونکہ سوائے ڈبل روٹی اور مکھن کے ہر چیز ابلی ہوئی تھی۔لطف آتا تو کیونکر۔ پاکستانی کھانے بہت یاد آئے۔ سمینتھا

اس چیز کو بھانپ گئی۔اس نے مجھے بتایا کہ یہ روزمرہ کے بہترین کھانوں میں سے ایک تھااور عام برطانوی گھرانے کی نارمل غذا۔کھانے کے بعد سمیتھا مگوں میں چائے لے آئی۔

چائے کے دوران ہی ''آمدم برسر مطلب'' کے مصداق گفتگو کا رخ اسلام۔اسلامی قوانین اور اسلام میں عورتوں کے حقوق کی طرف پھر گیا۔سمیتھا نے میرے بارے میں نہ جانے کیا کچھ کہا تھا کہ اس کی امی مجھے اسلام پر ایک اتھارٹی سمجھ بیٹھی تھی۔سب سے پہلے تو میں نے ان کی یہ غلط فہمی دور کی کہ میں کوئی ملا یا مولوی یا مبلغ دین ہوں جو اسلام پھیلانے کے لئے نکلا ہو۔میں نے انہیں بتایا کہ میں سیدھا سادا مسلمان ہوں اور بس۔ہاں اسلام کے موٹے موٹے اصولوں سے واقف ہوں بلکہ کچھ گہرائیوں تک بھی جا سکتا ہوں۔اس کے بعد میں نے نکاح اور طلاق کے متعلق اسلام کے احکامات بیان کئے۔جب میں نے انہیں بتایا کہ اسلام میں بلا وجہ طلاق دینے کی نہ صرف یہ کہ سخت ممانعت ہے بلکہ اس پر رسول خداؐ نے لعنت بھی فرمائی ہے۔اور یہ کہ محض عیاشی کی خاطر شادی کی اجازت تو اسلام قطعی طور پر نہیں دیتا۔اس پر ان خواتین میں سنسنی سی پھیل گئی۔ایک خاتون کہنے لگی کہ ہم تو بچپن سے ہی سنتے آئے ہیں کہ اسلام عیاشیوں کا مذہب ہے اور اس میں چار بیویاں رکھنے کا حکم ہے۔جتنی مرضی شادیاں کرو۔بس طلاق دیئے جاؤ اور تعداد بس چار رکھو۔اور یہ کہ ہر مسلمان چار شادیاں مذہبی فریضہ سمجھ کر کرتا ہے بلکہ سنت رسولؐ سمجھ کر بھی کیونکہ پیغمبر اسلام نے خود درجن بھر سے اوپر شادیاں کی تھیں۔اس پر میں نے انہیں بتایا کہ پاکستان ایک ایسا اسلامی ملک ہے جہاں سب سے زیادہ مسلمان بستے ہیں۔اس لحاظ سے وہاں ہر مسلمان کے گھر میں چار بیویاں ہونی چاہئیں لیکن جس جگہ میں رہتا ہوں۔اس کو مرکز مان کر ایک میل نصف قطر کا دائرہ لگایا جائے تو اس میں دس ہزار سے زیادہ گھر آجائیں گے۔ان دس ہزار گھرانوں میں سے کسی میں بھی دوسری بیوی نہیں ملے گی۔دراصل دوسری، تیسری اور چوتھی شادی کی اجازت بیوہ، لاوارث عورتوں کو سہارا دینے کی کوشش ہے۔مغرب میں مرد ایسی عورتوں کو مسٹریس (داشتہ) کے طور پر رکھتا ہے۔اس کا کبھی اعلان نہیں کرتا۔اگر اولاد ہو جائے تو کبھی مان کر نہیں دیتا اور نہ اسے اپناتا ہے۔مسلمان نکاح کر کے پوری پوری ذمہ داری اٹھاتا ہے۔اب بتایئے کہ کون سا نظام بہتر ہے۔؟'' اس پر خواتین کچھ کچھ قائل ہوگئیں۔

چار کی تعداد کے متعلق میں نے بتایا کہ یہ اللہ کا خاص انعام اس کے بندوں اور خاص طور پر عورتوں کے لئے ہے۔اسلام سے قبل مرد سوسو دو دو سو عورتوں کا حرم رکھا کرتے تھے۔اس تعداد کو

تاریخ میں پہلی دفعہ کنٹرول کیا گیا۔اس پر خواتین خاموش سی ہو گئیں۔

اس کے بعد اسلام میں عورت کے مقام پر بات ہوئی۔تو جب میں نے بتایا کہ اسلام اور فقط اسلام ہی نے عورت کو وہ ارفع واعلیٰ مقام دیا ہے جو آپ لوگوں کے وہم وگمان میں بھی نہیں۔تو ایکدم ''اوہ نو......اوہ نو......'' کی صدائیں بلند ہوئیں۔جب میں نے کہا کہ اسلام تو ماں کے پاؤں تلے جنت قرار دیتا ہے تو وہ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں۔پھر جب یہ بات کی گئی کہ اسلام میں عورت اور مرد کے حقوق مساوی ہیں تو کسی کو یقین نہ آیا۔

یہ دلچسپ گفتگو کوئی ڈیڑھ گھنٹہ چلی۔خواتین نے جی بھر کر اعتراضات کئے۔اس میں یہ پہلو بھی آیا کہ مسلمان اپنی بیوی کو پردہ کراتا ہے۔غلام بنا کے رکھتا ہے۔باہر نکلنے نہیں دیتا۔گھر میں قید کر کے رکھتا ہے۔ایک خاتون تو شبہ ظاہر کر رہی تھیں کہ عورتوں کو زنجیر پہنا کر رکھا جاتا ہے اور پاکستان میں عورت بہت ہی کسمپرسی کی حالت میں ہے۔تو میں نے انہیں کہا کہ ایسی باتوں پر یقین کرنے کی بجائے خود پاکستان جا کے دیکھیں تو انہیں معلوم ہوگا کہ پاکستانی عورت ہر میدان میں مرد کے شانہ بشانہ ہے۔پاکستان میں خاتون جج بھی ملیں گی اور خاتون وکیل بھی۔استاد بھی ہیں۔یونیورسٹی کی وائس چانسلر بھی۔حکومت میں بڑے بڑے عہدوں پر کام کر رہی ہے۔ڈاکٹر بھی ہے انجینئر بھی۔غرض زندگی کے ہر شعبہ میں عورت کا حصہ ہے یہاں تک کہ ہوائی جہاز کی پائلٹ بھی عورت ملے گی۔ظاہر ہے مرد کی اجازت، تعاون اور سہارے کے بغیر یہ سب کچھ نہیں ہو سکتا۔تو ان خواتین کو بمشکل یقین آیا۔میں نے یہ وضاحت بھی ضروری سمجھی کہ پاکستان میں عورت نہ تو مادر پدر آزاد ہے اور نہ ہی وہ ایسا ہونا پسند کرتی ہے۔بلاوجہ اور بغیر ضرورت گھر سے نہیں نکلتی جو ایک اچھی چیز ہے۔اس پر تمام خواتین نے صاد کیا۔

ایک خاتون نے اعتراض کیا کہ اگر اسلام اتنے ہی اچھے اصولوں کا مذہب ہے تو تمام مسلمان نیک کیوں نہیں ہو جاتے یہ بڑی دلچسپ اور ناقابل تردید حقیقت تھی کہ مسلمانوں اور خصوصاً پاکستانیوں نے اپنی حرکتوں سے مغرب میں اپنا نام بدنام کر رکھا ہے۔اس سلسلہ میں میں نے یہ وضاحت کر دی۔کہ اسلام کے اصول بلاشبہ سنہری ہیں اور بہترین زندگی گزارنے میں معاون لیکن اس سے فائدہ وہی اٹھا سکتا ہے جو ان پر عمل کرے۔یہ ضروری نہیں کہ اسلام قبول کرتے ہی ہر شخص فرشتہ بن جائے یا پھر یہ کہ ہر مسلمان فرشتہ ہو جاتا ہے۔نہیں بلکہ عام انسان ہی رہتا ہے جو بشری کمزوریوں سے بری نہیں ہوتا۔اور انہی کمزوریوں کے تحت ایسی حرکتیں کر بیٹھتا

ہے جو مسلمانوں کے لئے ممنوع ہوتی ہیں۔ لیکن یہ اس کا اپنا فعل ہوتا ہے اور اسلام اس کا ذمہ دار نہیں۔ اس لئے کبھی نہ سمجھئے گا کہ ہر مسلمان فرشتہ ہوتا ہے۔ ہاں اس کے فرشتہ ہونے میں شک نہ ہو گا اگر وہ سختی سے اسلامی اصولوں پر کاربند ہو......"

چار بج رہے تھے۔ میں لندن دیکھنے کے لئے بے تاب ہو رہا تھا۔ آخر میں اس بحث مباحثے کے لئے تو لندن نہیں آیا تھا۔ لیکن خواتین مزید کچھ پوچھنے کے موڈ میں تھیں۔ یہ محفل طول پکڑتی جا رہی تھی کیونکہ ان خواتین کے سامنے ایسی ایسی نئی باتیں آ رہی تھیں جو ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھیں۔ صرف مسز علی حسین خاموش بیٹھی تھیں۔ ظاہر ہے کہ وہ مسلمان تھیں اور جو باتیں میں نے بیان کیں وہ ان کے علم میں ہونگی۔ ویسے انہوں نے بھی چند سوالات کئے لیکن زیادہ تر خاموش ہی رہیں۔ جب محفل برخواست ہونے لگی تو بڑی اداسی سے کہنے لگیں۔

"کل آپ پھر آیئے گا۔ میں آپ کو لندن میں سیٹل ایک مسلمان گھرانا دکھاؤں گی۔ پھر آپ مجھے رائے دیجئے گا۔ مجھے آپ کی رائے اور دعاؤں کی سخت ضرورت ہے۔ آپ کو سمیتھا ہمارے گھر لے آئے گی۔!"

میں نے وعدہ کر لیا......اور وہ دوسری خواتین کے ہمراہ رخصت ہو گئیں۔

میں نے اجازت چاہی تو سمیتھا کی امی نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور کرسی پر بٹھا کر بولی۔

"میں نے آپ سے سمیتھا کے متعلق کچھ بات کرنی ہے بلکہ مشورہ کرنا ہے اس کے لئے آپ کو کچھ دیر مزید ٹھہرنا ہوگا" پھر جب میں آرام سے بیٹھ گیا تو انہوں نے سمیتھا کو کافی کا ایک کپ بنا کر لانے کے بہانے باورچی خانے میں بھیج دیا اور بولیں۔

"سمیتھا میری بڑی بیٹی ہے۔ بہت سیدھی سادی، بھولی بھالی ہے۔ ہر ایک پر بہت جلد اعتبار کر لیتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے باپ کا بہت جلد انتقال ہو گیا تھا۔ اس سے اس بچی کو پورا پیار نہ مل سکا۔ جس کی وجہ سے اس میں پیار کی بھوک پیدا ہو گئی ہے۔ باپ کے انتقال کے بعد یہ پڑوس کے لوگوں سے کہا کرتی تھی کہ آپ مجھے اجازت دیں میں آپ کو ڈیڈی کہہ لیا کروں۔ اس کی یہ باتیں مجھے خون کے آنسو رلایا کرتی تھیں۔ اب یہ بڑی ہو چکی ہے اور ذمہ دار بھی لیکن اس کی پیار محبت کی بھوک میں کمی نہیں آئی۔ اسی وجہ سے راہ چلتوں سے بھی دوستی کر لیتی ہے اور دوسروں کو بھی اپنی طرح مخلص سمجھتی ہے۔ اس کی اس کمزوری کی وجہ سے میں فکر مند رہتی

ہوں کہ کہیں دھوکا نہ کھا جائے۔ خود ہی دیکھ لیجئے کہ سادگی کی انتہا ہے کہ کل ہی آپ سے ٹرین میں اتفاقیہ ملاقات ہوئی ہے اور یہ آپ کو گھر آنے کی دعوت دے دیتی ہے۔ اس کی دوسری کمزوری یہ ہے کہ پیار کی کمی نے اسے خوابوں میں بسنے والی لڑکی بنا دیا ہے اس لئے کچھ رومان پرور بھی واقع ہوئی ہے۔ کچھ عرصہ قبل اس کی ایک پاکستانی لڑکے سے ملاقات ہوئی تھی جس نے اس کے حسن کی کچھ زیادہ ہی تعریف کر ڈالی۔ بس اتنی سی بات پر ہی یہ پھسل گئی ہے اور اس لڑکے سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ مجھے تو وہ لڑکا کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ اس کی حرکات بھی چھچھوری سی ہیں لیکن چونکہ سمینتھا اسے پسند کرتی ہے اس لئے یہاں کے رسم رواج کے مطابق میں کچھ کر بھی نہیں سکتی۔ آپ کو دیکھ کر امید بندھی ہے اور آپ کی باتوں سے ہمت پیدا ہوئی ہے کہ آپ سے اس معاملہ میں مدد لی جائے۔ آپ ہم پر مہربانی کریں اور اس لڑکے سے مل کر ہمیں بتائیں کہ ہم کیا کریں۔ ہم اس سلسلہ میں آپ کے ازحد مشکور ہونگے۔ میں سمیتھا سے کہونگی آپ کو ارشد۔ یعنی اس پاکستانی لڑکے سے ملوا دے۔''

میں حیران ہوا کہ بیٹی ہی کیا کم تھی اجنبیوں پر اعتماد کرنے کے سلسلے میں کہ ماں بھی اس سے بڑھ کر نکلی۔ بیٹی نے تو محض گھر پر بلوایا تھا ماں سے ملوانے۔ ماں تو تفتیش کا پورا کام ہی سونپ رہی ہے۔ واہ بھئی واہ......

میں نے اقرار کرلیا کہ یہ کام میں کردونگا۔ چنانچہ دوسرے دن پھر آنے کا وعدہ کر کے میں جانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔

سمینتھا اور اس کی امی گیٹ تک مجھے رخصت کرنے آئیں۔ ماں نے نرمی سے ہاتھ ملایا اور پلٹ گئی۔ جاتے ہوئے سمینتھا سے کہہ گئی کہ وہ مجھے بس اسٹاپ تک چھوڑ آئے۔

ابھی ہم چند قدم ہی چلے تھے کہ سمیتھا اچانک رک گئی۔ اپنے دائیں ہاتھ سے میرا بایاں ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے حیران ہو کے دیکھا تو بائیں ہاتھ سے میرا بازو پکڑ لیا اور خاموشی سے میری آنکھوں میں جھانکنے لگی جیسے کچھ کہنا چاہ رہی ہو۔

''کیوں کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ بہت اچھے اور ہمدرد ہیں۔ امی آپ سے بہت متاثر ہوئی ہیں۔ ان کے کئی پرانے خیالات ختم ہو گئے ہیں''۔

''تمہاری امی بڑے کھلے دل و دماغ کی مالک ہیں۔ ورنہ کوئی بھی شخص دوسرے مذہب

کی تعریف پسند نہیں کرتا۔"

"میری امی بہت اچھی ہیں۔" وہ بولی۔

"میرا خیال ہے کہ تم اپنی امی سے بھی زیادہ اچھی ہو۔ ان سے زیادہ خوبصورت ہو۔"

سمینتھا کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ "سچ۔؟" اس نے کہا اور جگمگاتی آنکھوں سے مجھے گھورنے لگی۔ اور پھر بولی۔

"میری امی بھی جوانی میں بہت خوبصورت تھیں۔ دکھوں، مصیبتوں نے ان کے حسن کو گہن لگا دیا۔ ابا کی وفات کے بعد انہوں جس طرح ملازمتیں کر کے ہم بہن بھائیوں کو پالا وہ ہم ہی جانتے ہیں۔ اپنے بہن بھائیوں اور رشتہ داروں سے جو غم انہیں ملے اور جس کرب کے عالم سے وہ گزری ہیں اور جو صدمے ان کے دل کو ہوئے۔ وہ ان ہی کا حوصلہ ہے کہ برداشت کر گئیں۔ ہم تک کبھی ان صدموں کو پہنچنے ہی نہیں دیا......!"

"میرے خدا...... کیا تمہاری امی اتنی دکھی خاتون ہیں۔؟ لیکن وہ تو اتنی ہنس مکھ ہیں کہ اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ ان کو کوئی غم ہوگا۔ دراصل انسان بنا ہی غم کے لئے ہے۔ انسان جہاں بھی ہو گا۔ انسانی مسائل اور ان سے پیدا شدہ دکھ و غم بھی اس کے ساتھ ہی ہونگے۔ پھر سوچو تو...... ان دکھوں کا سامنا کرنا ہی تو زندگی ہے۔ تمہاری امی واقعی ایک بہادر خاتون ہیں"۔

سمینتھا کی آنکھوں میں چمک سی آ گئی۔

"آپ نے میری امی کی تعریف کی۔ میں آپ کی شکر گزار ہوں۔ آپ خود کتنے اچھے ہیں۔ دیکھیں تو۔ ابھی کل ہی ہماری ملاقات ہوئی ہے وہ بھی ٹرین میں اتفاقیہ اور آج سارا دن آپ کے ساتھ گزارنے کے بعد ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے ہم برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ اوہ خدا...... ہم ایک دوسرے کے کتنے قریب آ چکے ہیں۔!"

اس کی گرفت میرے ہاتھ اور بازو پر اور سخت ہو گئی۔

"آپ ہمیں بہت اچھے لگے ہیں۔ بلکہ آپ ہیں ہی بہت اچھے......!" وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ جتنے دن آپ یہاں ہیں۔ روز ہمارے یہاں آ جایا کریں۔ میں لندن کی سیر کرا دونگی بلکہ لندن کا کونا کونا دکھا دونگی۔ آپ میری امی کے ساتھ باتیں کیا کیجئے۔ وہ بڑی اچھی لیکن دکھی انسان ہیں۔ آپ کی باتوں سے وہ بہت خوش ہوئی ہیں۔ انہیں ایک تسلی دینے

والے کی ضرورت ہے۔''

''سمینتھا تم ایک اچھی ساتھی اور گائیڈ ہو۔ بڑی اچھی کمپنی دیتی ہو۔ تمہاری رفاقت میں لطف آتا ہے۔ لیکن یاد رکھو میں دو چار دن کے لئے لندن آیا ہوں۔ پھر واپس پلٹ جاؤنگا۔ اتنی زیادہ دوستی اچھی ثابت نہیں ہوگی۔'' سمینتھا ضرورت سے زیادہ جذباتی ثابت ہوئی۔ کہنے لگی

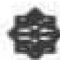
''آپ ہمارے یہاں ہی آ جائیں اور جب تک لندن میں ہیں ہمارے ساتھ ہی رہیں۔ جب آپ چلے جائیں گے تو میں اور امی شام کو تنہائی کے اوقات میں بیٹھ کر آپ کی باتیں کیا کریں گے۔ سردیوں کی یخ شاموں میں آتشدان کے سامنے بیٹھ کر میں آپ کو یاد کیا کرونگی''۔

سمینتھا کی شاعری سن کر میں ایک لمحہ کے لئے چکرا گیا کہ یا اللہ یہ کیا مصیبت آ گئی۔ اتنی جذباتی لڑکی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ میں نے مناسب سمجھا کہ رخصت ہو جاؤں۔ جب رخصت طلب کی تو وہ ساتھ ہی چل پڑی۔ بس اسٹاپ تک ساتھ آئی اور جب تک بس نہ آئی ساتھ چمٹی کھڑی رہی۔ جب بس چلنے لگی تو بولی۔

''کل۔ پکاڈلی سرکس۔ صبح نو بجے ملونگی...... خدا حافظ۔''

''خدا حافظ پگلی سمینتھا......'' میں نے بھی کہا۔ وہ کچھ اداس سی دکھائی دی اور مجھے بھی اداس کر گئی۔ بس چل پڑی تو میں نے کہا......

''پگلی سمینتھا۔ میں تم سے کم از کم پندرہ سال بڑا ہوں۔ شادی شدہ ہوں اور تین بچوں کا باپ ہوں اور یہ سب پاکستان میں میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میرے پاؤں کی زنجیر بننے کی کوشش نہ کرنا......''



# گمشدہ مسافر

بس آدھ گھنٹہ تک دوڑتی رہی۔ کہاں رکی اور کہاں نہیں رکی کچھ پتہ نہ چلا۔ اردگرد ہر طرف اجالا تھا لیکن میں گھپ اندھیرے میں ڈوبا سیمنتھا کے متعلق سوچتا رہا۔ کس قدر جذباتی ہے یہ لڑکی؟ میں نے دو باتیں ہمدردی کی کیں تو مجھے خلجان میں مبتلا کر گئی۔ ارشد نامی کسی پاکستانی نے تعریف کر دی ہوگی تو اس سے شادی کے لئے تیار ہو گئی محبت کی کس قدر بھوکی ہے۔ کس قدر بھولی اور ناتجربہ کار ہے۔ خدا معلوم انسان کے شکاریوں سے بھری دنیا میں کیسے گزارا کرے گی۔؟

پکاڈلی پہنچتے پہنچتے میں نے سیمنتھا کو خیالوں سے جھٹک دیا یہ کہہ کر کہ کل اس سے صاف صاف بات کرونگا کہ ذرا سی ہمدردی کا یہ مطلب نہیں ہوتا۔ جو وہ سمجھ رہی ہے۔ جب پکاڈلی پہنچا تو ابھی خاصا دن باقی تھا اور فضا اچھی' خوشگوار اور گرم تھی۔ پیدل گھومنے کا موسم تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ اب کہاں کی سیر کی جائے۔ ابھی کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ کسی نے دھیرے سے دائیں کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ پلٹ کر دیکھا تو ایک پاکستانی کو کھڑا پایا۔ جو چہرے پر ایک گھمبیر مسکراہٹ لئے روشن اور جگمگاتی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کون ہے۔؟

''نہیں پہچانا......؟'' ......اس نے گول گول آنکھیں چمکائیں۔ اس پر بھی جب میری طرف سے جواب نہ ملا تو اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ یہ مانوس سا قہقہہ ذہن کی عمیق ترین گہرائیوں میں سنسناتا ہوا اتر گیا اور اس نے ماضی کی دبی ہوئی پرانی یادوں کو جھنجھوڑ ڈالا اور اس میں سے چھانٹ کر ایک پرانی بھولی بسری یاد نکالی اور ایک شبیہہ کی صورت میں میرے سامنے لا کھڑی کی۔ ''ارے یہ تو صدیق ہے''۔ میرے ذہن نے مجھے یاد دلایا۔

''ارے صدیق......! یہ تم ہو......؟'' میرے منہ سے نکلا

''شکر ہے تم نے پہچانا تو......!'' صدیق اُچک کر گلے لگ گیا اور گھٹ گھٹ جھپیاں

پائیاں ...... ''میں تو سمجھا تھا کہ تم مجھے کبھی بھی پہچان نہ پاؤ گے۔ حالانکہ میں نے تمہیں پہلی نظر میں ہی پہچان لیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے مجھے میرے قہقہے سے پہچانا ہے۔''

واقعی میں نے اس کے بین الاقوامی قسم کے قہقہے سے پہچانا تھا۔ صدیق میرے کالج کا دوست تھا۔ انجینئرنگ کالج میں ہم ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ صدیق کلاس کا نکما ترین لڑکا تھا۔ ہر مضمون میں فیل ہوتا تھا۔ اگر کبھی بھولے سے کسی مضمون میں پاس ہو جاتا تو خود بھی تعجب کیا کرتا کہ یہ کیسے ہو گیا۔ ہم سب دوست اس کے پاس ہونے کا جشن منایا کرتے تھے لڑکیوں کا پیچھا کرنے' ان سے ناکام عشق کرنے اور پھر کامیابی کی ڈینگیں مارنے میں اس کا ثانی نہ تھا۔ چار سال کا کورس آٹھ سال میں مکمل کرنے کے بعد جب وہ کالج سے نکلا تو یکدم ہی غائب ہو گیا تھا۔ آج لگ بھگ پچیس سال بعد اس کی شکل دکھائی دی۔ بالوں میں معمولی سی چاندی اتر آئی تھی اس کے سوا وہ کچھ بھی نہ بدلا تھا۔

پھر ایک دوسرے کا حال پوچھنے کا مرحلہ شروع ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ حضرت پچیس سال پہلے جب مفقود الخبر ہوئے تو سیدھے لندن آ گئے تھے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ اب وہ لندن کے ہی نہیں انگلینڈ کے ایک کامیاب تاجر تھے۔ خدا کا دیا سب کچھ تھا بس فقط شادی نہیں کی تھی۔ مجھے متعجب دیکھ کر بولے۔

''لندن میں شادی کرنا حماقت ہے۔ بھئی جب بازار میں خالص دودھ بن مانگے ملتا ہو اور وہ بھی وافر مقدار میں۔ تو پھر گھر میں بھینس باندھنے کی کیا ضرورت ہے۔؟''

یہ کہہ کر ذرا سے مسکرائے اور پھر یکدم مانوس قہقہہ لگا کر بولے۔ ''آؤ آج تمہیں بھی بھینس کالونی دکھاؤں۔ یہاں کی بھینسیں گوری اور نازک اندام ہوتی ہیں۔ یہ کالونی دور نہیں نزدیک ہی ہے۔''

اب میں اتنا بھی احمق نہ تھا کہ اس کا اشارہ نہ سمجھتا۔ کہنے لگے......

''یہ سامنے والی سڑک ''سوہو'' کو جاتی ہے۔ تھوڑی دور تک معمولی سی چڑھائی ہے۔ اس کے بعد دائیں بائیں گلیاں ہی تماشا گاہ ہیں۔ لیکن یاد رکھو یہاں دروازہ کھٹکھٹانا پڑتا ہے۔ بن ٹھن کر کھڑے رہنے کا رواج نہیں۔ بڑی دلچسپ اور شاندار جگہ ہے۔ ہر قسم کا مال ملتا ہے۔ آؤ تمہیں دکھاؤں۔!''

میں نے معذرت کی ...... ''یار صدیق۔! اتنے طویل عرصہ کے بعد تو تم ملے ہو۔ چھوڑو

دفع کرو اس بازار حسن کو اور اپنی سناؤ۔ آج میرا پہلا دن ہے لندن میں۔ میں اسے بازار حسن جا کر خراب نہیں کرنا چاہتا۔ ایسا کرو۔ چلو کسی ہوٹل میں چل کے بیٹھتے ہیں اور پرانی یادیں تازہ کرتے ہیں۔ تم مجھے نہ صرف چائے پلاؤ بلکہ اپنی رام کہانی بھی سناؤ کہ تم نے اپنی زندگی کے قیمتی پچیس سال یہاں کیسے بسر کئے۔؟''

ہم دونوں ایک قریبی پاکستانی ہوٹل میں چلے گئے وہاں لگ بھگ آٹھ بجے تک بیٹھے ایک دوسرے کی کہانی سنتے رہے۔

صدیق کھاتے پیتے گھرانے کا بے فکرا نوجوان تھا۔ اسے اپنے اور اپنے خاندان کی امارت پر بڑا مان تھا۔ انجینئرنگ پاس کرنے کے بعد وہ کچھ زیادہ ہی زعم میں مبتلا ہو گیا کہ وہ کوئی اعلیٰ و برتر چیز ہے اور یہ کہ یہ گندا مندا پاکستان اس کے رہنے کے قابل نہیں ہے اور شاید یہ بھی زعم تھا کہ اگر وہ پاکستان سے چلا گیا تو پاکستان اور اس کے عوام کا کیا بنے گا؟ شاید پاکستان کے عوام ہاتھ جوڑ کے اسے رکنے پر مجبور کر دیں۔ لیکن اسے مایوسی اس وقت ہوئی جب سوائے اس کے گھر والوں کے کسی نے اس کی پرواہ نہ کی۔ اور تعجب اس کے بعد ہوا کہ اس کے بغیر پاکستان چل کس طرح رہا ہے۔؟

صدیق کے والدین اسے اپنے سے دور کرنے پر قطعی طور پر تیار نہ تھے۔ اس لئے صدیق والدہ کے زیورات اور والد کی کچھ رقم چرا کے پاکستان سے فرار ہو کے لندن آ گیا تھا۔ اس طرح اس نے گویا کشتیاں جلا کے اپنی واپسی کا راستہ ہی بند کر دیا تھا۔ کیونکہ اب وہ کس منہ سے واپس جا سکتا تھا۔ لندن میں اس نے بہت ہی کٹھن۔ مصروف اور سخت زندگی گزاری تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ اس کی بقا کا مسئلہ تھا۔ پھر جب روپیہ کمانا ہی مقصد ٹھہرا تو پھر شرم کیسی۔ اس نے زندہ رہنے کے لئے ہر طرح کا کام کیا۔ بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا۔ ہوٹلوں میں برتن بھی مانجھے۔ ٹوائلٹ بھی صاف کئے۔ ٹرینوں میں گھوم پھر کر چیزیں بھی بیچیں۔ سٹوروں میں سیلز مین کا کام بھی کیا۔ حتیٰ کہ بس کنڈیکٹری بھی کی۔ اس طرح جو بھی کمایا اس میں سے کچھ نہ کچھ پس انداز بھی کرتا رہا۔ پھر جب کچھ رقم جمع ہو گئی تو سپلائی کا کام شروع کیا۔ اپنے کام میں خدا نے اسے برکت دی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ خاصا بڑا کاروباری بن گیا۔

''تمہارے ماں باپ اور دیگر افراد خاندان کا کیا بنا۔؟ کچھ اس کی بھی خبر ہے۔؟'' میں نے پوچھا۔ صدیق کہاں تو چہک رہا تھا۔ کہاں ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

''ماں تو سنا ہے میرے بھاگ جانے کے چند دنوں بعد ہی اس جہاں سے رخصت ہو گئی۔ میرا خیال تھا کہ زیور چلے جانے کا غم ہی اسے لے گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ان کا اصل زیور تو میں تھا۔ بہر حال اچھا ہی ہوا اس نے زیادہ تکلیف نہیں اٹھائی۔ بڑے میاں کچھ زیادہ ہی ڈھیٹ نکلے۔ خاصے دنوں زندہ رہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ میرا انتظار کرتے رہے۔ کہا کرتے تھے کہ میرا بیٹا کھیلتے کھیلتے ذرا دور نکل گیا ہے۔ راستہ بھول گیا ہے۔ کبھی نہ کبھی واپس آ ہی جائے گا۔ ایک دوست نے تو مجھے بتایا کہ بڑے میاں رات سوتے وقت دروازے کو کنڈی نہیں لگاتے تھے اور لالٹین جلا کر روشن رکھتے تھے کہ میرا بیٹا واپس آئے تو اسے دروازہ بند نہ ملے اور گھر میں داخل ہوتے ہوئے اسے ٹھوکر نہ لگے یا تکلیف نہ ہو۔ پاگل ہی تو تھے وہ۔ ایک روز رات سوتے میں ہی کھسک لئے۔ صبح لوگوں نے دیکھا کہ منہ میں مکھیاں آ جا رہی ہیں لیکن کھلی آنکھیں بدستور دروازے کی طرف ٹکٹکی باندھے تھیں گویا آخر وقت تک میرا انتظار رہا۔ محلّے کے لوگوں نے انہیں دفنا دیا......''

''محلے کے لوگوں نے کیوں......؟ ان کے اپنے کہاں تھے۔؟''

''میری دیکھا دیکھی میرا دوسرا بھائی بھی گھر سے بھاگ کے امریکہ چلا گیا۔ پھر اس کی بھی خیر خبر کبھی نہیں آئی۔ ایک بہن تھی اس کی شادی میرے سامنے ہی ہو گئی تھی اور وہ اپنے گھر بار کی ہو گئی تھی۔ اسے اپنے بچوں اور سسرال والوں سے کبھی فرصت نہ ملی کہ وہ کبھی ماں باپ کی خبر گیری کر سکتی!''

''گویا تمہارے والد صاحب کی موت تنہائی کے عالم میں ہوئی۔؟''

صدیق کی آواز کچھ گلوگیری ہو گئی۔

''ہاں جب بڑے میاں فوت ہوئے تو کوئی بھی تو ان کے پاس نہ تھا۔ لیکن نہیں نہیں...... تنہائی ان کی سب سے بڑی ساتھی تھی جس نے کبھی بھی ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ کچھ پرانی سہانی یادیں ان کے ساتھ رہیں جن کے سہارے انہوں نے زندگی کے آخری دس سال تن تنہا گزارے۔ سنتے ہیں کہ ان کو آخری وقت......'' یہاں تک پہنچتے پہنچتے صدیق کی جرأت۔ بہادری اور حوصلہ سب ہی جواب دے گئے اور وہ یکدم بے اختیار ہو کر رو پڑا۔

''میں نے اپنے والدین کو دُکھ دیئے۔ میں اپنے ماں باپ کا قاتل ہوں۔ اگر میں گھر سے فرار نہ ہوتا تو میرے چھوٹے بھائی کو گھر سے فرار ہونے کی ترغیب نہ ملتی۔ پھر شاید میرے والدین اس حالت کو نہ پہنچتے۔ میں اس تمام تر سانحہ کا ذمہ دار ہوں۔ لیکن اس سب کے بدلے مجھے

کیا ملا؟ دردر کے دھکے' ذلت' رسوائی' کبھی کبھار کے فاقے' اپنے پیاروں سے ہمیشہ کی جدائی۔ غریب الوطنی بلکہ خود اختیاری جلاوطنی......!''

''یار تم یقین نہیں کرو گے کہ میں نے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لئے ہمیشہ خود کو دھوکا دینے کی کوشش کی تا کہ اپنی حرکت کا جواز پیدا کر سکوں۔ اسی جذبے کے تحت میں والدین کے لئے اہانت آمیز الفاظ استعمال کرتا ہوں انہیں بڑے میاں۔ بڑی بی اور نہ جانے کیا کیا کہتا ہوں تا کہ یہ کہہ سکوں کہ وہ کمتر لوگ تھے جن سے میرا گزارہ نہیں ہو سکتا تھا میں ہر طرح گھر والوں کی تذلیل کرتا ہوں۔ اپنے وطن کی ہر چیز کو برا کہتا ہوں انگلستان کی ہر چیز کو عمدہ اور برتر کہتا ہوں صرف اس لئے کہ کہہ سکوں کہ جو کچھ میں نے کیا اچھا کیا۔ کم تر لوگوں اور کم تر سوسائٹی سے برتر لوگوں میں آیا ہوں۔ لیکن میں اپنے ضمیر کے اس کانٹے کو کیا کروں جو مجھے ہر وقت ملامت کرتا اور بے چین رکھتا ہے۔؟''

''یار تم یقین کرو۔ ان پچیس برسوں میں کوئی بھی دن ایسا نہیں گزرا ہے جب میں اپنے وطن' اپنے چاہنے والوں' عزیزوں دوستوں کو یاد کر کے نہ رویا ہوں۔ رات کی تنہائیوں میں میں نے کرب کے عالم میں اپنی ماں کو اپنے باپ کو نہ صرف یاد کیا ہے بلکہ آوازیں بھی دی ہیں۔ انہیں پکارا ہے۔ ان سے معافیاں مانگی ہیں۔ میں نے اکثر خواب دیکھے ہیں کہ میں پھر سے چھوٹا سا بچہ بن گیا ہوں اور اپنی ماں کی گود میں دنیا بھر کی فکروں سے آزاد بیٹھا ہوں۔ اپنے بہن بھائیوں کے درمیان کھیل رہا ہوں۔ اپنے دوستوں کے درمیان ہنس بول رہا ہوں۔ تمہیں بھی کئی دفعہ خواب میں دیکھا ہے۔ لیکن دن کی روشنی مجھے ہمیشہ اس منحوس لندن میں واپس لے آئی جس نے میرا سب کچھ مجھ سے چھڑا دیا۔ آج میرے پاس دولت ہے۔ ایک اچھا خاصا مکان ہے جو لندن میں بہت بڑی دولت سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ سوچ کر مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو جاتی ہے کہ یہ سب کچھ میں نے کس قیمت پر حاصل کیا جو آج اس دولت کے سوا میرے پاس کچھ نہیں۔ کوئی ایسا نہیں جو مجھ سے دو باتیں ہنس کر کرے۔

میرے یار...... میری ایک بات یاد رکھو۔ لندن ایک بہت بڑی دلدل ہے۔ جو ایک دفعہ اس میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس میں دھنستا ہی چلا جاتا ہے۔ یہ لندن کسی کو واپس جانے کے قابل نہیں چھوڑتا۔ یہاں کی گلیاں۔ بازار۔ بے باک حسینائیں روپیہ پیسہ یہ ایسے جال ہیں جو بڑی سختی سے سب کو پھانس لیتے ہیں اور ان سے ان کی اگلی نسلیں تک چھین لیتے ہیں۔ یہاں سے کوئی کچھ کما

کے لے نہیں گیا بلکہ کچھ دے کے ہی گیا ہے۔ یہاں کچھ نہیں ملتا کسی کو۔ بلکہ آنے والا اپنی معصومیت' اپنی شناخت' اپنا وطن' اپنے عزیز دوست' سب ہی کچھ کھو بیٹھتا ہے۔اس سے دور ہی رہنا۔ جتنی جلد ہو سکے اس سے دور چلے جانا۔ خدا کے لئے دور چلے جاؤ ورنہ یہ تم سے بھی وہی سلوک کرے گا جو اس نے مجھ سے کیا ہے...... میں نے اپنا وطن چھوڑا۔ اپنا معاشرہ چھوڑا۔ اپنے والدین بہن بھائی چھوڑے۔ عزیز اقارب چھوڑے لیکن پچیس سال گزارنے کے بعد بھی میں یہاں اجنبی ہی ہوں۔ دوسرے درجہ کا شہری۔ ایک گندہ۔ کالا پاکستانی۔!''

صدیق بہت جذباتی ہو رہا تھا۔ اپنے اوپر قابو پانے کے لئے تھوڑی دیر کے لئے رک گیا۔ میں حیرانی کے عالم میں اس کا اعتراف سن رہا تھا...... میں نے اسے نارمل کرنے کے لئے کہا۔

''صدیق اگر تم یہاں شادی کر لیتے تو تمہیں کم از کم بیوی کی محبت اور بچوں کا پیار تو نصیب ہو جاتا اور تمہاری زندگی اس طرح تنہا نہ گزرتی۔ تمہارا اپنا گھر بار ہوتا۔ آخر کچھ تو تمہارا اپنا ہوتا۔!''

''ایک غلطی کے بعد دوسری نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لندن کے ماحول میں پرورش پائے بچے کبھی بھی ماں باپ کے وفادار نہیں ہو سکتے۔ میں نے یہاں کئی گھرانے دیکھے ہیں۔ یہاں بچے سولہ سال کے ہوئے نہیں اور آزاد پرندوں کے بچوں کی طرح پھر سے اڑے نہیں۔ رہی بیویاں۔ وہ برابر کے حقوق مانگتی ہیں۔ اور پاکستانی ہونے کے ناطے وہ اپنے بس میں نہیں۔ تو اس صورت میں بیوی بچوں کی صورت میں دوبارہ دھوکا کھاتا۔ پھر دکھ اٹھاتا جدائی کے؟ میں نے تو ان پاکستانیوں کو دیکھ کر جنہوں نے یہاں گوری لڑکیوں سے شادی کی ہے۔ ڈھیروں عبرت پکڑی ہے اور میری ہمت ہی نہیں ہوئی کہ شادی کروں اور بچے پیدا کر کے دکھ اٹھاؤں۔ پھر کچھ اس امر کا قائل بھی ہوں کہ میں نے جو کچھ دوسروں کے ساتھ کیا ہے وہ میرے ساتھ بھی لازماً ہوگا۔ اس لئے میں نہیں چاہتا تھا کہ جس طرح میں نے والدین کو بے یار و مددگار چھوڑا۔ میرے بچے بھی مجھے چھوڑ جائیں......!''

یہ صدیق نہیں۔ اس کے دل کا چور بول رہا تھا۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا کہ اوپر سے خوش نظر آنے والا اندر سے کتنا دکھی انسان ہے۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ اچانک صدیق چونک پڑا اور کہنے لگا۔

''باتوں باتوں میں وقت کا پتہ ہی نہ چلا۔ شام کے آٹھ بج رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں اندھیرا ہو جائے گا۔ اس کے بعد لندن خطرناک ہو جاتا ہے اور غنڈے کھلے عام پھرنے لگتے ہیں وہ خاص طور پر تم جیسے پاکستانیوں کو تلاش کرتے ہیں۔ بہتر ہے تم جلد از جلد یہاں سے رخصت ہو جاؤ۔ تم ٹھہرے کہاں ہو؟...... کیا کہا ایسٹ ہائیم؟ تمہیں ایسٹ ہائیم کے لئے وکٹوریہ اسٹیشن سے پچیس نمبر بس ملے گی جو گھنٹہ بھر میں وہاں پہنچائے گی۔ آؤ میں تمہیں وکٹوریہ اسٹیشن پہنچا دوں''۔

ہم دونوں ہوٹل سے باہر نکل آئے اور وکٹوریہ اسٹیشن کی طرف چل پڑے۔ راستہ میں صدیق کو نہ جانے کیا سوجھا۔ کہنے لگا:۔

''تم میرے کالج کے دوست ہو۔ اپنے عزیزوں رشتہ داروں کی طرح تمہاری یادیں میرا قیمتی سرمایہ ہیں۔ ان ہی کے سہارے میں زندگی گزار رہا ہوں۔ ان یادوں کو میں اتنا سنبھال کے رکھتا ہوں اور ذہن میں اتنا گہرا دفن کر کے حفاظت سے رکھتا ہوں کہ دوبارہ میرے ذہن میں آ کے ہیجان نہ برپا کر دیں۔ کیونکہ جب بھی یہ یادیں آ جاتی ہیں تو مجھے انتہائی کرب کے عالم میں لے جاتی ہیں اور پھر مایوسی اور بے بسی کے گہرے سمندر میں غوطے دیتی ہیں۔ جسے میں برداشت نہیں کر پاتا۔ میرے لئے یہ خیال ہی سوہان روح ہوتا ہے کہ جس ہستی کو میں یاد کر رہا ہوں اسے میں ہمیشہ کے لئے کھو چکا ہوں اور اب کبھی دوبارہ دیکھ نہ پاؤں گا۔ اس عالم میں بعض اوقات مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میرا دماغ پھٹ جائے گا اور میں کسمپرسی کے عالم میں دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا کیونکہ یہاں تو کوئی مجھے یاد کر کے رونے والا بھی نہیں اور اپنے وطن میں مجھے پہلے ہی سب رو چکے ہیں۔ اب جب بھی تم مجھے ملو گے مجھے پھر اسی حالت سے دوچار کرو گے جسے میں بار بار برداشت نہ کر پاؤں گا۔ اس لئے بہتر ہے کہ تم مجھے دوبارہ ملنے کی کوشش نہ کرنا۔ کبھی یاد آ جاؤں تو بس دعا کرنا میرے لئے کہ خدا مجھے سکون دے......!''

''بہتر ہے۔!''۔ میں نے جواب دیا۔ ''میں تمہارا دوست ہوں دشمن نہیں...... اور ہاں آج تم نے مجھ پر احسان کیا ہے۔ میں سوہو دیکھنے چلا جاتا۔ تا کہ نہ صرف اپنے علم میں اضافہ کر سکوں بلکہ لوگوں کو بتا بھی سکوں کہ میں نے لندن کا بازار حسن بھی دیکھا ہے۔ لیکن تم مل گئے اور تمہاری وجہ سے میں سوہو نہ جا سکا اور اس طرح گناہ کی دنیا دیکھنے سے بچ گیا۔ یہ تمہارا احسان ہے مجھ پر...... ویسے تم مطمئن رہو۔ میں تمہارے کرب اور روح کے زخم کو سمجھتا ہوں میں تمہیں دوبارہ اس کرب سے دوچار نہیں کرونگا...... میں دوبارہ ملنے نہیں آؤنگا۔ ہاں دعا کرونگا کہ خدا تمہیں اس

عذاب سے نجات دے......"

وکٹوریہ اسٹیشن پر بس تیار کھڑی تھی۔صدیق مجھ سے گلے ملا۔منہ موڑ کر ہاتھ ملایا اور خدا حافظ کہے بغیر تیز تیز چلتا اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

صدیق کی پاؤصدی پر پھیلی عبرت آموز کہانی ......اس کے خیالات اور پھر جس طرح وہ رخصت ہوا تھا ان سب نے مجھے نہ صرف اداس بلکہ ذہنی طور پر کرب و پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ عام پاکستانی جو پونڈ کمانے' اور مستقبل بنانے۔اپنا وطن' اپنا کلچر' اپنے عزیز و اقارب دوست۔اپنی مٹی اور اس کی سوندھی خوشبو چھوڑ کر اس پرائے دیس میں آتا ہے تو کس کس قسم کے عذاب جھیلتا ہے۔جسمانی اور ذہنی دونوں۔اور اس کے بدلے اس کے ہاتھ کچھ بھی تو نہیں آتا۔

بس کے اندر دروازے کے قریب دو حبشی کھڑے باتیں کر رہے تھے۔لوگ ایک ایک دو دو کر کے بس میں سوار ہو رہے تھے۔میں بھی اگلی سیٹ پر جا کے بیٹھ گیا تا کہ دور کے سفر میں رش کی زحمت سے بچ سکوں۔بس میں تنہائی جو ملی تو صدیق کی حالت زار نے ایک بار پھر مجھے آ گھیرا۔ سوچا کہ چلو کسی سے بات ہی کروں تا کہ ذہنی دباؤ کم ہو سکے۔نہ جانے مجھے ایک حبشی کے چہرے پر کیا آثار نظر آئے۔میں اٹھ کے اس کے پاس جا پہنچا۔

"آپ کس ملک سے آئے ہیں۔؟" میں پوچھا۔

"نائیجیریا سے......" مختصر سا جواب ملا۔

"آپ وہاں کیا کرتے تھے۔؟"

کالے نے مجھے شک سے گھورا ......"میں وہاں ایک بہت بڑی فرم میں چیف اکاؤنٹنٹ تھا۔"

"یہاں پر آپ کیا کرتے ہیں۔؟"

"میں اس بس کا کنڈیکٹر ہوں۔!" یہ کہتے ہوئے اس نے سامنے لٹکی ہوئی ٹکٹ کاٹنے والی مشین کا پٹہ اٹھا کے گلے میں پہن لیا۔اور جیسے بات چیت ختم کرتے ہوئے بولا۔"آپ کہاں جائینگے۔؟"

"ایسٹ ہائیم"۔میں نے جواب دیا۔

"جی۔یہ بس ایسٹ ہائیم جائے گی لیکن چلنے میں ابھی پورے دو منٹ باقی ہیں۔"

''لیکن۔معاف کیجئے گا۔'' میں کچھ گڑبڑا گیا...... ''اپنے وطن میں آپ چیف اکاؤنٹنٹ تھے اور یہاں بس کا کنڈ یکٹر بننے پر خوش ہیں۔؟۔یہ کیوں......؟''

کالے نے مجھے گھورا۔کچھ سوچا پھر بولا۔''میرے ملک میں آمریت ہے۔ ایسے ملک میں رہنے سے بہتر ہے کہ اسے چھوڑ ہی دیا جائے چنانچہ میں برطانیہ چلا آیا۔یہاں کنڈ یکٹری کے سوا کوئی کام نہیں ملا۔سو کر رہا ہوں۔''

''کبھی وطن یاد نہیں آتا......اپنے عزیز اقارب......!''میں نے کریدا۔

کالے نے بات کاٹ دی...... ''کیوں۔کیا میں انسان نہیں۔؟ کیا میرے سینے میں دل نہیں دھڑکتا۔کیا میرے جذبات نہیں۔؟ مجھے بہت یاد آتی ہے میرے وطن کی مٹی۔لیکن میں نے بھی قسم کھائی ہے کہ ایک جمہوری ملک میں ہی جاؤنگا شخصی غلامی میں نہیں۔'' پھر یکایک اس کی آواز میں تبدیلی آ گئی۔''آپ بھی مجھے غیر ملکی لگتے ہیں۔یہ کم بخت لندن ہے ہی غیر ملکیوں کا ملک......یا یوں کہیئے مزدوروں کا اڈہ یا پناہ گاہ۔ہر تارک وطن کچھ نہ کچھ بہانہ بنا کر آتا ہے یہاں۔ لیکن میں نے یہاں کسی کو مطمئن نہیں دیکھا ہر ایک کی اپنی کہانی ہے اپنا فسانہ ہے۔ہر ایک قابل ہمدردی ہے۔اگر کوئی کہتا ہے کہ وہ یہاں مطمئن ہے تو جھوٹ بولتا ہے۔اس کے دل و دماغ کو کریدو......غم و دکھ سیلاب کی طرح بہہ نکلے گا۔آپ ازراہ کرم ٹکٹ لیجئے اور اپنی سیٹ پر بیٹھئے۔بس روانہ ہونے والی ہے۔!''

''میرے پاس بس کا پاس ہے۔!'' میں نے اسے پاس دکھایا۔وہ مطمئن ہو کر فوراً ہی تیزی سے بس کے اندر گھس گیا اور منہ پھیر کر ٹکٹ بانٹنے لگا۔

بس کے اندر تھوڑی بہت روشنی تھی باہر مکمل اندھیرا۔اس اندھیرے اجالے میں بس روانہ ہوئی تو مجھے صدیق کی کہانی نے پھر آ گھیرا۔نہ جانے غریب کتنا دکھوں سے بھرا ہوا تھا کہ پرانی یادوں کے تصور سے ہی گھبرا جاتا تھا یہاں تک کہ اپنے کالج کے بے تکلف دوست سے اس دیارِ غیر میں اس لئے ملنے سے انکار کر دیا کہ یادیں پھر سے تازہ ہو کر اس کے رگ و پے میں زہر نہ بھر دیں۔

''بے چارہ۔!''میرا دل اس کیلئے ہمدردی سے بھر آیا۔''لیکن یہ کالا حبشی نائیجیرین۔اس کم بخت نے تو خود اختیاری جلاوطنی قبول کی ہے اس کو کیا کہا جائے۔صدیق اور یہ کالا دونوں ہی جلاوطن ہیں۔ایک حالات سے مجبور ہو کر واپسی کا راستہ بند کر کے آیا اور دوسرا آمریت سے

بغاوت کر کے لیکن حشر دونوں کا ایک......!

ان خیالات میں مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ بس ایسٹ ہائیم پہنچ چکی ہے جہاں مجھے اترنا ہے۔ بس قریب قریب خالی ہو چکی تھی۔ کنڈیکٹر نے مجھے جھنجھوڑا اور میں فوراً نیچے اتر آیا۔ بس اسٹاپ کے سامنے ہی اقبال صاحب کا گھر تھا جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا۔

رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ اقبال صاحب ابھی تک کاؤنٹر پر کھڑے ڈیوٹی دے رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی گھر میں بلند آواز سے پکارے۔ ''لو بھئی لندن کے سیاح آ گئے واپس۔ آؤ ملو سب ان سے۔!''

اتنی دیر میں میں اندر پہنچ چکا تھا۔ اقبال صاحب کے دونوں بیٹے دوڑے آئے اور مجھ سے لپٹ گئے میں ذہنی اور جسمانی دونوں لحاظ سے بری طرح تھکا ہوا تھا اسلئے یہ استقبال کچھ بھایا نہیں۔

چھوٹا بیٹا حیدر بولا۔ ''انکل انکل آپ اچھے وقت پر آ گئے۔ آپ کے لئے ایک تحفہ آیا رکھا ہے۔''

''تحفہ۔؟ میرے لئے......؟'' میں خاصا حیران ہوا...... ''بھئی میں کل ہی اس شہر میں وارد ہوا ہوں۔ میرا کون واقف ہے یہاں اور کون اتنا مہربان ہے کہ مجھے تحفہ بھیجے......ارے مجھے تو اپنے دیس میں بھی کوئی تحفہ نہیں دیتا۔ یہاں کون دے گا۔ بھئی بات دل کو لگی نہیں......''

اقبال صاحب بولے...... ''بھئی پہیلی نہ بجھواؤ۔ بتا ہی دو۔ بھئی بات یہ ہے کہ ہمارے گھر سے تین چار گھر پرے ایک پاکستانی شمس الحسن صاحب کی فیملی رہتی ہے۔ آپ کو صبح جاتے دیکھا تو میرے پاس آئے کہ یہ کون صاحب ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔ جب میں نے بتایا کہ میرے عزیز ہیں اور پاکستان سے آئے ہیں تو انہوں نے فوراً ہی رات کے کھانے کی دعوت دے ڈالی اور کہا کہ آپ اور آپ کا مہمان شام آٹھ بجے ہمارے یہاں آ جائیں۔ میں نے کہا بھی کہ میرے مہمان نہ معلوم کب آئیں کیونکہ کچھ کہہ کے نہیں گئے۔ اگر آٹھ بجے تک آ گئے تو ہم آ جائیں گے۔ شمس الحسن صاحب نے نو بجے تک آپ کا انتظار کیا پھر ایک بھنا ہوا مرغ۔ پلاؤ کی قاب۔ کچھ نان اور سلاد کی ایک پلیٹ چھوڑ گئے کہ یہ آپ کے مہمان کا حصہ ہے اب آپ کی وجہ سے ہم بھی مرغ کھائیں گے۔''

اب حیرانگی کی میری باری تھی...... ''بھئی میں تو کسی شمس الحسن صاحب کو نہیں جانتا۔ پھر یہ

عنائت کیسی۔؟''

اقبال صاحب زور سے ہنسے۔

''ارے بھئی یہاں پاکستانی اپنے ہم وطنوں کے اتنے ترسے ہوئے ہوتے ہیں کہ خوامخواہ ہی ایک دوسرے سے ملنے اور بات کرنے کے مواقع ڈھونڈتے ہیں۔ایک گھر میں کوئی مہمان آتا ہے تو سب ہی اسے اپنا مہمان تصور کرتے ہیں۔یہاں لندن میں پھر بھی خیر ہے۔مگر برطانیہ کے دوسرے شہروں میں جائیں تو وہاں پاکستانی اور ہندوستانی۔ چاہے قطعی اجنبی ہی کیوں نہ ہوں۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے ہیں۔ ہاتھ ہلاتے ہیں۔اور قریب ہو تو خوامخواہ بات چیت کرنے لگتے ہیں۔ارے بھئی وطن سے دوری بھی تو ایک رشتہ ہے جس میں سب بندھے ہوئے ہیں۔جو کچھ شمس الحسن صاحب نے کیا وہ کوئی انوکھی بات نہیں۔سب ہندوستانی پاکستانی اکثر ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔''؟

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری ساری تھکن دور ہوگئی۔اپنائیت کا لطف آ گیا۔

ہم سب نے مل کر مرغ اور پلاؤ کھایا۔اس میں غضب کا مزہ تھا کیونکہ اس میں خلوص گھلا ہوا تھا۔

رات سونے سے پہلے میں سوچتا رہا کہ اس ایک دن میں کتنے تجربے ہوئے اور میں تجربے کے لحاظ سے کتنا بوڑھا ہو گیا ہوں۔سیمنتھا۔ بھولی بھالی سیمنتھا۔ پکاڈلی کے تماشے۔ دریائے ٹیمز میں جہاز رانی۔سیمنتھا کی امی سے ملاقات۔پھر صدیق سے ملاقات۔ یکہ وتنہا انسان بظاہر خوش وخرم لیکن اندر سے دکھ وکرب سے بھرا حسرت زدہ اور حرماں نصیب۔ اپنی خوش گوار یادوں سے بھی خوفزدہ۔عجیب وغریب کردار۔اپنے وطن سے بچھڑا نائیجیرین اور خوامخواہ کی محبت کرنے والا شمس الحسن۔اس کی عنائت مرغ پلاؤ' مزے دار سلاد' چٹ پٹالذیذ کھانا......

مجھے گہری نیند آ گئی۔



# دوسرا دن

لندن میں میرا دوسرا دن بھی خاصا ہنگامہ خیز رہا۔

رات کی پرسکون نیند نے گذشتہ دن کے سارے جذبات دھوڈالے تھے اس لئے طبیعت بحال ہو چکی تھی۔ ذہنی طور پر میں لندن کی سیر کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ ناشتہ سے فارغ ہو کر پروگرام بنایا۔ کل کے بچے ہوئے سینڈوچ کوٹ کی جیب سے نکالے اور کوڑے دان میں پھینک دیئے۔ نئے تیار کرائے۔ کوٹ کی بائیں جیب میں ڈالے۔ کیمرہ دائیں جیب میں رکھا اور لندن کی سیر کے لئے تیار ہو گیا۔

اقبال صاحب نے پاس پہلے ہی تیار کر رکھا تھا۔ کچھ لذیذ قسم کی ہدایات بھی ہمراہ کرنا چاہتے تھے کہ میں نے ان سے پہلے ہی اقبال جرم کر لیا کہ جناب والا کل کی آوارہ گردی کی وجہ سے میں لندن کے گلی کوچوں سے کافی حد تک واقف ہو چکا ہوں اب مزید کی ضرورت نہیں ...... یہ کہہ کر پاس جیب میں ڈالا اور دکان سے باہر نکل آیا...... بائیں طرف دیکھا تو دور سے پچیس نمبر بس آ رہی تھی جسے دیکھ کر میں نے دوڑ لگا دی اور بس سے پہلے ہی سڑک عبور کر کے بس اسٹاپ جا پہنچا۔

پکاڈلی سرکس جب پہنچا تو آدھ گھنٹہ لیٹ تھا۔ وہاں حسب معمول میلہ لگا ہوا تھا۔ فوارے کے نیچے حوض کے گرد حسب معمول خوش و خرم محبت کرنے والے جوڑوں کا اژدھام تھا۔ ان کے سامنے رکھی بینچوں پر بڑے بوڑھے اور بوڑھیاں بیٹھے دھوپ بھی سینک رہے تھے اور ''بچوں'' کی شرارتیں، دیکھ دیکھ کر لطف بھی اٹھا رہے تھے۔ جوانوں اور بوڑھوں کے درمیان جو خالی جگہ تھی اس پر بچے کھیل رہے تھے۔ سیاحوں کا بھی ہجوم تھا۔ دراصل اردگرد کے چھ بازاروں میں لوگوں کا بے پناہ رش تھا۔ ان میں سے بھی چند لوگ ستانے یا دھوپ سینکنے یہاں آ بیٹھتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد کچھ لوگ اٹھ کر اردگرد کے بازاروں میں سما جاتے۔ پھر کچھ لوگ ان کی جگہ لینے بازاروں سے آ جاتے۔ ایک عجیب و غریب خاموش دو طرفہ ٹریفک جاری تھا۔

میں سمینتھا کی تلاش میں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ضرور آئے گی کیونکہ اس نے خود ہی مجھ سے آنے کے لئے کہا تھا۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد وہ خود ہی مجھے نظر آ گئی۔ میری طرف اس کی پشت تھی۔ وہ کھڑی ہوئی تھی اور بینچ پر بیٹھے ایک لڑکے سے باتیں کر رہی تھی۔ قریب پہنچا تو محسوس ہوا کہ دونوں کے درمیان کچھ زبردست قسم کی بحث چل رہی تھی۔ سمینتھا بڑے زوروں سے کوئی بات منوانا چاہتی تھی اور لڑکا بے نیازی سے جواب دے رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر دونوں ہی خاموش ہو گئے۔ سمینتھا البتہ کھل اٹھی۔ اس نے لڑکے سے میرا تعارف پہلے کرایا۔ (یہ زیادہ قربت کی نشانی ہے۔ جو جتنا زیادہ قریب ہوتا ہے اس کا تعارف پہلے کرایا جاتا ہے) پھر لڑکے کا......

''ان سے ملئے۔ یہ ہیں ارشد...... میرے بوائے فرینڈ۔''

ارشد نے کچھ کینہ توز نظروں سے مجھے دیکھا۔ ہاتھ بڑھایا اور بولا۔

''ارشد بٹ فرام پاکستان......''

''پاکستان میں کس جگہ......؟'' میں نے اردو میں پوچھا۔

''لاہور...... بھاٹی گیٹ۔ لاہور''۔ ارشد نے بڑے تکلف سے جواب دیا۔ ویسے مجھے ارشد کے دیکھنے اور ملنے کا انداز پسند نہ آیا۔

ارشد چوبیس پچیس سالہ اونچا لمبا۔ گندمی رنگ کا خوبصورت جوان تھا۔ چہرے پر بھولپن کی جگہ مکاری کی جھلک تھی۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ خاصا تیز طرار ہے۔ اس کا انداز چغلی کھا رہا تھا کہ میں اسے پسند نہیں آیا۔ غالباً وہ مجھے اپنا رقیب سمجھ رہا تھا۔

تعارف کے بعد سمینتھا نے بتایا کہ حسین علی صاحب کی بیگم صبح کے وقت کچھ مصروف ہو گئی تھیں اور انہوں نے سمینتھا کو کہلا بھیجا تھا کہ وہ مجھے دس کی بجائے ساڑھے بارہ بجے کے بعد لائے اور ان دو گھنٹوں میں مجھے لندن کی سیر کرا لائے سمینتھا کو خود گھر میں ضروری کام تھا چنانچہ اس نے حل یہ سوچا کہ وہ مجھے ارشد کے حوالے کر دے جو مجھے لندن کی سیر کرا کے دوبارہ پکاڈلی سرکس پر ساڑھے بارہ بجے کے لگ بھگ چھوڑ جائے۔ اتنی دیر میں سمینتھا کام سے فارغ ہو کر آ جائے گی اور مجھے لے جائے گی۔

ارشد اس پروگرام سے متفق نہ تھا وہ سمینتھا کو ساتھ لے جانے پر بضد تھا اور اس کے انکار پر خاصا برافروختہ ہو رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ اگر ایک خوبصورت لڑکی کی بجائے ایک مرد کا ساتھ ملے ہو تو کون بدذوق خوش ہو گا۔

بہر حال پروگرام طے پا ہی گیا کیونکہ سمینتھا نہ مانی اور ہمیں چھوڑ کے اپنے گھر روانہ ہو گئی اور ارشد مجھے لے کر وکٹوریہ اسٹیشن چل دیا۔ جوں ہی سمینتھا نظروں سے اوجھل ہوئی میں نے مناسب سمجھا کہ معاملہ صاف کر دوں۔

''دیکھو ارشد...... میں حکومت پاکستان کا ایک اعلیٰ افسر ہوں اور وہاں بہت خوش ہوں۔ کیونکہ جو کچھ مجھے پاکستان نے دیا ہے اس کا عشر عشیر بھی برطانیہ نہیں دے سکتا لہٰذا میرے لئے برطانیہ میں کوئی چارم نہیں۔ میں تو بس یہاں چند یوم کے لئے آیا ہوں تین ہفتے بعد مجھے پاکستان قطعی طور پر لوٹ جانا ہے جہاں میرے دفتر میں میری لازمی حاضری ہے۔ پھر میں شادی شدہ ہوں۔ میرے تین عدد بچے ہیں ایک خوبصورت وفاشعار بیوی ہے۔ یہ میرا خاندان ہے جو میری عزیز ترین دنیا ہے۔ جس سے میں جدا ہونے کو قطعی تیار نہیں۔ یہ سب میرا انتظار کر رہے ہیں۔ لہٰذا سمینتھا تمہیں ہی مبارک رہے۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں......!''

میری اس وضاحت سے اس کے شکوک دور ہو گئے اور پھر تو وہ پوری طرح کھل گیا۔

ارشد لندن ٹرانسپورٹ میں بطور کنڈیکٹر ملازم تھا۔ لاہور کے بھاٹی گیٹ کا رہنے والا تھا۔ عام پاکستانی نوجوان کی طرح تین سال پہلے سیاحتی ویزے پر پاکستان سے برطانیہ آیا تھا اور پھر لندن میں ہی ''غائب'' ہو گیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد کچھ چکر چلا کے ورک پرمٹ حاصل کر لیا تھا۔ اب اس چکر میں تھا کہ اسے برٹش نیشنلٹی مل جائے جس کی ایک ہی صورت تھی کہ کسی برطانوی لڑکی سے شادی کر لے۔ چنانچہ اس نے بڑی تگ و دو کے بعد سمینتھا کو پھانس لیا تھا۔ شادی کا لالچ دیا تھا لیکن اس میں مخلص قطعی نہ تھا۔ اس نے بڑی بے تکلفی سے بتایا......

''پاجی...... یہ انگریز لڑکیاں ویسے تو بہت تیز طرار ہوتی ہیں لیکن محبت و شادی کے معاملہ میں حد درجہ جذباتی۔ بس یہیں پر وہ مار کھا جاتی ہیں۔ کسی انگریز لڑکی سے کہہ کر دیکھ لیجئے کہ وہ خوبصورت ہے تو وہ کھل اٹھے گی اور آپ کو پسند کرنے لگے گی۔ اگر شادی کی آفر کر دیں تو ان کی ساری تیزی طراری دھری کی دھری رہ جائے گی۔ پھر تو وہ موم کی گڑیا بن جائے گی جدھر چاہے موڑ لو جو جی چاہے کر لو...... دراصل بات یہ ہے کہ ہر انگریز لڑکی محبت کی بھوکی ہوتی ہے۔ اسی لئے ہر لڑکی نے کوئی نہ کوئی بوائے فرینڈ پال رکھا ہوتا ہے۔ جس کا نہیں ہوتا وہ اپنی سہیلیوں میں شرمندہ شرمندہ سی رہتی ہے۔ کیونکہ جہاں یہ لڑکیاں اکٹھی ہوئیں سب اپنے اپنے بوائے فرینڈ کے گن گانا شروع کر دیتی ہیں اور ظاہر ہے جس کا بوائے فرینڈ نہیں ہوتا وہ نکوسی بنی رہتی ہے۔ پھر یہ بوائے

فرینڈز بھی بہت تیز ہوتے ہیں بیک وقت تین تین چار چار لڑکیوں سے دوستی رکھتے ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک کو جھانسا دیئے رکھتے ہیں کہ شادی کرونگا تو تم سے ہی...... پھر جب کسی لڑکی کو پتہ چلتا ہے کہ اس کا بوائے فرینڈ دوسری لڑکی میں دلچسپی لے رہا ہے تو وہ اپنے بوائے فرینڈ کو تو کچھ کم ہی کہتی ہے سارا غصہ دوسری لڑکی پر اتارتی ہے جو بقول اس کے اس کا بوائے فرینڈ چرا رہی تھی۔ چنانچہ ان لڑکیوں کے بڑے بڑے دنگل ہوتے ہیں اور بڑے معرکے لڑے جاتے ہیں۔ بوائے فرینڈ اس صورت حال سے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان لڑکیوں سے محبت کے نام پر سب کچھ حاصل کر لیتے ہیں جس میں روپیہ پیسہ اور عزت سب کچھ شامل ہے۔''

اتنا کہہ کر ارشد کچھ دیر کے لئے رکا۔ قمیض کی دونوں استین جو کہنیوں سے اوپر چڑھی ہوئی تھیں۔ نیچے کیں اور بائیں آستین سے سگریٹ کا ٹوٹا برآمد کیا۔ اپنی جین کی پتلون کی جیبوں کو جھاڑا اور اس میں سے ایک لائیٹر برآمد کیا۔ پھر بڑے تکلف سے مجھ سے دریافت کیا۔

''پا جی...... سگریٹ پئیں گے آپ...... ویسے میرے پاس یہی کچھ ہے۔ کم بخت مہنگے بھی تو بہت ہو گئے ہیں سگریٹ۔ پورے ایک پاؤنڈ کا ایک پیکٹ ملتا ہے۔ اس لئے احتیاط سے خرچ کرنا پڑتا ہے۔ جب بہت طلب ہوتی ہے تو سگریٹ نکالتا ہوں۔ ایک دو سوٹے لگاتا ہوں۔ طلب پوری ہو جاتی ہے تو بجھا کر رکھ لیتا ہوں۔ دوبارہ کام آ جاتا ہے۔ دراصل سمینتھا ایک پیکٹ سے زیادہ نہیں دیتی ایک ہفتہ کے لئے۔ اسی میں گزارا کرنا پڑتا ہے۔''

''تو گویا یہ سگریٹ تمہیں سمینتھا دیتی ہے پینے کے لئے۔ وہ خریدتی ہے کیا۔؟'' میں نے حیرانگی سے دریافت کیا۔

''ہاں جی۔ یہاں تو اکثر لڑکیاں اپنے بوائے فرینڈز کو اس سے بھی بڑے تحفے دیتی ہیں''۔ ارشد نے بے نیازی سے جواب دیا۔

''آپ پینا چاہیں تو حاضر ہے۔!'' ارشد کی دریا دلی زوروں پر تھی۔

''نہیں جی...... مجھے تو معافی دیجئے۔ میں اس نعمت سے محروم ہوں۔!'' میں نے جواب دیا۔'' میں واقعی سگریٹ نہیں پیتا''۔ ارشد بٹ نے سگریٹ کا ٹوٹا سلگایا اور ایک کش لے کر کہنے لگا۔

''دراصل جی۔ لڑکیوں کو اس حالت تک پہنچانے میں انگریزی قانون کا بھی بہت ہاتھ ہے۔ انگریزی قانون کے مطابق ماں باپ سولہ سال کی عمر تک کے بچوں کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔

اس کے بعد بچے خود مختار ہو جاتے ہیں اور ماں باپ سے تقریباً علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ دراصل ماں باپ خود تیرہ چودہ سال کی عمر سے ہی بچوں کو اشارے کنائے سے بتانا شروع کر دیتے ہیں کہ اب وہ اپنا انتظام خود کرلیں۔ کیونکہ ان کے ماں باپ نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ چنانچہ سولہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے ہر بچہ چاہے لڑکا ہو یا لڑکی اپنی ملازمت اور رہائش کا انتظام خود کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ جو کچھ بھی کرے والدین قطعی ذمہ دار نہیں ہوتے...... ان بچوں کو اپنے جیون ساتھی کا انتخاب بھی خود ہی کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ لڑکی کو اپنا خاوند خود ہی ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ بہت جذباتی ہو جاتی ہے اور طرح طرح کے دھوکے اس امید پے کھاتی ہے کہ جسے وہ پسند کر رہی ہے وہ اس سے ضرور ہی شادی کرے گا۔ بعض لڑکیاں تیز بھی ہوتی ہیں۔ وہ دیکھ بھال کر کسی اچھے خوبصورت اور امیر لڑکے کو ڈھونڈ لیتی ہیں اور پھر اسے پھانس لیتی ہیں۔ لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ لڑکے نے محبت کا ڈھونگ رچا کر کسی لڑکی سے شادی کا وعدہ اس شرط پر کیا کہ لڑکی اسے تعلیم حاصل کرنے میں مدد دے تاکہ وہ پڑھ لکھ کر کسی اچھی نوکری کے قابل ہو سکے اور اس طرح دونوں کا مستقبل تابناک ہو سکے۔ چنانچہ لڑکی غریب ملازمت کر کے کمائی کرتی رہی اور لڑکے کے اخراجات اس امید پر پورے کرتی رہی کہ لڑکا تعلیم حاصل کر کے اچھے روزگار سے لگ جائے گا پھر اس سے شادی کرے گا۔ اس میں باقی تو سب صحیح اور ٹھیک طور پر ہوتا ہے لیکن آخر میں کچھ گڑبڑ ہو جاتی ہے کہ لڑکا تعلیم حاصل کرنے کے بعد کسی اور یعنی زیادہ امیر زیادہ خوبصورت لڑکی سے شادی کر لیتا ہے اور لڑکی ہاتھ ملتی رہ جاتی ہے۔''

ارشد نے مجھے بہت ہی سادگی سے بتادیا کہ اسے سمینتھا سے محبت وحبت کچھ نہیں۔ شادی کے بعد جب تک اسے برطانوی شہریت نہیں مل جاتی۔ شادی برقرار رہے گی بعدازاں وہ اسے چھوڑ دے گا کیونکہ اس کی اپنی محبت بھاٹی دروازے کے ایک گھر میں اس کا انتظار کر رہی ہے۔ اور اس کے اپنے والدین اس کے اپنے پرزور اصرار پر اس لڑکی سے باقاعدہ طور پر اس کی شادی طے کر چکے ہیں۔

''اب آپ ہی بتائیں'' ارشد نے کچھ زوردار لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ان انگریز لڑکیوں کو کیسے پسند کر سکتا ہوں۔ شرم حیا لڑکی کا زیور ہوتا ہے۔ مجھے تو وہ لڑکی اچھی لگتی ہے جو مجھے دیکھتے ہی شرم حیا سے دوہری ہو جائے۔ حیا سے پلو منہ میں دبا لے۔ مجھے دیکھے بھی تو چور نظروں سے دیکھے۔ جو کچھ میں کہوں بلا چوں چرا اس کے مان لے۔ اپنے خاوند کو مجازی خدا سمجھے

اوراس کی خدمت کرے۔ یہاں تو جی لڑکیاں بڑی بے شرم ہوتی ہیں۔ شرمانے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ برابر کا جواب دیتی ہیں۔ اگر کسی لڑکی کو آپ ایک دفعہ چوم لیں تو وہ اصرار کرے گی کہ آپ کو دو دفعہ چومے گی اور پھر اس کو محبت کی دلیل سمجھے گی۔ بھلا یہ بھی کوئی نسوانیت ہوئی۔ یہ تو ایسے معلوم ہوتا ہے کہ کسی لڑکی سے نہیں لڑکے سے محبت کی جا رہی ہو......''

''لاحول ولاقوۃ...... بڑی گہری ریسرچ ہے بھئی تمہاری ان انگریز لڑکیوں کے بارے میں۔ غالباً ان انگریز لڑکیوں کو بھی اپنے متعلق اتنا کچھ معلوم نہ ہوگا جتنا تمہیں معلوم ہے۔!''

ارشد میاں کچھ اور گہرے اترنے والے تھے کہ وکٹوریہ اسٹیشن آ گیا۔ اس لئے گفتگو کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور میں مزید قیمتی معلومات سے محروم رہ گیا...... ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ارشد میاں نے اپنی ساری عمر انگریز لڑکیوں پر ریسرچ کرنے میں گنوادی ہو۔

ارشد نے آفس میں رپورٹ کی۔ دو منٹ کے بعد جب باہر نکلا تو ٹکٹ کاٹنے والی مشین گلے میں پہن رکھی تھی اور سر پر کنڈیکٹر کی مخصوص ٹوپی جما رکھی تھی جس میں سے اس کے لمبے بال باہر جھانک رہے تھے۔ سامنے جو دومنزلہ بس کھڑی تھی اسی پر اس کی ڈیوٹی لگی تھی۔

اس نے مجھے بھی بس میں بٹھالیا اور باتیں پھر شروع ہوگئیں......

یہ بس پیڈنگٹن جا رہی تھی جو لندن کا دوسرا کنارہ ہے اور بس وہاں سوا گھنٹے میں پہنچتی تھی۔

بس جب چلی تو ارشد ٹکٹ بانٹ کر فارغ ہو چکا تھا۔ وہ دروازے کے پاس اس جگہ جا کے کھڑا ہو گیا جہاں سے سیڑھیاں گول گھومتی ہوئی اوپر چڑھتی تھیں۔ اس کے بعد اس کا معمول بن گیا کہ جوں ہی بس رکنے لگتی وہ سیڑھیوں کے پاس جا کے کھڑا ہو جاتا مردوں کو نچلی اور عورتوں اور بچوں کو اوپر والی منزل پر جانے کے لئے کہتا۔ میں نے اس بات کو نوٹ کیا لیکن اس کی ڈیوٹی سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

پیڈنگٹن پہنچ کر جب بس خالی ہوگئی اور پندرہ منٹ کے لئے بس کا بریک ہوا تو میں نے باتوں باتوں میں اس کا ذکر کیا۔ پہلے تو وہ خوب ہنسا پھر کہنے لگا...... ''یہی تو مزے کی چیز ہے جو زندہ رہنے کا سہارہ دیتی ہے۔ وہاں ایک مقعر آئینہ لگا ہوا ہے جس کا رخ اوپر کی طرف ہے۔ اس میں نیچے والا کنڈیکٹر دیکھ سکتا ہے کہ مسافر اوپر پہنچ چکے ہیں کہ نہیں کیونکہ اگر سیڑھیوں پر کوئی مسافر کھڑا ہو تو بس نہیں چلے گی کیونکہ اوپر والی منزل اور سیڑھیوں پر کھڑے ہونے کی اجازت نہیں۔ اب حال یہ ہے کہ نیچے سے سب کچھ صاف صاف نظر آتا ہے۔ چڑھتا ہوا مسافر بھی اور اترتا ہوا بھی۔ اب

آپ جانتے ہیں یہ انگریز لڑکیاں زیادہ تر اسکرٹ وہ بھی منی پہنتی ہیں جو نیچے سے کھلا ہوتا ہے اور رانوں تک سب کچھ صاف نظر آ جاتا ہے۔ بھری بھری پنڈلیاں تو ویسے ہی دکھائی دیتی ہیں آئینے کے ذریعے گول گول بھرپور رانیں دور تک نظر آتی ہیں۔''

یہ کہہ کر وہ کچھ دیر خاموش رہا تا کہ فیصلہ کر سکے کہ مزید جو کچھ وہ کہنا چاہتا ہے۔ کہے بھی کہ نہیں۔ پھر ہنسنے لگا۔

''جی یہ قوم بڑی بے شرم ہے۔ بہت کم لڑکیاں اسکرٹ کے اندر کچھ پہنتی ہیں۔ بعض تو انڈر ویئر تک نہیں پہنتیں۔ بس جی یہ سمجھ لیجئے کہ خدا کی قدرت کا نظارہ دیکھتا ہوں۔''

اچھا تو یہ راز تھا ان حضرت کے سیڑھیوں کے پاس جا کے کھڑے ہونے کا اور پھر عورتوں کو اوپر بھیجنے کا۔ بس میں لگے آئینہ کا یہ لذیذ اور فائدہ مند پہلو پہلی دفعہ میرے سامنے آیا۔

جب ہم واپس وکٹوریہ اسٹیشن پہنچے تو پونا ایک بج رہا تھا۔ سمینتھا ایک بینچ پر بیٹھی آدھ گھنٹہ سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر میری جان میں جان آئی کہ ارشد کی خرافات اور گندی باتوں سے میری جان چھوٹی۔ ہم دونوں پھر بس میں بیٹھے اور سمینتھا کے گھر کے پاس جا اترے۔ سمینتھا اپنے گھر کی بجائے مجھے سیدھی مسز علی حسین کے گھر لے گئی جو ان کے گھر سے چار گھر پرے تھا۔

مسٹر اور مسز علی حسین دونوں گھر پر تھے۔ سمینتھا نے جب بیل دی تو دونوں نے دروازے پر آ کے میرا استقبال کیا اور بڑے اہتمام سے اپنے سجے سجائے ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ یہاں پہنچ کر مجھے سمینتھا کے گھر اور اس گھر میں فرق محسوس ہوا۔ سمینتھا کا گھر اگرچہ صاف ستھرا اور خوبصورت تھا لیکن بہت سادہ۔ زیبائش کی چیزوں کی بھرمار نہ تھی۔ سب سے بڑھ کر سمینتھا کی حسین امی بہت ہنس مکھ اور مہمان نواز تھی۔ جس کی وجہ سے ایک انگریز گھر ہونے کے باوجود وہاں اپنائیت سی محسوس ہوتی تھی۔ جبکہ علی حسین صاحب کا گھر نہ صرف بڑا تھا بلکہ سجاوٹ اور زیبائش کے لحاظ سے بھی بڑھ کر تھا۔ قیمتی اشیاء کی بھرمار تھی۔ اس سے پتہ چلتا تھا کہ علی حسین صاحب خاصے امیر آدمی ہیں۔

سمینتھا مجھے پہنچا کر واپس چلی گئی۔

لنچ کا وقت ہو چکا تھا۔ مسز علی حسین نے جلدی سے پرتکلف ہندوستانی کھانا چن دیا اور تھوڑی دیر میں ہم ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے اپنا تعارف کرا رہے تھے۔ باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ علی

حسین صاحب انڈیا کے مغربی علاقہ سورت کے رہنے والے ہیں۔ ان کی بیگم ان کی قریبی عزیز ہیں۔ لندن میں ان کا کاروبار خاصا وسیع ہے۔ امپورٹ ایکسپورٹ کا کام کرتے ہیں۔ زیادہ تر چیزیں ہندوستان سے ہی منگواتے ہیں جس کی کھپت لندن میں مقیم ہندوستانی اور پاکستانی لوگوں میں ہوتی ہے اور اس پر اچھا خاصا منافع کماتے ہیں۔ خاصے دولت مند ہیں۔ اپنا ذاتی مکان ہے جسے عالیشان کوٹھی کہنا مناسب ہوگا۔ زندگی کی ہر نعمت میسر ہے۔ اس دولت اور زندگی کو دیکھ کر مجھے خاصا رشک آیا کہ کس قدر خوش قسمت لوگ ہیں۔ انہیں تو کسی قسم کا فکر و غم نہ ہوگا۔

اس کے باوجود دونوں ہی خوش نظر نہ آئے۔

کھانے کی ٹیبل پر بات چیت شروع ہوئی تو بیگم علی حسین نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔

''ہم خوش تو بہت ہیں یہاں۔ لیکن آپ بس۔ ہمارے لئے دعا کریں۔ ہم دکھی بھی تو بہت ہیں......!''

میں نے عرض کیا ''خوشی اور دکھ دو متضاد چیزیں ہیں۔ یہ ایک ساتھ اکٹھی کیسے ہو گئیں۔؟''

علی حسین صاحب نے بیگم کی طرف دیکھا جیسے اجازت لے رہے ہوں۔ بیگم نے سر جھکا دیا گویا اجازت ہے۔ علی حسین صاحب بولے۔

''ہم دونوں انڈیا کے شہر سورت کے رہنے والے ہیں۔ ہمارا خاندان پرانے رسم و رواج پر عمل پیرا ہے۔ ہم سب مل جل کر رہتے ہیں جسے جوائنٹ فیملی سسٹم کہتے ہیں۔ تین تین چار چار نسلوں تک ایک دوسرے سے الگ ہو کر علیحدہ گھر نہیں بساتے۔ اس سسٹم میں جہاں بہت خوبیاں ہیں وہاں ان گنت برائیاں بھی ہیں اور یہ تمام تر برائیاں ہمارے یہاں بھی موجود ہیں۔ ہر وقت دوسروں کے عیب کی ٹوہ میں لگے رہنا اور دوسرے کے نقصان پر خوش ہونا بھی اس میں شامل ہے۔ مزید براں تعلیم کی کمی کے باعث ہم لوگوں میں نظم و ضبط اور قوت برداشت کی بھی انتہائی کمی ہے۔ میں اپنے ماحول سے اس قدر تنگ تھا کہ جب میری شادی ہوئی تو میں نے وہ معاشرہ۔ وہ ماحول اور وہ شہر ہی چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا تا کہ کسی ایسی جگہ چل کر رہیں جہاں رہنے کی آزادی ہو۔ ہر وقت لوگوں کی نظروں کا نشانہ نہ بنیں۔ اس سلسلہ میں ہم نے برطانیہ کی بہت تعریف سنی تھی کہ وہاں کوئی کسی کے معاملے میں دخل نہیں دیتا۔ چنانچہ ہم دونوں یہاں چلے آئے اور لندن میں سیٹل ہو

گئے۔ اپنا کاروبار شروع کر دیا۔ شروع شروع میں چند تکالیف ہوئیں لیکن جلد ہی حالات نارمل ہو گئے۔ خدا نے کاروبار میں برکت دی اپنا مکان بھی بنالیا۔ اللہ نے اور بھی کرم کیا اور دو بچے۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی دے دیئے۔ بیٹا بڑا اور بیٹی چھوٹی۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا۔

کچھ عرصہ بعد خصوصاً جب بچوں نے ہوش سنبھالنا شروع کیا تو ہم نے غیر شعوری طور پر محسوس کیا کہ ہم خود تو ہندوستانی ہیں لیکن والدین انگریز بچوں کے ہیں۔ وہی خود مختاری، وہی سرکشی جو انگریز بچوں کا خاصا ہے ان میں بھی آنے لگی ہے لیکن ہم اپنی زندگی میں اتنے مصروف تھے کہ اس بڑھتی آندھی کا مداوا نہ کر سکے۔

ہم کماتے رہے اور بچے پڑھتے رہے۔ اولیول Olevel کرتے کرتے بچے اتنے آزاد ہو چکے تھے کہ ان کی نظر میں ہماری وقعت پیسہ کمانے اور پیسہ حاصل کرنے کی مشین کی سی رہ گئی تھی۔ دونوں اپنی مرضی سے گھر آتے یا گھر سے باہر جاتے ہمیں قطعی پتہ نہ چلتا تھا کہ ان کے مشاغل کیا ہیں۔ ایک دن میں اپنے بیٹے کو ٹوکنے کی جسارت کر ہی بیٹھا تو وہ پہلے تو حیران نظروں سے مجھے دیکھتا رہا پھر دھیرے سے بولا۔ ''میری زندگی میری اپنی ہے۔ مجھے حق ہے کہ اسے جیسا چاہوں گزاروں۔ آپ کون ہیں ہمیں پوچھنے والے؟'' یہ نعرہ یہاں ہر انگریز کا ہے چاہے وہ بڑا ہو چاہے چھوٹا اس جواب نے مجھے اپنی حیثیت بتادی اور میں خاموش کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

اس کے بعد اول تو ہم میں یہ ہمت ہی نہ رہ گئی کہ ہم انہیں ٹوک سکتے۔ اگر ٹوکتے تو ایسا کڑوا جواب ملتا کہ ہوش ٹھکانے آ جاتے۔

اس نعرہ کو تقویت برطانوی قانون سے بھی ملتی ہے۔ جو ہر شخص کو اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزارنے کا حق تسلیم کرتا ہے۔ برطانوی معاشرہ میں بچہ پیدا ہوتے ہی ایک علیحدہ شخصیت کا حامل تصور کر لیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اسے سلایا بھی الگ کمرے میں جاتا ہے۔ ذرا سا بڑا ہوتا ہے تو اس کی کسی غلطی یا نقصان یا شرارت پر اسے سزا نہیں دی جا سکتی۔ اسے بحث مباحثہ سے قائل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے یہ دیکھے بغیر کہ وہ اس بات کو پوری طرح سمجھتا بھی ہے کہ نہیں۔ نتیجتاً وہ بحث کا عادی ہو جاتا ہے اور بات بات پر بحث کرنے لگتا ہے۔ سزا نہ ملنے کی وجہ سے خودسر اور سرکش ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ماں باپ اس کے نزدیک اہمیت ہی کھو بیٹھتے ہیں۔

یہاں پر والدین کا فرض ہے کہ وہ سولہ سال کی عمر تک اس کی دیکھ بھال کریں۔ پالیں پوسیں۔ پڑھائیں لکھائیں اس کے بعد ان کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ سولہ سال کی عمر میں بچہ

خودمختار ہو جاتا ہے اور اسے حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ والدین کے ساتھ رہے یا ان سے الگ ہو جائے۔ اس میں لڑکا لڑکی کی تخصیص نہیں۔ چنانچہ بچے عام طور پر والدین سے علیحدہ ہو جاتے ہیں اور اپنے لئے ملازمتیں ڈھونڈ لیتے ہیں پھر کسی ہوسٹل یا اپارٹمنٹس میں رہنے کی جگہ بھی تلاش کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد والدین سے ان کا ملنا ملانا کسی عام سے رشتہ دار سے ملنے کی طرح ہوتا ہے۔ والدین بھی اس صورت حال کی ہمت افزائی کرتے ہیں تا کہ بچے جلد از جلد اپنا بوجھ خود اٹھائیں۔

کہا جاتا ہے کہ انگریز والدین شادی کے بیس پچیس سال بعد دوبارہ جوان ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کی اولاد ان سے علیحدہ ہو چکی ہوتی ہے اور ان پر کسی کا کوئی بوجھ نہیں ہوتا۔ شروع میں تو اولاد کی خودمختاری اچھی لگتی ہے لیکن جلد ہی وہ مرحلہ شروع ہوتا جب والدین کو بچوں کی ضرورت ہوتی ہے تو یہی خودمختار اولاد ان کے قریب نہیں پھٹکتی اور وہ واقعی اکیلے رہ جاتے ہیں۔ اسی لئے انگریز والدین کا بڑھاپا بہت بھیانک ہوتا ہے اور وہ عموماً تنہائی کی موت مرتے ہیں۔

خیر...... یہ تو ایک علیحدہ بات ہے۔ میں بات کر رہا تھا بچوں کی خودمختاری کی۔ تو بچوں کی علیحدگی کے بعد وہ مرحلہ شروع ہوتا ہے جو ہمارے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ ہوتا ہے۔ لڑکے لڑکیاں اپنا جیون ساتھی خود چنتے ہیں اور اس کے لئے وہ طرح طرح کے طریقے اختیار کرتے ہیں۔ ڈیٹنگ یعنی تاریخ مقرر کر کے ساتھی کے ساتھ باہر جانا۔ قلمی دوستی۔ اخباروں رسالوں میں قلمی دوستی کے اشتہار۔ سمندروں' دریاؤں میں تعارفی بوتلیں پھینکنا۔ نوجوان لڑکے لڑکیوں کی دوستی کرانے والے ادارے۔ یہ سب اسی مقصد کے لئے ہوتے ہیں۔ اس میں ناتجربہ کار لڑکے لڑکیاں بار بار دھوکا کھاتے ہیں۔

چلو...... یہاں تک پھر بھی خیر ہے لیکن اس سے آگے کا پہلو بہت گھناؤنا ہے۔ جب لڑکی یا لڑکا ایک دوسرے کے دوست بن جاتے ہیں اور ان میں سے کسی ایک کو رہنے کے لئے جگہ نہیں ملتی تو وہ بلا تکلف اپنے دوست کے اپارٹمنٹ میں رہنے کے لئے چلا جاتا/ جاتی ہے اور کھلم کھلا اس کے ساتھ رہتی ہے۔ جب جی بھر جاتا ہے تو کوئی اور دوست ڈھونڈ لیتی ہے اور اس کے ساتھ رہنا شروع کر دیتی ہے۔ وہ لڑکیاں بہت زیادہ نکتہ چینی کا باعث بنتی ہیں جن کا کوئی بوائے فرینڈ نہیں ہوتا۔ چنانچہ لڑکیاں زیادہ سے زیادہ بوائے فرینڈز بناتی ہیں پھر ان بوائے فرینڈز میں رقابت کا باعث بنتی ہیں جس سے امن وامان کے مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں۔''

علی حسین صاحب دومنٹ کے لئے خاموش ہوئے۔ پھر بولے۔''یہ تو میں نے یہاں کی

سوسائٹی کے متعلق بتایا تھا اب میں اپنے مسئلہ کی طرف آتا ہوں...... میرے بچوں نے جب ایسے رنگ ڈھنگ اختیار کرنے شروع کئے تو ہمیں خطرے کا احساس ہوا لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی اور طوفان سر کے اوپر سے گزر رہا تھا۔

ہوا یوں کہ ایک دن میرا بیٹا۔ایک گوری لڑکی کو گھر لے آیا۔ہم نے کچھ زیادہ خیال نہ کیا کیونکہ یہاں گرل فرینڈ رکھنا کوئی انوکھی بات نہیں لیکن حیرانگی اُس وقت ہوئی جب بیٹے نے بتایا کہ لڑکی ان کے گھر رات رہے گی۔ بلکہ اس کے بیڈ روم میں رات گزارے گی۔ظاہر ہے ہم اس صورت حال کو برداشت ہی نہ کر سکتے تھے چنانچہ بیٹے کو منع کرنے کی کوشش کی تو وہ مقابلہ پر تن گیا کہ ''میری اپنی زندگی ہے جیسے مرضی ہوگی گزارونگا۔آپ کون ہیں منع کرنے والے۔؟'' شرم وحیا ماں باپ کی غیرت وعزت سب عرصہ ہوا ختم ہو چکی تھی۔پھر جھگڑے اور پولیس میں رپورٹ کی نوبت آ گئی لیکن یہ دیکھ کر ہماری مایوسی اور حیرت کی حد نہ رہی کہ پولیس نے بھی ان کی حمایت کی اور ہماری مزاحمت کو انسانی حقوق میں مداخلت قرار دیا۔ان کا کہنا تھا کہ جب لڑکی کو کوئی اعتراض نہیں تو پھر ہم کون ہیں اعتراض کرنے والے۔جب ہم نے گھر کے مالک ہونے کا حوالہ دیا تو پولیس والوں نے بتایا کہ اگر ہم نے اجازت نہ دی تو پھر یہ نوجوان جوڑا کوئی اور جگہ تلاش کرے گا۔ ہوسکتا ہے کہ کسی پارک وغیرہ میں برسرِعام فحاشی کے الزام میں پکڑے جائیں تو اس میں والدین بھی دھر لئے جائیں گے۔ چنانچہ ہمیں ہتھیار ڈالنے پڑے اور یقین جانیں ہمیں وہ رات آگ کے بستر پر گزارنی پڑی۔

اگر معاملہ بیٹے تک محدود رہتا تو شاید ہم پھر بھی آنکھیں بند کر لیتے لیکن ایک دن ہماری بیٹی ایک انگریز لڑکے کو گھر لے آئی۔آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایک ایشیائی خصوصاً ہندوستانی کے لئے یہ بات کس قدر ناقابل برداشت ہوسکتی ہے چنانچہ میں نے اپنی بیٹی پر ہاتھ اٹھا دیا۔اس نے پولیس کو فون کر دیا۔پولیس فوری طور پر آئی اور اس کے نتیجہ میں ہمیں وہی تمام دلائل سننے پڑے جو انسانی حقوق، زندگی اپنی مرضی سے گذارنے کے حق سے شروع ہو کر پولیس قوانین تک پہنچتے تھے۔لیکن جب میں نے اپنی بیٹی اور اس کے دوست کو گولی مارنے اور میری بیوی نے زہر کھا لینے کی دھمکی دی تو پولیس نوجوان کو ساتھ لے گئی۔اس کے بعد ہماری بیٹی کو کبھی حوصلہ نہ ہوا کہ کسی بوائے فرینڈ کو گھر لائے۔

اس صورت حال کو دیکھ کر ہم نے دوسرے دن ہی فیصلہ کیا کہ سب کچھ بیچ باچ کر اپنے

وطن واپس چلے جائیں تا کہ کم از کم عزت تو محفوظ رہے لیکن ہماری اولاد نے برطانیہ جیسے صاف ستھرے خوبصورت رنگین ملک کو چھوڑ کر ہندوستان جیسے گندے ملک' گندے معاشرے اور گرم موسم میں جانے سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ وہ برطانوی ہیں اور برطانیہ میں ہی رہیں گے۔اس طرح ہمارے لئے واپسی بھی ممکن نہ رہی کہ ہم اپنی اگلی نسل کو اس غیر ملک میں چھوڑ جائیں۔ پھر یہ کہ ہمارے جانے سے ہماری بیٹی بالکل ہی مادر پدر آزاد نہ ہو جائے اور مکمل طور پر طوائف نہ بن جائے کیونکہ ابھی تو پھر بھی کچھ شرم حیا سے کام لیتی ہے۔ ہم نے یہ بھی کوشش کی کہ بیٹا اور بیٹی اپنے اپنے چاہنے والوں سے ہی شادی کر لیں لیکن وہ اس پر بھی راضی نہ ہوئے۔ کیونکہ شادی ایک پابندی ہے اور برطانوی قانون میں طلاق اور علیحدگی ایک مشکل اور مہنگا عمل ہے۔ چنانچہ اب میرا بیٹا اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ رہتا ہے۔اور بیٹی ہمارے ساتھ۔

سچی بات ہے ہم تو اس وقت کو کوس رہے ہیں جب ہم اپنا وطن چھوڑ کر اس مادر پدر آزاد معاشرے میں آئے تھے اب آپ ہمارے لئے دعا کریں کہ خدا ہمیں موت دے کیونکہ ہم سب کچھ دیکھنے اور سہنے پر مجبور ہیں اور کچھ کر بھی نہیں سکتے۔

ہماری باتیں جاری تھیں کہ ایک نوجوان گھر میں داخل ہوا اور ہم سب کو نظر انداز کرتا ہوا ایک کمرے میں چلا گیا۔اس کے جارحانہ انداز سے ہی باغی پن ٹپک رہا تھا۔علی حسین صاحب اور ان کی بیگم نے بھی نفرت سے منہ پھیر لیا۔

علی حسین صاحب اپنا دکھ پیش کر چکے تھے۔ میرے پاس نہ تو الفاظ تھے اور نہ ہی ان حالات کا کوئی علاج جو ان کی خدمت میں پیش کرتا۔لیکن اتنے امیر کبیر شخص کی یہ دکھی حالت دیکھ کر میرے دل پر چوٹ لگی۔ دراصل علی حسین صاحب اپنے بچے گنوا کر لندن میں رہنے کی قیمت ادا کر رہے تھے۔اپنے گھٹے ہوئے تنگ ماحول سے آزادی حاصل کرنے کے لئے انہوں نے اپنا وطن کھویا۔اپنے عزیز و اقارب کھوئے۔ اپنا کلچر کھویا۔اپنی مٹی اور اس کی خوشبو کھوئی اور جب اتنی ساری چیزیں گنوا کر آزادی حاصل کر لی تو اس کی قیمت کے طور پر اپنے بچے کھوئے اور بری طرح سے کھوئے کیونکہ اب ان کے بچے کسی طور پر ہندوستانی بچے نہیں تھے بلکہ انگریز بچے تھے۔ وہی اپنے حقوق کے علم بردار اپنی زندگی اپنی مرضی کے مطابق گزارنے کے مدعی۔ ہر حد پھلانگنے کے متمنی۔! گو ان کا رنگ اب بھی کالا تھا۔

"حسین صاحب جو کچھ آپ نے بتایا کہ یہ نوجوان لڑکے لڑکیاں کرتے ہیں تو کیا یہ فحاشی

اور عصمت فروشی کے ضمن میں نہیں آتا۔اور کیا اس کے خلاف کوئی قانون نہیں جو حرکت میں آئے۔؟''میں نے جھجکتے جھجکتے سوال کیا۔

علی حسین صاحب کچھ دیر سوچتے رہے۔پھر بولے

''قانون ہے کیوں نہیں۔بہت سخت قانون ہے لیکن اس کے ساتھ ہی شخصی آزادی کا بھی قانون ہے جو انگریزوں کو تمام قوانین سے زیادہ عزیز ہے۔یعنی جب تک جرم قطعی طور پر ثابت نہ ہو جائے کسی شخص کو سزا نہیں ہو سکتی''۔جرم کے لئے الزام لگانا ضروری ہے۔اب الزام تو وہی لگائے گا جس کے ساتھ زبردستی کی گئی ہو۔اب آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ جب کھیل کھیلا ہی دونوں کی مرضی سے جارہا ہو تو کون کس پر الزام لگائے گا۔اس صورت حال میں قانون غریب گھر کے باہر کھڑا رہ کر تماشا دیکھنے کے سوا کیا کر سکتا ہے؟ دراصل اس قانون کا تمام تر دارومدار لڑکی کی مرضی پر ہے۔اگر لڑکی راضی ہے تو پھر کوئی جرم نہیں۔قانون دروازے سے باہر کھڑا تماشا دیکھے گا دلچسپی سے۔ہاں اگر لڑکی ناراض ہو گئی اور اس نے قانون کو آواز دے دی تو قانون بڑی شدت سے دروازہ توڑ کر اندر گھس آئے گا اور اپنے تقاضے پورے کرے گا۔چنانچہ یہاں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ جوان لڑکے لڑکیاں مدتوں بغیر بیاہے ساتھ رہتے رہے جسے Living Together (ساتھ رہنا) کہتے ہیں۔یا لڑکیاں غیر لڑکوں کو اپنے اپارٹمنٹ میں لے جاتی رہیں لیکن قانون کے ماتھے پر شکن تک نہ آئی۔کسی دن لڑکی ناراض ہو گئی یا لڑکے نے کوئی مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا تو لڑکی نے باہر کھڑے قانون کو بلا لیا اور لڑکا بری طرح دھر لیا گیا......اب ظاہر ہے میرا بیٹا جس لڑکی کو گھر میں لاتا ہے تو اس میں لڑکی کی اپنی مرضی بھی شامل ہوتی ہے۔اس طرح جب میری بیٹی اپنے بوائے فرینڈ کو لاتی ہے اپنی مرضی سے ہی لاتی ہے۔چنانچہ وہ جو چاہے کریں قانون اس باہمی رضامندی کی وجہ سے خاموش رہے گا۔اور ہم بے بس رہیں گے۔کچھ نہ کر سکیں گے۔اس لئے خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔''

قانون کی یہ تشریح میری سمجھ سے بالا تھی۔گویا باہمی رضامندی سے ناجائز سے ناجائز کام بھی جائز ہو سکتا ہے۔خصوصاً لڑکی کی مرضی تو قانون بن سکتی ہے۔لاحول ولا قوۃ۔''جبھی انگریز لڑکیاں اتنی تیز ہوتی ہیں''۔میں نے سوچا۔

مجھے خاموش دیکھ کر علی حسین صاحب بولے۔

''معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی قانون سے آپ کی واقفیت کچھ کم ہی ہے۔'' مجھے نفی میں

سر ہلاتا دیکھ کر بولے۔ "انگریزی قانون کے تحت بیوی۔ اپنے خاوند کی جائیداد۔ منقولہ وغیر منقولہ میں برابر کی حصہ دار ہوتی ہے۔ شوہر اگر اسے طلاق دینا چاہے تو اول تو اسے عدالت سے رجوع کرنا پڑے گا۔ یہ ایک بہت ہی طویل اور مہنگا عمل ہے۔ کیونکہ عیسائی مذہب۔ خصوصاً کیتھولک فرقہ میں طلاق یا دوسری شادی کا کوئی تصور ہی نہیں۔ بلکہ سخت ممانعت کے احکام ہیں ہے۔ مسلمانوں کی طرح نہیں کہ تین دفعہ طلاق طلاق طلاق کہا اور میاں بیوی میں مستقل جدائی ہوگئی۔ یہاں تو بہت پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ پھر جب طلاق ہو جاتی ہے تو گھر کے تمام اثاثہ جات، جائیداد، روپیہ پیسہ، آمدنی غرض ہر چیز کا بٹوارہ کیا جاتا ہے اور اس کا نصف بیوی کو ملتا ہے۔ چنانچہ اسی تحفظ کے پیش نظر بیوی اپنے شوہر سے کبھی دب کے بات نہیں کرتی۔ بلکہ شیر ہو کر برابری کی سطح پر بات کرتی ہے۔ کیونکہ طلاق سے اس کو کچھ نہ کچھ مل ہی جائے گا اور شوہر کو اپنے نصف اثاثے سے محروم ہونا پڑے گا۔ پھر دوسری بات یہ ہے کہ طلاق ہونے سے انگریز لڑکی کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ معاشرہ اسے قبول کر لیتا ہے اور عام طور پر اس کی دوسری شادی بھی ہو جاتی ہے۔ عین ممکن ہے کہ دوسرا خاوند پہلے سے بہتر ثابت ہو۔ اس لئے آپ نے سنا ہوگا کہ انگریز عورت طلاق لیتے وقت گھبراتی نہیں۔ ہمارے یہاں ہندو پاک میں عورت طلاق کے نام سے ہی زندہ درگور ہو جاتی ہے۔ طلاق یافتہ عورت کو معاشرہ قبول نہیں کرتا۔ دوسری شادی کا امکان نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ اس لئے کہ عورت اپنے خاندان کے لئے داغ بن کر رہ جاتی ہے چنانچہ ہندوستانی، پاکستانی عورت مر جانا قبول کرتی ہے۔ طلاق نہیں۔"

"پھر ایک قانون اور بھی ہے اگر کسی لڑکی کو حمل ٹھہر جاتا ہے تو وہ جس لڑکے یا مرد پر ہاتھ دھر دے اسے دھر لیا جاتا ہے۔ تعزیرات برطانیہ میں اس کے لئے سخت سزائیں ہیں۔ قید بھی اور جرمانہ بھی لیکن اس کا جو حل ڈھونڈا گیا ہے وہ از حد دلچسپ ہے۔ لڑکے سے کہا جاتا ہے کہ وہ لڑکی سے شادی کرے۔ اب لڑکے کے لئے دو ہی راستے ہیں۔ یا تو انکار کر دے یا پھر شادی کر لے۔ ان دونوں حالتوں میں لڑکا بری طرح پھنس جاتا ہے۔"

"اگر شادی کر لیتا ہے تو ایک تجربہ کار کھیلی کھائی عورت پلے پڑتی ہے جو اپنے میاں کی کمزوری سے واقف ہے اور جس کے دل سے خاوند کا احترام عدالت کے ذریعے رخصت ہو چکا ہے۔ چنانچہ شادی کے بعد وہ کھلم کھلا اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے اور شوہر کے سینے پر مونگ دلتی ہے۔ شوہر کے لئے ساری عمر انگارے نگلنے کے سوا چارہ نہیں رہتا کیونکہ اسے طلاق

کے انجام کا بھی علم ہوتا ہے۔''

''دوسری طرف اگر وہ شادی پر آمادہ نہیں ہوتا تو قید و جرمانے کی سزا جو اسے ملتی ہے سو ملتی ہے۔اس کے علاوہ اسے بچے کی پیدائش تک کے زمانے کا تمام خرچہ لڑکی کو دینا پڑتا ہے۔اس کے بعد بچے کی پیدائش کے تمام اخراجات جو خاصے زیادہ ہوتے ہیں برداشت کرنے پڑتے ہیں۔پھر بچہ سولہ سال کی عمر تک اس کی ذمہ داری ہوتا ہے۔اس کے تمام اخراجات بشمول خوراک۔کپڑہ لتا۔رہن سہن، تعلیم۔تمام کا ذمہ دار لڑکا ہوتا ہے۔پھر لطف کی بات یہ ہے کہ ان تمام اخراجات کا تعین وہ خود نہیں بلکہ عدالت کرتی ہے اور ایسا کرتے وقت وہ لڑکے کی آمدنی کا لحاظ بھی نہیں کرتی۔بعض اوقات ایسے واقعات بھی دیکھنے میں آتے ہیں کہ لڑکے کی کل تنخواہ اگر سو پونڈ ماہانہ ہے اور عدالت نے بچے کا خرچ اسی یا پچاسی پونڈ ماہانہ مقرر کیا ہے۔اب لڑکا ساری تنخواہ ہی لڑکی کو بچے کے اخراجات کے طور پر دے دے تو پھر خود کیا کرے۔؟''

''نتیجتاً وہ شادی پر مارے بندھے راضی ہو ہی جاتا ہے۔اس کے بعد اس کی حالت اس بے بس مکھی کی سی ہو جاتی ہے جو مکڑی کے جال میں بری طرح جکڑی جا چکی ہو اور پھر ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد نڈھال ہو چکی ہو۔اس عالم میں وطن، عزیز و اقارب سب ہی بھولے جا چکے ہوتے ہیں۔مرد ہونے کا زعم اور اکڑ فوں سب ختم ہو چکی ہوتی ہے۔باقی عمر وہ ہوتا ہے اور بیوی کی انگلیاں جس کے اشارے پر وہ ناچتا رہتا ہے۔اس قانون کا فائدہ چالاک لڑکیاں اٹھاتی ہیں۔چھانٹ کر کسی اچھی موٹی آسامی سے دوستی کرتی ہیں۔محبت کا ڈھونگ رچاتی ہیں۔خود ہی موقع فراہم کرتی ہیں اور پھر مکڑی کی طرح مکھی کو قابو کر لیتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک کے بھولے بھالے اور جنسی گھٹن سے بھرے ہوئے ماحول سے نکلے ہوئے نوجوان جب برطانیہ پہنچتے ہیں تو جنسی آزادی سے مالا مال اس ملک میں پہنچتے ہی اُن کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔پھر جب کوئی لڑکی اُن سے آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر بات کرتی ہے تو ان کے پاس مر مٹنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہوتا۔پھر ایسے گرفتار ہوتے ہیں کہ زندگی بھر چھٹکارہ نہیں ملتا۔''

''اب آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ جو نوجوان یہاں کمائی کے لئے آتا ہے۔وہ ایک ہی بیوی کما کے کیوں رہ جاتا ہے۔کمائی کر کے دولت لے کے اپنے وطن کیوں نہیں جاتا۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے جو میں نے ابھی بیان کی ہے۔اس کے بعد مزید ستم یہ ہوتا ہے کہ ان کی اولاد بھی اپنے وطن جانا نہیں چاہتی کیونکہ وطن اس کے لئے اجنبی ہوتا ہے۔اس طرح یہاں آنے

والا غریب اپنی نسلیں بھی اس ملک کے حوالے کر جاتا ہے۔آج بھی اس ملک میں ہمارے ملک کے ہزاروں نوجوان اسی طرح کی بے کسی کی زندگی گزار رہے ہیں کہ نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے۔ پھر اپنی ذات میں تنہا ہیں۔نہ بیوی وفادار۔نہ بچے کہنے میں۔پھر زندگی اسی طرح بیت جاتی ہے۔ اور ایک دن وہ بے نیل و مرام مٹی اوڑھ کر سو جاتے ہیں۔''

''یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ انگریزی قوانین از حد سخت ہیں اور ان پر عمل کرانے والے ادارے مثلاً پولیس وغیرہ ان پر پوری ایمانداری سے عمل کراتے ہیں اور اس میں کوئی نرمی نہیں برتتے لیکن اس کے ساتھ ہی عام انگریز بھی قانون سے واقفیت رکھتا ہے۔چنانچہ ہر بات کا فیصلہ چاہے وہ کتنی چھوٹی سی بات کیوں نہ ہو۔عدالت میں ہوتا ہے اور اس کے لئے با قاعدہ قانونی جنگ لڑی جاتی ہے۔اسی لئے وکالت یہاں بڑا ہر دلعزیز اور منافع بخش پیشہ ہے۔ ان وکلاء کا سب سے محبوب مشغلہ اپنے موکلوں کے لئے نئی سے نئی قانونی موشگافیاں اور نکات ڈھونڈنا ہوتا ہے۔ان وکیل حضرات میں بہت بڑی تعداد طلاق کے ماہرین کی ہے۔اس معاشرہ میں جہاں یہ حال ہو۔ہم جیسے پرانے خیالوں کے ہندوستانی پاکستانی کیا کر سکتے ہیں؟''

میں نے یکایک سوال کیا۔

''کیا انگریز والدین اس صورت حال سے سمجھوتا کر لیتے ہیں کہ ان کے بچے کھلم کھلا صنف مخالف سے دوستی کریں یا تعلقات قائم کریں؟۔''

علی حسین صاحب مسکرائے۔

''یہی تو انگریزوں کی خوبی ہے جس کا ہمیں قائل ہونا پڑتا ہے کہ وہ دوغلی پالیسی نہیں رکھتے۔اس کام میں وہ اس لئے حارج نہیں ہوتے کہ جوانی میں انہوں نے بھی یہی حرکات کی تھیں جو ان کے بچے کرنا چاہتے ہیں۔وہ کھلم کھلا کہتے ہیں کہ جو حرکت ہم خود کرتے ہیں۔ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ہم اپنے بچوں کو اس سے منع کریں۔یہ ہم ہندوستانی لوگوں کی طرح دوہرا معیار نہیں رکھتے کہ خود تو جو جی چاہے کریں۔اندھی جوانی کے تقاضے پورے کریں۔عشق لڑائیں۔لڑکیوں سے دوستیاں کریں ان کے ساتھ گھومیں پھریں لیکن اپنی اولاد کو ان کاموں سے سختی سے منع کریں اور خواہش کریں کہ ہماری اولاد فرشتہ سیرت ہو۔بیٹے نیک اور پاک باز ہوں۔لڑکی پر نظر پڑتے ہی آنکھیں جھکا لیں۔بیٹی پنج وقتہ نمازن ہو۔پاک دامن ہو۔فرش سے نظریں ہی نہ اٹھائے۔کسی غیر لڑکے کا خیال تک دل میں نہ لائے۔یہ بات تو غلط ہے۔''

''ہمارے نوجوان چاہتے ہیں کہ ان کی اپنی بیوی تو نیک پروین ہو اور دوسروں کی بہن آنکھوں میں مے خانہ لئے پھرتی ہو۔ یہاں کا نوجوان کہتا ہے کہ اگر میں کسی کی بہن سے عشق کر سکتا ہوں تو میری بہن کو بھی یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ بھی کسی من پسند نوجوان سے عشق لڑائے۔ مجھے اس کو روکنے کا کوئی اختیار نہیں۔ انگریزوں کی یہی حقیقت پسندی ہمیں خاموش کر دیتی ہے۔ میں نے یہاں کے نوجوانوں کو بذات خود اپنی بہنوں کا تعارف اپنے دوستوں سے کراتے دیکھا ہے۔ باپ اور بیٹے، اپنی بیٹی اور بہن کی ہمت افزائی کرتے ہیں کہ وہ کسی نوجوان کے ساتھ ڈیٹنگ پر جائے۔''

علی حسین صاحب اپنی رو میں اپنے دل کا غم نکالے چلے جا رہے تھے۔ اور سچی بات یہ کہ میرے پاس ان کی باتوں کا کوئی جواب نہ تھا اور نہ ہی کوئی تجویز تھی۔ اس لئے خاموشی سے سننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ لگے ہاتھوں علی حسین صاحب سے پاکستانی ہندوستانی خاندانوں کے متعلق پوچھ لیا جائے جو یہاں مدتوں سے آباد ہیں کہ ان کے بچے برطانوی ماحول میں کس طرح ایڈجسٹ ہو رہے ہیں۔ لہٰذا میں نے محتاط ہو کر پوچھا۔

''ہندوستانی پاکستانی لڑکے لڑکیاں اس کھلے ماحول میں کس طرح رہ رہے ہیں۔؟''

حسین صاحب کچھ دیر سوچتے رہے پھر بولے۔

''آپ کے سوال کا جواب دینے سے پہلے اگر دو باتوں کی وضاحت کر دی جائے تو جواب آسان ہو جائیگا۔ پہلی بات یہ کہ انسان کے کردار پر کنٹرول۔ اس کے والدین اور مذہب دونوں سے ہوتا ہے۔ یہاں جو ایشیائی یعنی پاکستانی ہندوستانی وغیرہ آباد ہیں وہ بذات خود بڑی حد تک مذہب سے بیگانہ ہیں۔ جب وہ خود مذہب کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تو اپنی اولاد کو کیونکر مذہبی احکامات سے واقف کرا سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ اور ان کی اولاد سب ہی مغربی تہذیب کے دھارے میں بہہ چکے ہیں۔ رہے کٹر مذہبی قسم کے حضرات جوان حالات سے اولاد کو محفوظ رکھنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ اول تو وہ خود آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ پھر یہ کہ وہ اپنی اولاد کو کب تک کنٹرول کر سکتے ہیں۔ اولاد لڑکا ہو یا لڑکی۔ ساری عمر تو گھر کی چار دیواری میں نہیں رکھی جا سکتی۔ کبھی تو گھر سے باہر آئے گی اب دیکھیں تعلیم یہاں لازمی ہے۔ ان کے بچے بچیاں جب سکول جاتے ہیں تو انہیں خالص انگریزی ماحول ملتا ہے۔ ان کے ہم جماعت جن میں لڑکے لڑکیاں دونوں شامل ہیں۔ انہیں اپنے رازوں میں شریک کرتے ہیں تو ماں باپ کا کنٹرول اپنا اثر کھو بیٹھتا ہے۔ اسکول کے باہر کی دنیا میں وہ گھومتے پھرتے اور دوستیاں کرتے ہیں۔ پھر گھر کا

ٹی وی انہیں وہ کچھ سکھا دیتا ہے جس سے ان کے والدین بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ نتیجتاً وہ زیادہ سے زیادہ تجربہ کار اور خود مختار ہوتے چلے جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد ان پر ہر قسم کی گرفت ختم ہو جاتی ہے۔ ان حالات میں والدین بے بس ہو جاتے ہیں۔ اور سوائے صبر کے کچھ نہیں کر سکتے۔''

''دوسری بات ہمارے ذہنوں کا تصور ہے کہ ہر گوری لڑکی خوبصورت ہوتی ہے۔ ہمارے ہندوپاک میں ہر گوری لڑکی خوبصورت شمار کی جاتی ہے۔ چاہے اس کا قد بت۔ یا شکل کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ یہی تصور لے کے جب ہمارا جوان یہاں آتا ہے تو اسے ہر لڑکی پری نظر آتی ہے۔ اور پھر یہ چلتی پھرتی پری بے تکلف بھی ہو جائے تو ہمارا جوان قابو سے باہر کیوں نہ ہو جائے۔؟''

''اب دونوں باتوں کو آپس میں جمع کر لیں تو نتیجہ نکل آتا ہے کہ ایشیائی لڑکے اور لڑکیاں گورے رنگ کی تلاش میں رہتے ہیں جو یہاں وافر تعداد میں دستیاب ہے۔ اس لئے پاکستانی لڑکے اور لڑکیاں آپس میں بہت کم دلچسپی لیتے ہیں۔ پاکستانی لڑکے پاکستانی لڑکیوں میں قطعی دلچسپی نہیں لیتے اس لئے پاکستانی لڑکیاں انگریز لڑکوں میں مکس ہونے کی کوشش کرتی ہیں۔ جوان میں سیریس نہیں ہوتے۔ اپنا کام نکال کے الگ ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد یہ لڑکیاں ہندو اور سکھ لڑکوں میں دلچسپی لیتی ہیں اور یہ لڑکے بھی اپنی بساط کے مطابق ان میں دلچسپی لیتے ہیں۔ اس لئے لندن میں ایک ایسا مکس یعنی ملا جلا معاشرہ وجود میں آ رہا ہے جس میں مذہب کا قطعی کوئی عمل دخل نہیں۔ کئی مسلم گھرانے کی لڑکیوں نے ہندو اور سکھ لڑکوں سے شادی کر لی اور ماں باپ کچھ بھی نہ کر سکے۔ اسی طرح ہندو اور سکھ لڑکیاں مسلم گھرانوں میں آ گئیں۔ اور لطف کی بات ہے کہ سب اپنے اپنے مذہب پر عمل پیرا ہیں کوئی دوسرے کا مذہب اختیار نہیں کرتا نہ ہی کوئی انہیں مجبور کرتا ہے۔''

''اس انجام سے بچنے کے لئے کئی راسخ العقیدہ مسلمان گھرانوں نے واپس پاکستان جانے کی کوشش کی۔ ان میں سے وہ گھرانے تو کامیاب ہو گئے جو اپنے چھوٹے بچوں کو اس وقت پاکستان لے آئے جب ابھی وہ معاشرے کا اثر قبول کرنے کے قابل نہ تھے۔ ہاں جن بچوں نے ہوش سنبھالا اور شعور حاصل کر لیا۔ ان کے ماں باپ مجبور ہو گئے کہ وہیں رہیں کیونکہ بچوں نے واپسی سے قطعی انکار کر دیا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ ایشیائی گھرانے اور خصوصاً پاکستانی خاندان جن کی بچیاں جوان ہو چکی ہیں۔ ان کی شادیوں کے لئے سخت پریشان ہیں۔ پاکستانی لڑکے انہیں قبول نہیں کرتے۔ ہندو سکھ گھرانوں میں وہ رشتہ کرنا نہیں چاہتے۔ مجبوراً وہ پاکستان کا رخ کرتے ہیں اور بڑے بڑے اشتہارات اخباروں میں شائع کراتے ہیں جن میں طرح طرح کے لالچ

دیئے جاتے ہیں۔ اس طرح کوئی بھولا بھالا پاکستانی نوجوان خصوصاً جو برطانیہ آنے کا خواہش مند ہو۔ پھانس لیا جاتا ہے۔ اور پھر وہ غریب جب یہاں آ کے ماحول دیکھتا ہے تو پھر ساری عمر پچھتاتا ہے کیونکہ لڑکی یعنی اس کی بیوی بھی اسے بہت کم پسند کرتی ہے اور وہ بیچارہ اجنبی ہو کر رہ جاتا ہے۔ اگر پاکستان میں لڑکی کی شادی کر دی جائے تو وہ وہاں ساری عمر...... اجنبی رہتی ہے۔ پاکستانی معاشرہ میں گھل مل یا جذب نہیں ہو پاتی۔''

''تو گویا پاکستانی لڑکی کے لئے جس نے برطانوی معاشرہ میں پرورش پائی۔ برطانیہ اور پاکستان دونوں طرف کوئی جگہ نہیں۔ اس لحاظ سے پاکستانی خاندانوں کا سب سے بڑا مسئلہ تو بچیوں کی صحیح پرورش اور ان کی شادی ہوا۔'' میں نے پوچھا

''بے شک...... یہ کسی ایک فیملی کا نہیں۔ ہر اس خاندان کا مسئلہ ہے جو برطانیہ بلکہ یورپ میں آباد ہے اور جس میں بچیاں موجود ہیں۔؟'' حسین صاحب نے سر ہلا کر کہا۔

''اچھا تو حسین صاحب یہ بتایئے کہ اس برطانوی قوم میں جنس اتنا عام کیوں ہے۔؟'' میں اور زیادہ گہرا اترا۔

حسین صاحب ہنس پڑے۔ کہنے لگے۔'' جناب والا۔ پوری مغربی دنیا جس میں امریکہ اور کینیڈا کو بھی شامل کر لیجئے۔ میں برطانیہ ہی سب سے زیادہ ''مولوی ملک'' ہے...... اور صاف ستھرا شمار کیا جاتا ہے۔ یہاں پھر بھی شرم و حیا کچھ کچھ باقی ہے۔ لوگ اس حد تک نہیں پہنچے جس حد تک باقی مغربی دنیا پہنچی ہوئی ہے۔ خصوصاً شمالی یورپ جسے اسکینڈے نیوین کنٹریز کہتے ہیں۔ وہاں تو مشہور ہے کہ پنگھوڑے میں پڑے بچے کو وہ تمام راز معلوم ہوتے ہیں جو ہمارے شریف معاشرے میں صرف شادی شدہ جوڑے تک محدود ہوتے ہیں۔ جنس کے متعلق مغربی نظریہ یہ ہے کہ ان کی تمام تر مادی ترقی اسی جنسی آزادی کی مرہون منت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ جنس انسانی فطرت میں شامل ہے اور انسانی جذبوں میں سب سے زیادہ طاقت ور ہے۔ اسے دبایا یا روکا نہیں جا سکتا۔ اگر ایسی کوئی کوشش کی جائے تو دماغ ہمہ وقت اس کے متعلق سوچتا رہتا ہے اور کسی کام کا نہیں رہتا۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ جہاں دو تین لڑکے جمع ہوئے وہاں موضوع بحث لڑکی ہوتی ہے اسی طرح لڑکیاں بھی لڑکوں کے بارے میں سوچتی اور باتیں کرتی رہتی ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جو لڑکا یا لڑکی جنس مخالف کے بارے میں ہی سوچتا رہے گا۔ وہ ملک و قوم کی تعمیر کے بارے میں سوچنے یا ریسرچ کرنے کے لئے کہاں سے وقت لائے گا۔ اور اس میں کیا حصہ لے سکے گا۔ اس کا

حل اس قوم نے یہ نکالا کہ جنس کو آزاد کردیا تاکہ اس کی کشش کم ہو جائے اور اس طرف سے مطمئن ہو کر نوجوان نسل ملک وقوم کی ترقی کے بارے میں سوچ سکے اور عمل کر سکے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ معاشرے نے ان لوگوں کو سوچنے سمجھنے اور پلان کرنے کے لئے وہ وقت دے دیا ہے جو پہلے وہ فریق مخالف کے بارے میں سوچنے میں خرچ کرتے تھے۔"

بڑی عجیب وغریب دلیل تھی۔

"اور معاشرے میں جو بگاڑ پیدا ہوتا ہے وہ کس کھاتے میں جاتا ہے۔؟" میں نے پوچھا

حسین صاحب سنجیدگی سے بولے۔

"سچ تو یہ ہے کہ جس چیز سے منع کیا جائے انسانی فطرت اس کو اتنا ہی کریدتی ہے اور اس کی اتنی ہی جستجو کرتی ہے۔ اگر کسی چیز کی اہمیت اسے عام کر کے کم کردی جائے تو جستجو بھی کم ہو جائے گی۔ مزید یہ کہ جس چیز کو آپ بگاڑ کہہ رہے ہیں اسے یہاں منطقی نتیجہ کہہ کر قبول کر لیا جاتا ہے۔ بگاڑ نہیں سمجھا جاتا۔!"

پورے چار بجے دروازے پر دستک ہوئی۔ اور سمینتھا خوشبو کے جھونکے کی طرح کمرے میں داخل ہوئی۔ بنی ٹھنی۔ منی اسکرٹ میں ملبوس بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ بالوں میں سفید پھول اڑس رکھا تھا۔ کانوں میں لمبے کانٹے جھول رہے تھے اور گوری گوری کلائیوں میں سیاہ چوڑیاں چھنچھنا رہی تھیں۔

اسے دیکھ کر میری جان میں جان آئی۔ چند مناسب الفاظ میں علی حسین صاحب اور ان کی بیگم کا شکریہ ادا کیا اور وعدہ کیا کہ نہ صرف خود ان کے لئے دعا کرونگا بلکہ کسی پہنچے ہوئے بزرگ سے بھی دعا کرواؤنگا۔

اس کے ساتھ ہی ہم باہر نکل آئے اور ہمارے ساتھ ہی حسین صاحب کی قیمتی معلومات اور باتیں بھی ساتھ ہی آ گئیں۔ واقعی حسین صاحب نے انگریزی معاشرہ کی جس طرح عکاسی کی۔ شاید ہی کوئی اور کرسکتا۔ میری معلومات میں قیمتی بلکہ قابل قدر اضافہ ہو چکا تھا۔

علی حسین صاحب اور ان کی بیگم ہمیں باہر تک چھوڑنے آئے۔

باہر نکل کر سمینتھا بولی۔ "اگر کوئی خاص پرگرام نہیں تو چلیں آج کی شام ایلیفنٹ اسکوائر (Elephant Square) پر گزاریں۔ بڑا پر رونق مقام ہے۔ ہر شام ہزاروں کی تعداد میں مرد عورتیں اور بچے تفریح کے لئے آتے ہیں۔ لطف رہے گا......"

سامنے سے ہی ہم نے بس پکڑی اور لگ بھگ بیس منٹ بعد ہم ایلیفنٹ اسکوائر جا اترے۔

ایلیفنٹ اسکوائر ایک وسیع وعریض گول سا تفریحی مقام ہے۔ بلاشبہ اس جگہ بڑی رونق تھی جیسے کوئی میلہ لگا ہو۔ ایسا لگتا تھا کہ سارا لندن وہاں جمع ہو گیا ہو۔ گولائی کے مقام پر بنچیں پڑی تھیں جس پر مرد اور عورتیں بیٹھے ہوئے تھے بچے درمیان میں کھیل رہے تھے۔ بالکل وہی منظر تھا جو کلفٹن (کراچی) کے مقام پر ہر شام ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح غبارے چپس۔ کینڈی بیچنے والے گھوم پھر کر سودا بیچ رہے تھے۔ وہی بچے ان پر جھپٹ رہے تھے۔ بھاگ دوڑ رہے تھے۔

ہم دونوں ایک بینچ پر بیٹھ کر تماشا دیکھنے لگے۔ اس پر رونق مقام پر ہم دو تین گھنٹے تک بیٹھے بغیر کسی موضوع کے اوٹ پٹانگ باتیں کرتے رہے۔ باتوں سے زیادہ ایک دوسرے کی صحبت سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ سمینتھا کے ذہن میں جو کچھ آ رہا تھا بے تکان بولے چلی جا رہی تھی۔ میں بھی بیچ بیچ میں ایک آدھ جملہ بول دیتا۔ دراصل میں خالی الذہن ہو رہا تھا۔ کیونکہ حسین صاحب کے المیہ کی وجہ سے ذہن اس قابل ہی نہ رہا تھا کہ اس پر رونق مقام سے لطف اٹھا سکے۔ لوگ آ رہے تھے، لوگ جا رہے تھے۔ زرا دور سے سڑک گزر رہی تھی جس پر ایلیفنٹ اسکوائر کا بس اسٹاپ بھی تھا۔ اس پر ٹریفک کا سیلاب بہا چلا جا رہا تھا لیکن مجھے یہ تمام جگہ خالی خالی لگ رہی تھی۔ ہر جگہ حسین صاحب کا غمگین چہرہ اور ان کی بیگم کی تر آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ بڑے لوگوں کے دکھ بھی بڑے...... حسین صاحب اچھے خاصے مالدار لوگوں میں سے ہیں لیکن جو غم انہیں لگا تھا وہ خدا کسی کو بھی نہ لگائے۔ اتنی ڈھیر ساری دولت کے باوجود وہ ہر لحظہ مر تے تھے۔

تھوڑی دیر بعد سمینتھا کو نہ معلوم کیا سوجھا...... کہنے لگی۔ "آؤ کچھ تفریح کریں۔ دیکھیں کہ لندن میں لندن والے کتنے رہتے ہیں......! لوگوں سے پوچھتے ہیں کہ ایلیفنٹ اسکوائر کہاں ہے۔؟

چنانچہ ہم نے اپنے سامنے آنے والے ہر شخص سے پوچھنا شروع کیا کہ ایلیفنٹ اسکوائر کہاں ہے؟۔ لگ بھگ دس اچھے خاصے پڑھے لکھے حضرات سے دریافت کیا لیکن کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ اسکوائر کہاں ہے حالانکہ وہ اسی اسکوائر پر کھڑے تھے۔ چند حضرات ایسے بھی نکلے جنہوں نے سوال سے زیادہ سوال پوچھنے والی میں دلچسپی لی۔

شام گہری ہو چلی تھی جب میں نے واپسی کا ارادہ کیا تو سمینتھا بس تک چھوڑنے آئی۔

پھر ساتھ ہی بس پر سوار ہوگئی۔ کہنے لگی کہ وکٹوریہ سٹیشن سے واپس چلی جاؤ نگی۔ وکٹوریہ اسٹیشن سے 25 نمبر بس چلنے میں پورے پندرہ منٹ باقی تھے لیکن سمیتھا میرا بازو پکڑے ساتھ چمٹی کھڑی رہی۔ بس آئی تو میں نے مسکرا کر پوچھا۔ اب کیا ایسٹ ہائیم بھی چلنے کا ارادہ ہے تو ہنس پڑی۔ کہنے لگی۔ ''میرا تو جی چاہتا ہے کہ پاکستان تک جاؤں آپ کے ساتھ۔!''

جب تک بس نہ چلی ہم خاموش کھڑے رہے۔ بس کے چلنے سے ایک منٹ قبل جب میں بس پر سوار ہوا تو کہنے لگی ''کل ڈاؤن ٹاؤن پر صبح نو بجے...... میں انتظار کرونگی۔''

''نہیں نہیں صبح ساڑھے دس بجے۔'' میں نے تصحیح کی۔ وہ ہنسنے لگی۔

بس چلی تو اس نے خدا حافظ کہنے کے لئے ہاتھ ہلایا۔ چوڑیاں زور سے چھلکیں۔ کانٹے زور سے ہلے۔ اندھیرے میں سفید سفید بانہیں چمکیں اور پھر تھوڑی دیر بعد اندھیرے میں گم ہوگئیں۔



# سانتا کلاز

اس رات سانتا کلاز سے میری ملاقات ہوئی تھی جو خوشیوں کے تحفوں سے بھرے وزنی تھیلے کو کمر پر لادے خوشیاں بانٹنے اس دنیا میں اتر آئی تھی۔

مجھے لندن آئے ہوئے دوسرا دن تھا اور میں سارے دن کی سیر تفریح بلکہ آوارہ گردی کے بعد تھک ہار کر واپس جا رہا تھا۔

وکٹوریہ اسٹیشن کے بس ڈپو سے جب ہماری بس باہر نکلی تو رات کے دس بج رہے تھے اور غالباً یہ ایسٹ ہائیم جانے والی آخری بس تھی کیونکہ اس کی روانگی سے دو منٹ پہلے ہی ڈپو آفس بند کر دیا گیا تھا۔

بس میں گنتی کے چند مسافر سوار تھے جو سارا دن کی محنت و مشقت کے بعد تھکے ہارے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر اونگھ رہے تھے اور کچھ سو بھی رہے تھے۔ بعض کے سر تو نیند کی حالت میں دائیں بائیں لڑھک رہے تھے۔ بس کے اندر بلب کی دھیمی دھیمی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ باہر اندھیرا تھا۔ فقط نارنجی ٹیوبوں (انگلینڈ میں سفید ٹیوبیں استعمال نہیں ہوتیں) کی روشنی میں سیاہ سڑک چمک رہی تھی۔ کبھی کبھار سامنے سے آنے والی کسی گاڑی کی بتیاں لحہ بھر کے لئے بس میں روشنی کر کے غائب ہو جاتیں یا پھر دکانوں کے نیون سائن جو ساری رات جلتے رہتے ہیں تھوڑی دیر کے لئے چمک دکھا کر غائب ہو جاتے اور پھر اندھیرا چھا جاتا۔ زیادہ تر دکانیں اور بازار بند ہو چکے تھے لہٰذا ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ کبھی کبھار اکا دکا شخص چلتا پھرتا نظر آ جاتا۔

بس خاصی تیزی سے نکلی چلی جا رہی تھی۔ چونکہ اترنے چڑھنے والے بہت کم تھے اس لئے بہت کم اسٹاپوں پر بس رک رہی تھی۔ مسلسل سفر کی وجہ سے بس کے شیشے مسلسل بج رہے تھے اور باڈی کھڑ کھڑا رہی تھی۔ انجن کے شور کا تسلسل بھی نمایاں تھا۔ ان سب نے مل کر ایک آرکسٹرا کا

روپ دھار لیا اور میرے تھکے اعصاب کو تھپکنا شروع کر دیا۔ لحہ بھر کے لئے میری آنکھیں بند ہو گئیں اور اسی لحہ بھر میں وہ نشانیاں بھی نکل گئیں جنہیں دیکھ کر میں اپنے اسٹاپ پر اترنے کے لئے تیار ہو جایا کرتا تھا۔ آنکھیں اس وقت کھلیں جب آرکسٹرا خاموش ہو گیا تو پتہ چلا کہ بس اپنے آخری اسٹاپ یعنی ڈپو پر پہنچ چکی ہے۔ ڈرائیور اور کنڈکٹر لاتعلق سے اتر کر اپنے آفس کے اندر چلے گئے۔ میں بھی بس سے نیچے اتر آیا۔ میرے ساتھ اترنے والی واحد سواری ایک بھاری بھر کم بوڑھی خاتون تھیں جن کے ساتھ ایک بڑا سا بھاری تھیلا تھا۔ بڑی بی نے بس سے اتر کر بھاری بھر کم تھیلا اپنی پشت پر لادا اور اپنی ٹیڑھی ٹانگوں پر جھومتی جھامتی اپنی بھدی چال سے دروازے کی طرف چل پڑیں۔ میں بھی ان کے ساتھ ساتھ ڈپو سے باہر نکل آیا۔

باڑہ نما یہ وسیع وعریض بس ڈپو ایک انتہائی سنسان جگہ پر بنا ہوا تھا۔ باڑے کے اندر ایک چھوٹا سا ایک منزلہ آفس تھا جس پر ایک بلب ٹمٹمارہا تھا جس کی دھندلی روشنی ماحول کو خاصا وحشت ناک بنا رہی تھی۔ خالی جگہوں پر آڑی ترچھی بسیں کھڑی تھیں۔ سامنے خاصے فاصلے پر چار چار منزلہ کئی عمارات خاموشی اور تاریکی میں کھڑی ماحول کو اور بھی خوفناک بنا رہی تھیں۔ ان عمارات میں کہیں کہیں سے روشنی جھانک رہی تھی۔ ایک لحہ کے لئے تو میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ میں کس جگہ آ گیا ہوں کیونکہ یہ میری منزل تو نہیں ہے۔ پھر یکا یک مجھ پر انکشاف ہوا کہ میری منزل تو کہیں پیچھے رہ گئی ہے اور میں بس میں سوتا رہ گیا تھا اور بس مجھے اپنے آخری اسٹاپ یعنی ڈپو تک لے آئی۔ اب مجھے اقبال صاحب کے گھر پہنچنے کے لئے واپس جانا ہوگا۔ کہاں اور کتنا۔ یہ نہیں معلوم۔ راستے کا بھی اندازہ نہیں۔ آگے چلوں۔ دائیں چلوں یا بائیں......؟

اب راستہ کس سے معلوم کیا جائے؟ کوئی ذی روح بھی تو نہیں دکھائی دے رہا۔ سوائے اس بے ڈھنگی چالی والی بوڑھی خاتون کے جو تھیلا کمر پر لادے دائیں بائیں جھومتی چلی جا رہی ہیں۔ لندن کی پولیس کی بڑی تعریف سنی تھی کہ آڑے وقت میں کام آتی ہے۔ اس کا دور دور پتہ نہ تھا۔ یہ سوچ کر مزید پریشان ہو گیا کہ وہ نوٹ بک جس میں اقبال صاحب کے گھر کا پتہ اور ٹیلی فون نمبر تھا وہ صبح روانہ ہوتے وقت گھر پر ہی رہ گئی تھی۔ گویا میرے پاس کوئی بھی ایسی چیز نہ تھی جس کی مدد سے گھر پہنچ سکتا۔ اس سے ذہن میں خطرے کا الارم بجنا شروع ہو گیا کہ سچ مچ میں کسی مصیبت میں گھرنے والا ہوں۔

پھر سوچا کہ کوئی ٹیکسی پکڑ لی جائے لیکن یہ خیال بھی احمقانہ محسوس ہوا۔ اول تو دور دور تک

کوئی ٹیکسی اس ویرانہ میں تھی ہی نہیں اور بغرض محال اگر مل بھی جائے تو اس سے کہوں کیا۔؟ میرے پاس تو پتہ نہیں۔

اس لمحہ مجھ پر یہ خوفناک انکشاف ہوا کہ میں کھو گیا ہوں اور میری مدد کرنے والا بھی کوئی نہیں۔ یہ احساس انتہائی اذیت ناک تھا جس نے میرے اعصاب کو سن کر کے رکھ دیا۔

گھڑی دیکھی تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ سردی تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی۔ میرے کوٹ سویٹر میں سے گزر کر میرے جسم تک پہنچ کر اپنے وجود کا احساس دلا رہی تھی۔ یا خدایا...... اب میں کیا کروں اور کس طرح گھر تک پہنچوں جہاں کچھ لوگ اور ایک نرم گرم بستر میرا منتظر تھا۔ لیکن نہ میرے پاس پتہ تھا۔ نہ ٹیلی فون نمبر تھا اور نہ راستہ معلوم۔ آ جا کے جو گراں قدر معلومات میرے پاس تھیں وہ یہ کہ جس گھر میں میرا قیام تھا وہ جس سڑک پر واقع ہے اس پر پچیس نمبر کی بس چلتی ہے اور ہاں گھر کے سامنے ایک گرجا گھر ہے اور اس کے برابر ایک سکول ہے اور ان دونوں کے بلند مینار سامنے ہی سر اٹھائے کھڑے ہیں اور بس...... ذرا ذہن پر اور زور ڈالنے سے یاد آیا کہ ایک دن اقبال صاحب ذکر کر رہے تھے کہ گھر سے اگلے نکڑ سے بائیں طرف جو سڑک مڑتی ہے اس کے اختتام پر برٹش ریلوے کا اسٹیشن ہے۔ لیکن کیا اتنی معلومات کے سہارے میں گھر تک پہنچ سکتا تھا۔؟

اب ایک ہی راستہ تھا کہ صبح کا انتظار کروں اور جو پہلی پچیس نمبر بس چلے اس پر سوار ہو کر واپس جاؤں اور پھر اپنی نشانیاں تلاش کر کے گھر ڈھونڈوں۔ لیکن پھر یہ مسئلہ سامنے آیا کہ یہ بقیہ رات کہاں گزاروں۔ فٹ پاتھ پر۔؟ اس حالت میں تو پولیس پکڑ کر لے جاتی۔ رات حوالات میں گزارنی پڑتی۔ میرا پاسپورٹ بھی تو گھر پر تھا۔ میرے بیان پر کون یقین کرتا۔ اگر پولیس سے بچ جاتا تو سردی کیا حشر کرتی؟۔ ممکن ہے صبح میری اکڑی ہوئی لاش ہی ملتی۔! پھر میرے میزبان میرے گھر نہ پہنچنے سے کس قدر پریشان ہونگے کہ میں کہاں رہ گیا۔ کسی غنڈے کے ہاتھ تو نہیں لگ گیا۔ انہوں نے تو مجھے پہلے ہی وارننگ دے رکھی تھی کہ شام سے پہلے گھر واپس پہنچ جانا کیونکہ لندن شام کے بعد خطرناک ہو جاتا ہے اور اس میں غنڈے دندنانا شروع کر دیتے ہیں۔

میں جتنا سوچتا جاتا تھا اتنا ہی پریشان اور دہشت زدہ ہوتا جاتا تھا۔ خوف کی ایک سرد لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کرتی جا رہی تھی۔ سردی بھی کچھ زیادہ ہی محسوس ہونے لگی تھی کیونکہ خوف میں سردی زیادہ لگتی ہے۔

میں اس دہشت و ہراس کے عالم میں کھڑا سوچ رہا تھا اور اپنی بے بسی اور بے چارگی پر غور کر کر کے میرا دماغ ماؤف ہو رہا تھا کہ اچانک چُر مر چُر مر کی آواز نے مجھے چونکا دیا جیسے کوئی میری طرف چلا آ رہا ہے۔ دیکھا تو وہی بھدی چال والی بڑی بی اپنا وزنی تھیلا کمر پر لادے میری طرف جھومتی جھامتی چلی آ رہی ہیں۔ اور یہ چر مر چر مر کی آواز ان کے جاگر نما جوتوں سے آ رہی ہے۔ میں خالی خالی نظروں سے ان کی طرف دیکھتا رہا۔ میرے قریب پہنچ کر انہوں نے تھیلا کمر سے اتار کر زمین پر رکھا۔ میرے سامنے کھڑے ہو کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں جن میں اپنائیت اور ہمدردی کی چمک مجھے صاف نظر آئی۔ دونوں ہاتھ کمر پر رکھ لئے ان کے چہرے پر ایک لمبی سی دوستانہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی جیسے کسی بچے کو پیار سے دیکھ رہی ہوں۔ پھر دوستانہ انداز میں بولیں۔

''ہیلو...... ینگ مین۔ آپ بہت پریشان نظر آ رہے ہیں۔ کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتی ہوں۔؟''

ہمدردی کے ان الفاظ نے میرے دل کو بہت سہارا دیا۔ پریشانی خاصی کم ہو گئی لیکن پھر بھی بے بسی سے میں مسکرا دیا۔ ''جی پریشانی کی تو بات ہے ہی...... میں کھو گیا ہوں......؟''

بڑی بی بے تحاشہ ہنس پڑیں اور ان کا قہقہہ سناٹے کو بے طرح توڑ گیا۔ میرا ڈر مزید کم ہو گیا...... بولیں۔

''ارے۔ کھوئے تو بچے جاتے ہیں۔ آپ اتنے بڑے ہو کے کھوئے گئے؟ عجیب بات نہیں کیا۔؟''

میں منمنانے لگا۔ بھئی۔ دیکھئے میں پاکستان سے آیا ہوں اور لندن آئے مجھے تیسرا دن ہے۔ اس میں سے زیادہ عرصہ میں نے ڈاؤن ٹاؤن میں گزارا ہے۔ لندن کے اس حصے میں آنے کا یہ میرا پہلا موقع ہے۔'' میں پریشانی میں بکے جا رہا تھا۔

بڑی بی نے میری بات کاٹ دی۔

''دیکھو۔ خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ نے کس پتہ پر جانا ہے؟''

میں نے کہا...... ''پتہ تو نہیں ہے میرے پاس......!''

بڑی بی بولیں...... ''ٹیلی فون نمبر تو ہو گا آپ کے پاس۔؟''

میں نے بے بسی کے عالم میں کہا...... ''میری نوٹ بک جس میں گھر کا پتہ اور ٹیلی فون نمبر

لکھا ہوا تھا۔ وہ گھر پر ہی رہ گئی۔ اب میرے پاس کچھ بھی نہیں......"

بڑی بی ایک لحظہ کے لئے سوچتی رہیں۔ پھر بولیں......" پتہ پاس نہیں۔ ٹیلی فون نمبر معلوم نہیں۔ خیر کوئی بات نہیں۔ کوئی نشانی تو ہوگی گھر کے آس پاس کی۔ کوئی بڑا اسٹور۔ سپر سٹور۔ بیکری۔ کچھ یاد ہے آپ کو......؟"

میں نے ذہن پر زور دیا۔

"بات یہ ہے کہ جس گھر میں میں ٹھہرا ہوا ہوں وہ اس سڑک پر واقع ہے جس پر پچیس نمبر بس چلتی ہے۔ گھر کے سامنے ایک گرجا گھر ہے اور ایک اسکول ہے جس کے لمبے لمبے مینار دور سے نظر آتے ہیں۔ اور ہاں کہیں قریب ہی ریلوے اسٹیشن بھی واقع ہے۔"

بڑی بی مسکرائیں۔ "ایسٹ ہائیم کا ریلوے اسٹیشن تو یہاں سے لگ بھگ ڈیڑھ دو میل دور واقع ہے۔ اور ہاں یاد آیا۔ روڈن بیری روڈ پر گرجا گھر اور اسکول ساتھ ساتھ واقع ہیں۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ چلو میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ لیکن یہ بتاؤ اگر میں تمہیں اسٹیشن تک پہنچا دوں تو تم کیا گھر تک پہنچ جاؤ گے۔؟"

"ہاں میں کوشش کرونگا...... وہ گھر سے زیادہ دور نہیں۔!" میری جان میں جان آئی۔ تحفظ کے احساس سے میری آنکھیں بھر آئیں۔ بڑی بی تو رحمت کا فرشتہ ثابت ہوئیں۔ اگر وہ میری مدد کو نہ آتیں تو جانے میرا کیا حشر ہوتا۔؟

بڑی بی میری ذہنی حالت بھانپ گئیں۔ پیار سے بولیں۔

"ینگ مین فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اپنے ڈر اور خوف کو یہیں چھوڑ جاؤ۔ اور چلو میرے ساتھ۔!"

یہ کہہ کر بڑی بی نے اپنا وزنی تھیلا اٹھا کر کمر پر لاد لیا۔ اور جھومتی جھامتی میرے آگے آگے چل دیں۔ کچھ دیر ہم خاموش چلتے رہے۔ پھر بڑی بی پلٹ کر بولیں...... "ارے ینگ مین ابھی تک خوفزدہ ہو۔ ارے ہمت کرو...... کوئی بات کرو...... کہ سفر کٹ جائے۔ اچھا...... معلوم ہوتا ہے ینگ مین تم زندگی میں پہلی دفعہ کھویا گیا ہے اس لئے ابھی تک پریشان ہے۔ ارے بھئی اس میں پریشانی کی کیا بات ہے ابھی پہنچ جائیں گے اسٹیشن پر...... پھر تم چلے جانا اپنے گھر...... اچھا چلو...... خوش ہو جاؤ میں وعدہ کرتی ہوں کہ گرجا گھر تک پہنچا دونگی بلکہ تمہارے گھر چھوڑ دونگی...... پتہ ہے اس طرح میں مقدس کرائسٹ کی نیابت کا کام کرونگی جو لوگوں کو اللہ کے گھر تک لائے تھے"۔

بڑی بی مجھ سے بچوں کی طرح باتیں کر رہی تھیں لیکن میں پریشانی کی وجہ سے اس مذاق کی داد نہ دے سکا۔ بڑی بی مسلسل ہنستی اور مذاق کرتی جا رہی تھیں لیکن جب میں بالکل ہی خاموش رہا تو بولیں۔

''ینگ مین اب ہنس بھی دو۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہیں گھر پہنچا کر آؤنگی۔''

میرے دل سے خوف دور ہو چکا تھا۔ میں نے بڑی بی کا جائزہ لیا۔ ساٹھ پینسٹھ کے پیٹے میں تھیں۔ بھاری بھر کم جسم۔ جھریوں سے بھرا چہرہ۔ روشن بڑی بڑی آنکھیں۔ سر پر سفید بالوں کا گچھا۔ ٹیڑھی ٹیڑھی سی ٹانگیں جن کی وجہ سے چلتے ہوئے اوپر کا بدن دائیں بائیں جھولتا تھا۔ کمر پر بھاری تھیلا بھی تو لاد رکھا تھا۔ میرے ساتھ باتیں کرتی چلی جا رہی تھیں۔ کچھ میرے متعلق پوچھ رہی تھیں۔ کچھ اپنے متعلق بتا رہی تھیں۔ اور مجھے یہ سب کچھ بے معنی سا لگ رہا تھا۔

تھوڑی دور چل کر چند عمارتیں سامنے آ گئیں۔ بڑی بی کہنے لگیں کہ آؤ ان عمارات کے اندر بنی گلیوں میں سے ہو کر چلتے ہیں۔ یہ شارٹ کٹ رہے گا۔ چنانچہ ہم عمارات کی پیچ در پیچ گلیوں میں سے ہو کر گزرے۔ عمارات کے اختتام پر کھلا میدان سا آیا تو بڑی بی ایک جگہ تھیلا اتار کر زمین پر بیٹھ گئیں تا کہ دم لے لیں کیونکہ وہ خاصی تھک گئی تھیں۔ میں نے مناسب سمجھا کہ بڑی بی کے متعلق بھی کچھ پوچھ لیا جائے۔ کیونکہ اب تک جو انہوں نے مجھے اپنے متعلق بتایا تھا وہ میرے سر پر سے گزر چکا تھا۔

بڑی بی نے بتایا کہ ان کا خاوند عرصہ ہوا مر چکا ہے۔ ایک بیٹا ہے جو کسی کارخانے میں کام کرتا ہے۔ تنخواہ تھوڑی ہے اس کے باوجود پیتا پلاتا بھی ہے اس لئے گھر پر کچھ نہیں دیتا۔ ماں کے پلے سے کھاتا ہے اور دھڑلے سے ایک لڑکی سے عشق بھی کرتا ہے۔ لڑکی بڑی بی کو پسند نہیں لیکن بیچاری کچھ نہیں کر سکتی۔ بڑی بی خود بیچاری ڈاؤن ٹاؤن کے ایک اسٹور میں کام کرتی ہیں۔ گزارے لائق تنخواہ ملتی ہے صبح کام پر چلی جاتی ہیں رات دس بجے کام سے فارغ ہو کر گیارہ بجے گھر پہنچتی ہیں اور پھر گھر کے کام نپٹاتی ہیں۔

اس موقع پر مجھے یکا یک ایک خیال سوجھا اور میں بڑی بی سے پوچھ ہی بیٹھا۔

''ایک بات بتائیں۔ آج کل دنیا بھر میں خودغرضی اور نفانفسی کا دور ہے۔ آپ کی انگریز قوم تو اس ضمن میں خاصی بدنام ہے۔ یہاں بھائی بھائی کو نہیں پوچھتا۔ لیکن یہ نیکی اور بھلائی جو آپ میرے ساتھ کر رہی ہیں وہ اس ماحول میں بہت عجیب سی نظر آتی ہے۔ اس عمر میں یہ بھاری

تھیلا اٹھائے آپ ایک اجنبی شخص کو رات کے اس سمے اس کے گھر پہنچانے جا رہی ہیں۔اس دور میں اور یہ نیکی......بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔''

بڑی بی نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولیں۔

''ینگ مین......اپنے خیالات کی تصحیح کرلو۔نیکی اور حسن سلوک کسی قوم یا مذہب کی میراث نہیں۔یہ تو اس کی ملکیت ہے جو اسے اپنا لے۔اگر انگریز قوم میں نفسا نفسی اور خودغرضی ہے تو اس کی پاداش میں وہ دلی سکون سے محروم بھی تو ہے۔رہی بات پوری انگریز قوم کی تو میں اس سے متفق نہیں۔دنیا میں دوسروں سے ہمدردی کرنے اور ان کے دکھ درد میں شریک ہونے والے ہمیشہ رہے ہیں اور رہیں گے۔دنیا ان سے کبھی خالی نہیں ہوئی۔انگریزوں میں بھی ہزاروں لوگ ایسے ہیں جو دوسری قوموں کے دکھ درد پر تڑپ اٹھتے ہیں۔یہ دوسری بات ہے کہ کبھی ان کی تعداد زیادہ ہو جاتی ہے اور کبھی کم۔لیکن ختم کبھی نہیں ہوتی۔اور یہی چیز ہے جو ہمیں ہر مذہب سکھاتا ہے۔دنیا کا ہر مذہب انسانوں سے محبت کرنا سکھاتا ہے۔اور جو نہیں سکھاتا وہ سچا مذہب نہیں۔اس لحاظ سے دنیا بھر کے پیغمبروں کا ایک ہی پیغام رہا ہے۔انسانیت اور سچائی۔پھر دیکھ لو مقدس جیسز (حضرت عیسیٰ) نے بھی تو انسانیت کی خاطر جان دے دی اس سے بڑھ کر انسانیت کی اور کیا خدمت ہو سکتی ہے۔؟اور یہی میرا مذہب ہے۔''

اپنا مذہب بتا کے بڑی بی کچھ دیر چپ رہیں اور میں خاموشی سے ان کا منہ تکتا رہا۔ پھر بولیں۔

''ینگ مین......تم خود آزما کے دیکھو......انسانیت بلکہ انسانوں کی خدمت میں جو لطف و لذت خداتعالیٰ نے رکھی ہے وہ دنیا کے کسی اور کام میں نہیں۔کسی کی مدد کر کے دیکھو۔خود تمہارا اپنا دل خوشی سے لبریز ہو جائے گا۔کسی بے بس اور بے چارہ کی مدد کر کے دیکھو۔تمہاری روح تک لذت سے سرشار ہو جائیگی۔کسی کو تحفہ دے کے دیکھو وہ کتنا خوش ہوگا اور اس کی خوشی کو دیکھ کر خود تمہیں بھی خوشی ہوگی......کسی کی انا کو تسکین پہنچا کے دیکھو خود تمہاری انا کو تسکین پہنچے گی۔کسی روٹھے ہوئے دوست کو جا کے مناؤ تو سہی۔وہ تو خوش ہوگا سو ہوگا۔خود تمہیں بھی خوشی ہوگی......کسی بیمار کی تیمارداری کر کے دیکھو۔کسی بھولے بھٹکے کو گھر پہنچا کے تو دیکھو......تمہیں خود کتنی خوشی ہوتی ہے۔یہ تو سراسر خوشی کا سودا ہے۔کر کے تو دیکھو......ینگ مین......میری بات یاد رکھو......اگر ابدی خوشی و مسرت چاہتے ہو تو دوسرے انسانوں کی خدمت کرو۔ان کو خوش کرو۔تم خودبخود خوش ہو جاؤ

گے۔انسانوں کی خدمت سے بڑھ کر کوئی خوشی نہیں ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی عبادت نہیں۔چلو اب چلیں۔دیر ہو رہی ہے۔

ہم دونوں پھر چل پڑے اور مسلسل آدھ گھنٹہ تک چلتے رہے۔اس کے بعد ایک جگہ رکے تو بڑی بی نے تھیلا زمین پر رکھا اور ایک چھوٹی سی ایک منزلہ عمارت کی طرف اشارہ کر کے کہا......

''ینگ مین......وہ رہا تمہارا ریلوے اسٹیشن۔اب بتاؤ یہاں سے کہاں جانا ہے۔؟''

اس اسٹیشن کو دیکھتے ہی تحفظ کی ایک لہر میرے سارے جسم میں دوڑ گئی۔یہاں سے گھر قریب ہی تھا۔بس سڑک کے اختتام پر دائیں مڑنا تھا۔پھر تھوڑی دور وہ گھر واقع تھا جہاں میں سوچ رہا تھا کہ کبھی بھی نہ پہنچ سکونگا۔اب میں آگے آگے تھا اور بڑی بی پیچھے پیچھے......بڑی سڑک پر پہنچے تو سامنے ہی گرجا گھر اور اسکول کے بلند مینار دکھائی دے گئے جنہیں دیکھ کر میں خوشی سے پاگل سا ہو گیا......کہ خدایا تیرا شکر ہے میں آخر کار گھر پہنچ گیا اب مجھے رات فٹ پاتھ یا حوالات میں نہیں گزارنی پڑے گی۔

میں نے گھڑی دیکھی۔رات کے بارہ بج رہے تھے۔ہر طرف ہو حق کا عالم تھا۔نہ کوئی ٹریفک تھی نہ ہی کوئی آدمی نظر آ رہا تھا۔میں نے بڑی بی سے پوچھا کہ مجھے رخصت کر کے وہ خود کہاں جائینگی تو انہوں نے کمال بے نیازی سے جواب دیا کہ ایسٹ ہائیم کے بس ڈپو۔جہاں سے ہم چلے تھے۔اس سے بھی لگ بھگ آدھ میل آگے ایک چھوٹی سی اضافی بستی ہے اس میں جائینگی میرے رونگٹے سے کھڑے ہو گئے کہ بڑی بی اس وزنی تھیلے کو کمر پر لاد کر پھر دوبارہ دو ڈھائی میل پیدل چل کر گھر پہنچیں گی۔

بڑی بی نے مجھ سے رخصت چاہی۔

''ینگ مین......اچھا اب گھر پہنچ گئے ہو جاؤ آرام کرو۔میں چلتی ہوں۔مجھے دیر ہو رہی ہے۔میرا بیٹا میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ابھی گھر جا کے کھانا تیار بھی کرنا ہے اور کھانا بھی ہے۔اس لئے اجازت دو......''

میں نے بڑی بی کا بڑھا ہوا ہاتھ عقیدت سے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور کہا......

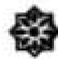
''بہت بہت شکریہ آپ کا......آپ نہ ملتیں تو آج نہ جانے میرے ساتھ کیا کچھ ہو جاتا۔میں تو مرتے دم تک آپ کا احسان نہ بھولونگا۔ایک بات بتائیں۔اتنا بوجھ اٹھا کے آپ کس طرح دو ڈھائی میل جائینگی۔؟''

بڑی بی مسکرادی۔ کہنے لگیں...... ''میری فکر چھوڑو...... میں تو چلی ہی جاؤنگی۔ مجھے تو خوشی اس بات کی ہے کہ میری وجہ سے ایک آدمی بہت سی تکالیف سے بچ گیا اور میں ایک گم کردہ راہگیر کو اس کی منزل مقصود تک پہنچا کر جا رہی ہوں جیسا کہ حضرت عیسیٰ نے کیا تھا۔ لیکن تم ایک مہربانی کرو۔ مجھ سے میری یہ خوشی میرا شکریہ ادا کر کے مت چھینو۔ مجھے تم بس اب یہ بتادو کہ پہنچ جاؤ گے اپنے گھر۔؟ پھر تو راستہ نہیں بھولو گے؟''

''ہاں...... وہ رہا سامنے میرا گھر۔؟'' میں نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔

اس ہی چوڑی سڑک پر ہم دونوں تنہا کھڑے تھے۔ بڑی بی نے ہاتھ ملا کے مجھے خدا حافظ کہا۔ بھاری تھیلا کندھے پر سے گھما کر پیٹھ پر لادا۔ مسکرا کے مجھے دیکھا۔ ہاتھ ہلایا اور جھومتی جھامتی واپس چلیں۔

میں گنگ کھڑا اپنی اس اجنبی محسنہ کو خراماں خراماں۔ بلکہ دائیں بائیں جھومتے جھامتے جاتے دیکھتا رہا۔ وہی چال جو مجھے بھدی اور بے ڈول دکھائی دیتی تھی۔ اب بہت پیاری لگ رہی تھی۔ میں انہیں دیکھتا رہا۔ سر پر سفید بالوں کا گچھا پیٹھ پر بڑا سا تھیلا۔ پاؤں میں جوگر کے بوٹ۔ کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ پچیس دسمبر کرسمس کی رات ہے اور اس مقدس رات میں سانتاں کلاز...... خوشیوں کے تحفوں سے بھرا تھیلا لئے آسمان سے اتر آئی ہے اور مجھے میرے حصے کی خوشیاں دے کر دور کھڑی اپنی بارہ سنگھوں کی بگھی کی طرف رواں دواں ہے۔ جن کے سینگوں پر چاندی کی گھنٹیاں بندھی ٹنٹنا رہی ہیں۔



# تیسرا دن

اگلی صبح نرم گرم اور خوشگوار سی تھی اور جب میں پچیس نمبر کی بس کی اوپر والی منزل پر بیٹھا ڈاؤن ٹاؤن کی طرف اڑا چلا جا رہا تھا تو تیز ہوا کی وجہ سے جہاں مجھے خنکی سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہاں اردگرد کے جانے پہچانے مناظر کو دیکھ دیکھ کر ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ہمیشہ سے ہی لندن میں رہ رہا ہوں' اور میں نے اس کی تمام چیزیں' جگہیں وغیرہ دیکھ رکھی ہیں اور اب اس بے تحاشہ بڑے شہر میں میرے لئے کوئی انوکھی' اچنبھا پیدا کرنے والی نئی چیز نہیں رہی۔ وہی بڑے شہروں کا سا بے ہنگم پھیلاؤ' وہی انسانی مسائل کا انبار جو زائد آبادیوں والی بستیوں میں پائے جاتے ہیں' یہاں موجود ہیں۔ وہی مرد مرد کا جھگڑا وہی عورت کا عورت سے جھگڑا' وہی انسانی طبقات جن میں انسان نے انسانوں کو بانٹ رکھا ہے اور ان طبقات کے بھی وہ مسائل جو ہمارے ملک میں بھی پائے جاتے ہیں' یہاں بھی اسی طرح موجود ہیں۔ میں نے اپنا جائزہ لینا شروع کیا کہ مجھے لندن کے قیام کے دوران کتنے تجربات ہوئے لیکن ان میں کون سی چیز نئی تھی۔ پتہ چلا کہ کچھ بھی نہیں' سوائے سنہرے بالوں اور گورے رنگ کے جو زیادہ ہے۔ سنہرے بال تو ہمارے یہاں ناپید ہیں' ہاں گورا رنگ تو ہمارے یہاں بھی وافر پایا جاتا ہے۔

پھر یک دم خیال آیا کہ میں لندن میں تین دن سے گھوم پھر رہا ہوں لیکن ابھی تک پاکستانی سفارت خانے نہیں گیا' جہاں میرے کئی دوست اور واقف کار کام کر رہے ہیں اور ان کا پرزور اصرار تھا کہ کبھی لندن آؤں تو ان سے ضرور ملوں۔ سو کیوں نہ لگے ہاتھوں سفارت خانہ بھی دیکھ لیا جائے اور بھولے بسرے دوستوں سے ملاقات بھی کر لی جائے اور ہاں سمینتھا کی ماں نے بھی ایک بھاری ذمہ داری میرے سپرد کی تھی' اس کو بھی پورا کر دیا جائے۔ اسکے ساتھ ہی میں نے دل ہی دل میں ایسے مناسب الفاظ اور جملے سوچنے بلکہ منتخب کرنے شروع کئے جن کے ذریعے میں انہیں ارشد کے متعلق اس انداز میں بتا سکوں کہ ان کے جذبات کو ٹھیس یا مایوسی بھی نہ ہو اور

پاکستانیوں کا بھرم بھی رہ جائے۔

ان ہی خیالات میں گُم تھا کہ بس اس سٹاپ پر پہنچ گئی جہاں سے بائیں مڑ کر سڑک وکٹوریہ اسٹیشن چلی جاتی ہے۔ بس سے اتر کر پکاڈلی سرکس کی طرف چل پڑا۔ راستہ میں وہی بڑا سپر سٹور آیا جہاں دو دن قبل میں نے برطانوی شہزادے اینڈریو کو اپنی گرل فرینڈز کے ساتھ داخل ہوتے دیکھا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں اندر چلا گیا کہ میں بھی کیا اس شہزادے سے کم ہوں؟ یہ سپر اسٹور کیا تھا' ایک شاندار چار منزلہ عمارت تھی اور ہر منزل پر مختلف چیزوں کے بڑے بڑے بازار سجے ہوئے تھے۔ ہر منزل پر پہنچنے کے لئے خودکار سیڑھیاں کام کر رہی تھیں۔ عمدہ اور قیمتی اشیاء سے بھرا ہوا ایک جہاں آباد تھا۔ سوئی سے لے کر کارتک ہر چیز دستیاب تھی۔ میرے پاس زیادہ وقت نہ تھا ورنہ پوری تفصیل سے دیکھنے کے لئے تو پورا دن بھی کافی نہ تھا۔ میں نے فقط نچلی منزل کا ہی جائزہ لیا۔ دائیں کونے میں گھڑیوں کا اسٹال تھا جہاں برطانوی جاپانی' سوئس لاتعداد گھڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ میں کافی دیر تک کنکھوں کی طرح کھڑا ان گھڑیوں کو دیکھتا رہا۔ ان گھڑیوں کے ڈھیر میں سے مجھے ایک ننھی منی انتہائی خوبصورت سنہری لیڈیز گھڑی پسند آ گئی جس پر ایک خوبصورت تاج بنا ہوا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی دس پونڈ میں خرید لی کہ بیوی کے لئے تحفہ اچھا رہے گا۔ چلنے ہی والا تھا کہ سنہری بالوں' نیلی آنکھوں' سیب کے گالوں والی سمارٹ سی سیلز گرل نے پہلی سے بھی زیادہ خوبصورت گھڑی سامنے رکھ دی اور اتنی تعریف کی اتنی تعریف کی کہ گھڑی کی خوبصورتی سے زیادہ سیلز گرل کے حسن اور انداز بیاں سے متاثر ہو کر گھڑی خرید ہی ڈالی۔ دونوں گھڑیاں جیب میں ڈال جلدی سے اسٹور سے باہر نکل آیا کہ کہیں کچھ اور نہ پسند آ جائے کیونکہ سیلز گرل زیادہ ہی خوب صورت اور چرب زبان تھی اور میری جیب مزید خریداری کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔

پکاڈلی سرکس پہنچا تو سوا دس بج رہے تھے اور سمینتھا ابھی تک نہیں آئی تھی۔ میں ایک بینچ پر بیٹھ گیا اور نظارہ اہل کرم دیکھنے لگا۔ لوگوں کا تو ہجوم تھا ہی جو نرم گرم دھوپ کا لطف اٹھا رہے تھے' کبوتروں کے غول کے غول بھی فضا میں بلند ہو کر زمین پر بیٹھ رہے تھے' لوگوں کے کندھوں اور ہاتھوں پر بیٹھ رہے تھے اور ان کے ہاتھوں سے دانے چگ رہے تھے۔ سینکڑوں کی تعداد میں کبوتر اہل لندن سے بہت مانوس ہیں اور اہل لندن انہیں دانہ کھلاتے ہیں اور وہ انہیں نقصان نہیں پہنچاتے اور ظاہر ہے کہ محبت کا جواب محبت سے ہی ملتا ہے۔

فوارے کے گرد گرم جوش عشاق کا آج بھی ہجوم تھا اور فوارے کے عین اوپر نصب ہوا میں اڑتا ہوا کیوپڈ ابھی تک کمان میں تیر لگائے کسی صاحب دل عاشق کی تلاش میں سرگرداں تھا' تا کہ اس کے دل کا شکار کر کے اسے کسی دوسرے دل کے ساتھ چھید سکے۔ کیوپڈ دراصل یونانی دیو مالا میں عشق و محبت کا دیوتا کہلاتا ہے جس کا کام ہی عاشق و معشوق کو اپنے ننھے منے تیر سے چھید کر ایک کرنا ہے۔ بچوں کی سی معصوم شکل اور بچوں کے جیسے قد و قامت والا یہ ننھا منا خوبصورت دیوتا خود بھی سائیکی نامی دیوی کے تیر کا گھائل تھا جو حسن و عشق کی دیوی کہلاتی ہے' یہی وجہ ہے کہ پکاڈلی سرکس پر عشاق کا اتنا ہجوم رہتا ہے' کیونکہ کیوپڈ کے حوالے سے یہ چوک اور فوارہ عشاق کا ہی تو مرکز ہے۔

دراصل زمانہ قدیم میں جب یونانیوں نے اپنا نظام عبودیت قائم کیا تو اس مقصد کے لئے انہوں نے بے شمار دیوتا تخلیق کر ڈالے اور دنیا کی ہر چیز حتیٰ کہ جذبات کے دیوتا بھی بنا ڈالے اور ہر دیوتا کے ساتھ طرح طرح کی حیرت انگیز اور دلچسپ کہانیاں منسوب کر ڈالیں' جیسے ہندوستان میں ہندو کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ نفرت و حسد کا دیوتا بھی بنا ڈالا اور آگ اور بارش کا بھی۔

میں ابھی کیوپڈ کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ نامعلوم کہاں سے ایک دم سمیتھا آن پہنچی۔ آج وہ اکیلی نہیں تھی' اس کے ساتھ دو لڑکیاں اور بھی تھیں۔ انہیں دیکھ کر میں تعظیماً کھڑا ہو گیا۔ بنیادی طور پر پاکستانی جو تھا۔

''ہیلو!'' سمیتھا شوخی سے بولی ''ان سے ملئے یہ میری گہری سہیلیاں اور کلاس فیلو ہیں۔ یہ پیٹریشیا اور یہ کیتھرائین ہے۔ آپ ان سے ٹرین میں مل چکے ہیں۔''

پھر ان سے مخاطب ہو کر بولی ''یہ میرے پاکستانی مہمان ہیں اور میں ان کی بلا معاوضہ گائیڈ!''

اخلاقاً میں نے بھی ہیلو کہہ دیا اور ہاتھ بھی ملایا لیکن قطعی طور پر یاد نہیں آیا کہ یہ دونوں کون ہیں۔ پیٹریشیا چھوٹے قد کی شوخ لڑکی تھی۔ بُرا سا منہ بنا کے بولی۔

''ٹرین میں سارا وقت آپ سمیتھا کی طرف دیکھتے رہے۔ میں تو کونے میں بیٹھی آئس کریم کھاتی رہی' آپ نے میری طرف تو دیکھا ہی نہیں۔ مجھے معلوم ہے سمیتھا مجھ سے زیادہ سمارٹ اور خوب صورت ہے' پھر بھلا آپ میری طرف کیوں دیکھتے؟''

اس پر کیتھرائین بھی بول پڑی۔

''میں تو سمینتھا کے دائیں جانب کھڑی تھی' پھر بھی آپ نے مجھے نہیں پہچانا!''

''مجھے افسوس ہے کہ میرا ذہن آپ کو یاد نہیں رکھ سکا۔'' میں نے معذرت چاہی۔

کیتھرائین پہلے تو رازدارانہ طور پر مسکرائی' پھر شوخ لہجے میں بولی۔

''یہ کم بخت سمینتھا ہماری کلاس کی سب سے زیادہ خوبصورت لڑکی ہے' بلکہ ملکہ حسن ہے۔ اس سے بچ کر رہیے گا لیکن خیر اس سے تو ہم لڑکیاں نہیں بچ سکیں تو مرد کیا بچ سکیں گے...... لیکن آپ ہوشیار رہیے گا۔ یہ آپ کے خلاف بڑے بڑے پلان بنا رہی ہے!''

''مثلاً؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

کیتھرائین کچھ کہنے کو ہی تھی کہ سمینتھا اس پر برس پڑی۔

''کیتھرائین کبھی تو عقل سے کام لیا کرو۔ ہر ایک سے بلاوجہ بے تکلف نہ ہو جایا کرو اور نہ ہی بے پر کی اڑایا کرو! تمہاری ایسی ہی بے تکی باتوں پر کئی دفعہ میرا تمہارا جھگڑا ہو چکا ہے۔ اچھا چلو۔ اب تم دونوں دفع ہو جاؤ۔ تم دونوں نے وعدہ کیا تھا کہ میرے پاکستانی مہمان کو بس ہیلو کہو گی اور شرافت سے چلی جاؤ گی۔''

پیٹریشیا اور کیتھرائین ہنستی ہوئی آکسفورڈ اسٹریٹ کی طرف چل دیں۔ سمینتھا ہنسنے لگی۔ معاً دونوں نے مڑ کر دیکھا اور ہاتھ ہلایا۔ سمینتھا نے بھی ہاتھ ہلا کر ایک ہوائی بوسہ اچھال دیا کہ بس اب دفع ہو جاؤ۔

پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''یہ دونوں ہیں تو چھوٹی عمر کی لیکن ہیں بڑی رومان پرور۔ ہر وقت بس رومانس کی تلاش میں رہتی ہیں۔ کئی کئی لڑکوں سے بیک وقت عشق لڑاتی ہیں اور ذرا نہیں جھجکتیں۔ کہتی ہیں کہ زندگی کا لطف اٹھا رہی ہیں۔ اب بھی کسی بوائے فرینڈ سے اکٹھی ملنے گئی ہیں...... کل سے میرے پیچھے پڑی ہوئی تھیں کہ اپنے پاکستانی مہمان سے ملواؤ۔ وعدہ کرتی تھیں کہ صرف ہیلو کہیں گی اور چلی آئیں گی۔ اب دیکھیں کس طرح آپ سے دوستی بگھارنے لگی تھیں۔ بہت شریر ہیں۔''

جب پیٹریشیا اور کیتھرائین نظروں سے اوجھل ہو گئیں تو سمینتھا مجھے پوچھنے لگی۔

''آج کا کیا پروگرام ہے؟''

''سب سے پہلے تو پاکستانی سفارت خانے چلیں گے۔ وہاں میرے کچھ دوست کام کرتے ہیں۔ شاید لنچ کا پروگرام وہیں بن جائے۔ اس کے بعد تمہاری ممی سے ملنے چلیں گے۔

اس کے بعد مکمل طور پر تمہارے سپرد ہونگا جہاں بھی چاہے لے جانا۔''

سمینتھا نے مجھے گہری نظروں سے دیکھا۔

''اچھا تو نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے دو چار ملاقاتوں میں...... کہ آپ اپنا آپ ہی میرے سپرد کر رہے ہیں اتنی جلدی نہ کیجئے۔ سوچ سمجھ کر فیصلہ کیجئے۔ کہیں پچھتانا نہ پڑے۔''

میں ہنسا۔

''بھئی...... میں نے تو تمہیں اپنا گائیڈ بنا کے اپنا آپ اسی دن تمہارے سپرد کر دیا تھا جس دن ہم پہلی بار ٹرین پر ملے تھے اور کیا تم نے قبول نہیں کیا تھا؟''

سمینتھا بے تحاشہ ہنس پڑی۔

''کسی غلط فہمی میں نہ رہنا۔ میں نے فقط گائیڈ بننا قبول کیا تھا اور وہ بھی اعزازی بس!۔ آپ تو باتوں ہی باتوں میں پائچا پکڑتے پکڑتے دامن ہی پکڑنے لگے۔ آپ سے تو بحث کرنا ہی مشکل ہے۔ آیئے اب چلیں۔''

''ایک منٹ ٹھہرو۔'' میں نے کہا۔ ''آج میں تمہارے لئے کچھ لایا ہوں۔ ایک خوبصورت سا تحفہ!''

''بتاؤ کیا ہے؟''

سمینتھا چلتے چلتے رک گئی۔ یکدم اس کے رخسار گلابی ہو گئے اور آنکھوں سے شعائیں سی پھوٹ پڑیں۔ انتہائی اشتیاق سے بولی۔

''آج آپ پھر کچھ لے آئے میرے لئے؟ کتنے اچھے ہیں آپ؟ کتنا خیال کرتے ہیں آپ میرا۔ اسی لئے میں بھی آپ کو بہت زیادہ چاہنے لگی ہوں!''

یہ آخری جملہ انگریز سوسائٹی میں بالکل عام سا ہے اور وہ خطرناک معنی قطعی نہیں رکھتا جو ہمارے یہاں لئے جاتے ہیں۔ یہ تعریف محض کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے کسی غلط فہمی کی گنجائش نہیں ہوتی!

میں نے اسے گھڑی پہنا دی تو وہ اس گھڑی کو دیکھتی رہ گئی۔ کبھی مجھے دیکھتی کبھی گھڑی کو...... پھر اس نے گھڑی کو رخسار سے لگا لیا' پھر ننھے بچوں کی طرح اسے کان سے لگا کر اس کی ٹک ٹک سننے لگی' پھر میری طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں جگمگا رہی تھیں...... یکایک اس نے میرا دایاں ہاتھ تھام کر اسے بوسہ دیا اور پھر گال سے لگا کر بولی۔

''آپ بہت ہی اچھے ہیں۔ آپ نے کئی پرانی بلکہ بھولی بسری خوشگوار یادیں تازہ کر دیں۔ آیئے اب چلیں۔''

یہ کہہ کر سمینتھا نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں ڈال دیا اور ہم دونوں آکسفورڈ اسٹریٹ کی طرف چل دیئے۔ میں سمینتھا کے بے پناہ پیار کے سیلاب میں بہا چلا جا رہا تھا اور وہ مجھ سے بے پرواہ میرا ہاتھ تھامے بلکہ مجھے گھسیٹے لئے جا رہی تھی۔ آکسفورڈ اسٹریٹ پر حسب معمول لوگوں کا اژدہام تھا۔ بے شمار لوگ تیزی سے چلتے ہوئے ادھر سے اُدھر جا رہے تھے۔ عورتیں مرد بچے سب ہی حرکت میں تھے۔ نہ جانے کیوں میری نظریں اس حرکت پر غور کرنے لگیں تو یکدم مجھے محسوس ہوا جیسے ان کی حرکت میں کوئی بے ڈھنگا پن نہیں۔ ایک ردھم یعنی نظم وضبط کی سی کیفیت ہے' بلکہ ایک رقص نما کیفیت ہے اور اس میں ہر شخص اپنے حصہ کے مطابق رقص کر رہا ہے۔ میں اس کیفیت پر غور کر رہا تھا اور سمینتھا میرا ہاتھ تھامے مجھے اس ہجوم میں سے اس طرح نکالے لئے جا رہی تھی جیسے کسی بچے کو......اور میں مدہوش سا ساتھ چلا جا رہا تھا۔

خدا خدا کر کے آکسفورڈ اسٹریٹ ختم ہوئی اور ہجوم سے نجات ملی اور ہم ماربل آرچ کی طرف جا نکلے۔ سمینتھا نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ یکا یک میری اضطراری کیفیت ختم ہوگئی اور میں اپنے آپ میں آ گیا۔ ماربل آرچ نسبتاً پرسکون تھا' چنانچہ ہم مزے مزے سے ٹہلتے ٹہلاتے ہائیڈ پارک جا نکلے۔ یہاں سے پاکستانی سفارت خانے کا پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ سامنے ہی شاہراہ سے ذرا ہٹ کر ایک گلی کے اندر دو بلند و بالا عمارتوں میں واقع ہے۔ دو قدم ہی بڑھے تھے کہ سبز سفید ہلالی پرچم بڑی شان وشوکت سے لہراتا نظر آ گیا۔ دیارِ غیر میں اپنا قومی پرچم دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ سچی بات یہ ہے کہ اپنے وطن میں اپنا پرچم اس قدر خوبصورت کبھی نہ لگا تھا جتنا لندن میں۔

پاکستانی سفارت خانہ ہائیڈ پارک سے اتنا نزدیک ہے کہ دوپہر کے کھانے کے وقفہ میں پاکستانی سفارت خانے کے ملازمین وہاں جا کر بیٹھا کرتے ہیں۔

سفارتخانہ کے باہر باقاعدہ باوردی چوکیدار کھڑے تھے اور خاصا بڑا بورڈ بھی لٹک رہا تھا لیکن دروازے پوری طرح بند تھے بلکہ اندر سے تالے لگے ہوئے تھے۔ دروازے پر سیکورٹی مائیکروفون لگا ہوا تھا۔ لاعلمی کی بنا پر اور پاکستانی طریقہ کے مطابق جب میں نے دروازہ پر دستک دی کہ ''کھولو......ایک معزز پاکستانی مہمان اپنے گھر پر آیا ہے۔'' تو دروازہ تو نہ کھلا البتہ مائیکروفون پر ایک خاتون نے باقاعدہ پوچھ گچھ شروع کر دی۔ نام پتہ سب کچھ پوچھا' جب اسے معلوم ہوا کہ

میں اسلام آباد پاکستان سے آیا ہوں۔ اعلیٰ سرکاری افسر ہوں اور تعلیمی اتاشی جناب نظامانی صاحب سے ملنا چاہتا ہوں......تو خاتون کی آواز میں خاصی ملائمت آ گئی' لیکن دروازہ پھر بھی نہ کھلا۔ البتہ یہ ہدایت ضرور ملی کہ میں برابر والی عمارت کے دروازے پر جاؤں جہاں میرے پہنچنے پر دروازہ کھول دیا جائے گا اور نظامانی صاحب وہیں ملیں گے اور واقعی جب ہم دوسری عمارت کے دروازے پر پہنچے تو نہ صرف دروازہ کھلا ہوا ملا بلکہ ایک باوردی شخص استقبال کے لئے بھی موجود تھا۔ وہ شخص ہمیں استقبالیہ پر لے گیا جہاں سے نظامانی صاحب کو اطلاع دی گئی کہ ایک معزز سرکاری افسر اسلام آباد سے انہیں ملنے آئے ہیں۔

میں مسکرانے کے سوا کیا کر سکتا تھا۔

نظامانی صاحب بہت بے تکلف دوستوں میں سے تو نہیں تھے البتہ شناسائی اچھی خاصی تھی۔ پھر دیارِ غیر میں جہاں آنکھیں ہر وقت ہی اپنے کسی ہم وطن کو ڈھونڈتی رہیں تو معمولی سی شناسائی بھی زبردست اور گہری دوستی میں بدل جاتی ہے۔ نظامانی صاحب کو جب اطلاع ملی تو وہ اپنے سٹینو کو املا کرا رہے تھے۔ اسے چھوڑ چھاڑ کر کھلی راہوں سے لپکتے ہوئے استقبالیہ پر آن پہنچے۔ ایک اچٹتی ہوئی نظر سمینتھا پر ڈالی......ایک لمحے کیلئے جھجکے اور پھر گہری بے تکلفی سے مجھ سے بغل گیر ہو گئے۔ کمر میں ہاتھ ڈال کر اپنے سجے سجائے کمرے میں لے گئے۔ سمینتھا بے چاری خود ہی پیچھے چلتی چلی آئی۔ کمرے میں نظامانی صاحب کا اسٹینو ان کا منتظر تھا۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر احتراماً کھڑا ہو گیا۔ یہ لڑکا کسی زمانے میں میرا بھی اسٹینو رہ چکا تھا اور اس کی ترقی میں میرا ہاتھ بھی تھا۔ میری آمد کی خبر سن کر اسٹاف کے دو چار آدمی جمع ہو گئے......یہ سب بھی میرے واقف نکلے۔ دو چار افسران بھی آ گئے۔ ہر شخص گلے ملا۔ اس واقفیت نے مجھے بارات کا دولہا بنا کر رکھ دیا۔ سمینتھا ایک طرف انجان بنی اور سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ اسے کوئی بھی لفٹ نہیں دے رہا تھا' جب خوش آمدید کی طوفان ذرا تھما تو میں نے مناسب الفاظ میں سمینتھا کا تعارف کرایا۔ اس پر ایک دفعہ پھر شور اٹھا اور سمینتھا سے ہاتھ ملائے گئے......اسے پر تکلف صوفے پر بٹھایا گیا۔ چائے بسکٹ منگوائے گئے۔ سمینتھا یہ دیکھ دیکھ کر حیران اور سراسیمہ ہو رہی تھی۔ کیونکہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ جس شخص کے ساتھ وہ اتنی بے تکلفی سے پچھلے تین دن سے گھوم رہی ہے بلکہ جسے گھما رہی ہے وہ وزارت تعلیم، حکومت پاکستان کا اعلیٰ افسر ہے۔ یہ پتہ چلنے پر شاید وہ اپنی قسمت پر ناز کرنے لگی ہو۔

نظامانی صاحب کی تجویز پر آفس کے عملے اور میرے جان پہچان کے لوگوں نے دوپہر

کے کھانے کا پر تکلف اہتمام کیا اور خاصا پر تکلف کھانا کھلوایا۔ دو گھنٹے سے زائد یہ پر جوش محفل جاری رہی۔ ظاہر ہے کہ سمینتھا اس سے بہت متاثر ہوئی۔ جب میں نے چلنے کا ارادہ ظاہر کیا تو ایک اسٹینو اور ایک اسسٹنٹ صاحبان اپنے اپنے کیس لے کر میرے پاس آ گئے اور درخواست کرنے لگے کہ واپس اسلام آباد پہنچ کر میں ان کے تبادلے کے لئے کوشش کروں کیونکہ وہ اپنے ساتھیوں کے ہاتھوں خاصے تنگ تھے۔ میں نے وعدہ تو کر لیا' لیکن جانتا تھا کہ یہ لوگ اپنی عادت سے مجبور ہیں' جہاں بھی رہیں گے لڑتے جھگڑتے رہیں گے۔

جب سفارتخانے سے رخصت ہونے لگے تو پتہ چلا کہ جناب نظامانی صاحب نے اپنے پردیسی مہمان کے لئے سرکاری گاڑی کا انتظام کیا ہے جس پر باوردی ڈرائیور متعین تھا۔ اس لمبی چوڑی گاڑی اور باوردی شوفر کو دیکھ کر سمینتھا ایک دفعہ تو سہم ہی گئی۔

سمینتھا کی رہنمائی میں ہم اس گاڑی پر اس کے گھر پہنچے تو اس کی امی گھر آ چکی تھیں اور سمینتھا کا انتظار کر رہی تھیں۔ مجھے ساتھ دیکھ کر یکدم کھل اٹھیں۔

''مجھے آپ کا بہت انتظار تھا اور مجھے پورا یقین تھا کہ آپ آج ضرور آئیں گے۔'' وہ بولیں۔ میں نے پوچھا۔ ''وہ کیسے؟ میں نے تو وعدہ نہیں کیا تھا۔''

سمینتھا کی امی بولیں۔

''جس شخص کے متعلق اس گھر میں اتنی باتیں ہوتی ہیں۔ اس کے متعلق اندازہ تو ہو ہی جاتا ہے۔ یقین جانو' مجھے قطعی طور پر علم تھا کہ آپ آج آئیں گے۔''

میں نے حیرت سے پوچھا۔

''میرے متعلق باتیں اور آپ لوگ کرتے رہتے ہیں؟ بھلا کیا باتیں کرتے ہیں؟''

سمینتھا اب تک خاموش کھڑی تھی اور مجھے اندازہ نہ تھا کہ وہ ماں کو سنانے کے لئے باتوں سے بھری بیٹھی ہے۔ موقع ملتے ہی بڑے اشتیاق سے گویا پھٹ ہی تو پڑی۔

''ممی...... ممی۔ ہمارے پاکستانی مہمان تو بہت بڑے سرکاری افسر ہیں اپنے وطن میں۔ آج میں ان کے ساتھ پاکستانی سفارتخانہ گئی تھی۔ ان کو دیکھ کر وہاں سب لوگ تعظیماً کھڑے ہو گئے تھے اور سر سر کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔ ان کے اہتمام میں زبردست لنچ دیا۔ واپسی پر یہ...... بڑی گاڑی ان کو ہمارے گھر تک پہنچا گئی ہے۔ میں بھی اس لمبی اور پر تعیش گاڑی میں ان کے ساتھ بیٹھی۔ ہر شخص ان کی تعظیم کر رہا تھا۔ یہ گریٹ ہیں ممی گریٹ۔ آپ مان جائیں ممی...... میری بات

مان جائیں۔کبھی تو میری بات مان جایا کیجئے۔"
ممی نے اسے گھورا......
"سمینتھا تم بہت بڑھ بڑھ کے باتیں کرنے لگی ہو۔ چلو تم باورچی خانہ میں جاؤ اور ہمارے لئے کافی کا ایک کپ بنا کے لاؤ۔ ہمیں کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔"
سمینتھا بڑبڑائی اور ممی کو گھورتی ہوئی باورچی خانہ میں چلی گئی۔ ممی نے مجھے دیکھا اور معاً مسکرا پڑی۔
"بڑی ہو گئی ہے لیکن بڑا پن نہیں آیا اس میں' شاید ساری عمر بچی رہے گی۔" ممی نے محبت سے کہا۔
"پگلی......خوابوں میں جینے والی لڑکی ہے۔ پتہ نہیں کیسے گزارا کرے گی حقیقت کی بے رحم دنیا میں؟"
"یہ پگلی لڑکی آپ سے کیا بات منوانا چاہ رہی ہے؟" میں نے پوچھا۔
ممی اک دم سنجیدہ ہو گئیں۔"اس معاملہ پر بعد میں بات کریں گے۔ آیئے پہلے دوسرے معاملہ پر بات کر لیں۔ میں نے آپ کے سپرد کام کیا تھا اور سمینتھا نے آپ کو ارشد سے ملوا بھی دیا تھا۔ اب آپ پلیز ارشد کے متعلق مجھے اپنی رائے دیجئے۔" اس اچانک حملہ سے میں گھبرا گیا حالانکہ میں صبح سے اس پر اچھا خاصا سوچ بچار کر رہا تھا۔ اس وقت میری سمجھ میں نہ آیا کہ کہاں سے شروع کروں اگر صحیح بات بتاتا ہوں تو پاکستانیوں کی بدنامی ہوتی ہے اور اگر سب اچھا کی رپورٹ دیتا ہوں تو پھر بھی ایک پاکستانی پر اعتماد کو ٹھیس پہنچتی ہے۔
"جی دیکھئے......" میں نے گلا صاف کر کے کہنا شروع کیا۔
"ذرا ٹھہریئے......؟" ممی بولیں۔ "بہتر ہو گا اگر ہم سمینتھا کے سامنے یہ بات کریں کیونکہ آخری فیصلہ تو اسی نے کرنا ہے۔" پھر سمینتھا کو زور سے آواز دی۔ "سمینتھا کم ہیئر۔ تم سے بات کرنی ہے۔"
جب سمینتھا سامنے آ کے بیٹھ گئی اور میں نے اس کے معصوم چہرے کو دیکھا تو مصمم ارادہ کر لیا کہ جو بولوں گا سچ بولوں گا' اس میں اگر کوئی پاکستانی بدنام ہوتا ہے ہوا کرے۔ وہ خود کون سا نیک کام کرنے کا ارادہ رکھتا ہے' چنانچہ یہ خیال کئے بغیر کہ سمینتھا پر کیا گزرے گی اور اس کی ماں پاکستانیوں کے بارے میں کیا سوچے گی۔ میں نے بڑی بے رحمی سے ان دونوں کو صاف صاف بتا

دیا کہ ارشد اگرچہ ایک لمبا اونچا خوبصورت جوان ہے لیکن اس کے ارادے قطعی نیک نہیں۔ اس کے اپنے خاندان میں اس کی منگنی ہو چکی ہے اور وہ بھی اس کی اپنی خواہش پر کیونکہ اس کی منگیتر اس کی محبوبہ ہے اور اس کا دل اب بھی وہاں اٹکا ہوا ہے۔ سمینتھا سے محبت اور شادی تو فقط برطانوی شہریت حاصل کرنے کا حربہ ہے زندگی گزارنے کا نہیں اور یہ کہ اس نے اس امر کا باقاعدہ اعتراف کیا ہے پھر وہ نظر کا بھی بد ہے..... گندہ ذہن اور گندی نظر رکھتا ہے۔ اس کا ثبوت یعنی بس میں کھمبے کے ساتھ کھڑے ہونے کا ذکر...... میں گول کر گیا کیونکہ خواتین کے سامنے یہ ایک ناشائستہ بات ہوتی!

سمینتھا کی ممی کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا ایک جا رہا تھا لیکن سمینتھا اطمینان سے بیٹھی یہ سب کچھ بڑے سکون سے سن رہی تھی' جیسے یہ سب اس کے محبوب کے نہیں بلکہ کسی اور شخص کے بارے میں کہا جا رہا ہے۔ میرا خیال تھا کہ کسی نوجوان پاکستانی لڑکی کی طرح وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دے گی' برتن توڑ دے گی' لیکن وہ بڑے سکون سے بیٹھی رہی' کسی قسم کا ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ جب میں سب کچھ بتا چکا تو بڑے اطمینان سے بولی:

''آپ نے اچھا کیا کہ مجھے خود فریبی سے نکال دیا۔ میں بھی محسوس کرتی تھی کہ ارشد اسی ذہنیت کا آدمی ہے جیسا آپ نے بتایا ہے لیکن میں سمجھی کہ شادی کے بعد میں اس کی بری عادتیں چھڑا دوں گی لیکن مجھے اس کی منگنی کے بارے میں علم نہیں۔ میرے لئے یہ ناقابل برداشت ہے کہ منگنی کے بعد بھی وہ مجھ سے فراڈ کرے۔ وہ ہرگز میرے لائق نہیں۔''

ممی نے اطمینان کی سانس لی اور بولیں۔ ''سمینتھا تم اس کو بھول جاؤ۔ وہ واقعی تمہارے لائق نہیں۔''

''یس ممی۔ وہ واقعی اس قابل نہیں۔ اب شاید میں اس سے کبھی نہ ملوں۔'' پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''میں آپ کی شکر گزار ہوں۔ آپ نے مجھے خوامخواہ کی تلخیوں سے بچا لیا۔ اب میں آپ کے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ باورچی خانہ کی طرف چلی گئی۔

میں نے سکھ کا سانس لیا۔ معاملہ میری توقع سے زیادہ آسانی سے نپٹ گیا لیکن سمینتھا کی امی بڑی گہری نظروں سے اپنی بیٹی کی حرکات کا جائزہ لیتی رہیں۔

''ہائے بے چاری سمینتھا۔'' وہ بولیں۔ ''میری اس بھولی بھالی معصوم بچی نے زندگی میں کوئی خوشی نہیں دیکھی۔ چھوٹی سی تھی بس چلنا سیکھی تھی کہ باپ مر گیا جو اس سے حد درجہ محبت کرتا تھا

بلکہ اس پر جان دیتا تھا۔ یہ بھی اس کو بہت چاہتی تھی۔ باپ کے مرنے سے اس کی زندگی میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جو بھرنے کا نام نہیں لیتا۔ چھوٹی سی تھی تو ہمسائے میں دو تین بڑے بوڑھے رہا کرتے تھے ان سے دوستی کر رکھی تھی۔ ان سے کہا کرتی تھی کہ ''انکل اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کو ڈیڈی کہہ لیا کروں۔ کیوں کہ سب کے ڈیڈی ہیں میرے نہیں۔'' اس کی یہ باتیں مجھے خون کے آنسو رلاتی تھیں۔ کئی دفعہ میں نے سوچا کہ دوسری شادی کر لوں۔ تمام رشتہ داروں دوستوں اور جاننے والوں نے مشورے بھی دیئے، حتیٰ کہ کئی دوستوں نے شادی کی پیشکش بھی کی لیکن میں نے یہ سوچ کر کہ آنے والا نہ جانے اس سے کس طرح کا سلوک کرے، شادی نہیں کی۔ باپ کی چاہت کی گمشدگی کا اس پر اتنا اثر ہے کہ یہ اپنے سے بہت بڑے مردوں سے دوستی پسند کرتی ہے۔ ان میں اپنا باپ تلاش کرتی ہے۔ ان سے اس طرح کے لاڈ کرنا چاہتی ہے جیسے اپنے باپ سے کرتی تھی۔ مثلاً ان کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر گھومنا۔ ان کی کمر میں ہاتھ ڈال دینا یا ان کا بازو اپنی کمر کے گرد لپیٹ لینا۔ چھوٹی سی تھی تو مجھے اتنی پرواہ نہیں تھی لیکن اب یہ بڑی ہو گئی ہے۔ اب بھی اسی طرح کرتی ہے جو کچھ اچھا نہیں لگتا۔''

ممی روانی سے بولے چلے جا رہی تھی۔ بکنگھم پیلس کے سامنے اس نے میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈال دیا تھا اور جس سے میں حیران ہونے کے ساتھ ساتھ جھینپ بھی گیا تھا۔ اسی طرح آکسفورڈ اسٹریٹ میں اس نے میری کمر کے گرد بازو حمائل کرنے کی کوشش کی تھی تو میں بدک کر الگ ہو گیا تھا۔ میں اسے رومانس کی تلاش سمجھا تھا۔ ایک نوجوان لڑکی کی طرف سے۔ یہ تو معاملہ ہی کچھ اور نکلا...... اچھا تو یہ راز تھا۔ محض نفسیاتی خلا۔ کھوئی ہوئی پدری محبت کی تلاش۔

ممی ابھی تک اپنی رو میں کہے چلی جا رہی تھیں۔

''سمینتھا کہہ رہی تھی کہ انکل مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ ان کی محبت بے غرض ہے، لڑکوں کی طرح چھچھوری نہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ جاؤں اور یہ میرا سر تھپکتے رہیں یہاں تک کہ میں نیند کی آغوش میں چلی جاؤں۔''

''انکل...... یہ انکل کون ہے؟'' میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

ممی مسکرائی...... ''سمینتھا آپ کو لاڈ پیار سے انکل کہتی ہے۔'' پھر مجھے گہری نظر سے دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔ ''یہ پگلی لڑکی کہتی ہے کہ انکل مجھے بہت پیار کرتے ہیں۔ کاش میں ان کی بیٹی ہوتی۔!''

میرے لئے یہ انکشاف کسی طاقت ور بم سے کم نہ تھا۔ ایک لمحہ کے لئے تو میں ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ سائیں سائیں کرتا سارا زمانہ میرے گرد گھوم گیا۔ ارے میں کیا سمجھ رہا تھا اور یہ پگلی لڑکی کیا نکلی۔ میں تو سمینتھا کو ایک عام سی لا ابالی برطانوی لڑکی سمجھا تھا جو رومان کی تلاش میں ماری ماری پھرتی ہے' اور اس میں زندگی کی لذت تلاش کرتی ہے لیکن یہ تو باپ کے پیار کے لطیف جذبات کی بھوکی نکلی۔ وہ تصور میں مجھے محبوب کا نہیں بلکہ باپ کا درجہ دے رہی تھی۔

میری حالت سے بے خبر ممی بولے چلی جارہی تھیں۔

''ابھی کل ہی کی بات ہے۔ کہہ رہی تھی کہ ممی کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم انکل کو ہمیشہ کے لئے اپنے پاس رکھ لیں۔ وہ ہمارے پاس ہی رہیں گے۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ انکل سے شادی کرلیں اور میں ان کی حقیقی بیٹی بن جاؤں۔ اچھا ہے ہم سب اکٹھے رہیں گے۔ ایک دوسرے سے محبت کریں گے۔ پیار کریں گے۔ دکھ سکھ میں ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے۔ یہ گھر ہمارا گھر سب کا گھر بن کر ایک جنت بن جائے گا۔ ممی کیا ایسا نہیں ہوسکتا......؟ میں اس کو سمجھا رہی تھی کہ جب میری شادی کی عمر تھی۔ لوگ بھی زور لگا رہے تھے تب میں نے شادی نہیں کی تو اس عمر میں کیا کرونگی؟ پھر تمہارا انکل پاکستانی ہے۔ دور دیس کا رہنے والا ہے۔ مختلف کلچر سے تعلق رکھتا ہے۔ ہم لوگوں سے مختلف ہے۔ پتہ نہیں اس بات کو پسند کرتا بھی ہے کہ نہیں؟ پھر وہ اس عمر میں ہے جہاں وہ یقیناً شادی شدہ ہوگا۔ ہوسکتا ہے اس کے بچے بھی ہوں اور ان سے محبت بھی کرتا ہو۔ اس صورت میں یہ سب کیسے ممکن ہے؟''

ممی کے اس سیدھے سادے انکشاف نے میرے رہے سہے ہوش اڑا دیئے۔ بلاشبہ ممی بلا کی خوبصورت تھی۔ بااخلاق سلجھی ہوئی' تعلیم یافتہ بلکہ یوں سمجھئے کہ کسی بھی مرد کا حسین خواب تھی لیکن یہ پروپوزل یقیناً ہوش گم کردینے والا تھا۔ جب میں نے جواب دینا شروع کیا تو نہ صرف میرا سر گھوم رہا تھا بلکہ آواز بھی میرے گلے سے مشکل سے نکل رہی تھی۔

''آپ نے ٹھیک کہا۔ سمینتھا تو محض بچی ہے اور اس بچی نے محض اپنی خواہش ہی تو بیان کی ہے اور ضروری تو نہیں کہ ہر خواہش پوری ہو ہی جائے۔ اس خواہش میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ میں شادی شدہ ہوں۔ میری بیوی بہت خوبصورت ہے' سگھڑ ہے' گھریلو ہے' مجھ سے بے حد محبت کرتی ہے۔ میرے تین عدد کیوٹ سے بچے ہیں۔ میرا ایک خوش و خرم خاندان ہے۔ ہم سب آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں جس کی وجہ سے میرا گھر' میری جنت

ہے اور اس جنت کو میں کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتا' پھر میں یوں بھی تو چند دنوں کے لئے علاج کی غرض سے برطانیہ آیا ہوا ہوں۔ تین ہفتہ بعد میں اپنے وطن واپس لوٹ جاؤں گا جہاں میرے بیوی بچے اور دیگر رشتہ دار میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں انگلینڈ میں نہ رہ سکتا ہوں اور نہ ہی رہنا چاہتا ہوں۔ ایک جنت کھو کر...... دوسری کے لئے کوشش کرنا کوئی عقلمندی تو نہیں؟ رہی بات اس پیشکش کی تو میں آپ کا اور سمینتھا کا بس شکریہ ہی ادا کر سکتا ہوں کہ آپ نے مجھے اتنی محبت دی اور اس قابل سمجھا کہ اپنے خاندان کا فرد بننے کی دعوت دے دی۔ آپ لوگ بہت اچھے ہیں' مجھے بہت پسند آئے لیکن یہ پیشکش میرے لئے ناقابل قبول ہے۔ دراصل ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق زاد راہ لے کر چلتا ہے۔ مجھ جیسے دریدہ دامن شخص کے پاس آپ جیسے اچھے لوگوں کے لئے کچھ بھی تو نہیں ہے۔"

ممی خاموش بیٹھی میرا لیکچر سنتی رہی۔ جب خاموش ہوا تو بولی۔

"میرا بھی یہی خیال تھا۔ سمینتھا کی خواہش واقعی بچگانہ ہے۔ آپ اس بات پر قطعی پریشان نہ ہوں پھر یہ بھی تو دیکھئے۔ ہماری ملاقات کو ابھی دو تین دن ہی تو ہوئے ہیں اور ابھی اتنی شناسائی نہیں ہوئی کہ رشتہ تک بات پہنچے۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

اس اثنا میں سمینتھا کافی بنا کے لائی۔ کافی کے ساتھ کچھ سنیکس بھی تھے۔ جب وہ کافی سامنے رکھ کر سامنے کھڑی ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ اس کا قد چھوٹا ہوتا جا رہا ہے۔ چہرے کا بھولپن بڑھتا جا رہا ہے۔ ہوتے ہوتے اس کا قد ڈیڑھ پونے دو فٹ کا رہ گیا۔ میرے تصور نے اس کے بال چھوٹے کر دیئے اور اس پر سرخ ربن باندھ دیا۔ اس کے بعد ننھی منی تین چار سالہ سمینتھا کو ایک پھولدار رنگین فراک پہنا دی اور پھر وہ ہمک کر میری گود میں آ بیٹھی۔ میرے گلے میں بانہیں حائل کر دیں اور کہنے لگی......

"انکل...... اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کو ڈیڈی کہہ لیا کروں...... سب کے ڈیڈی ہیں میرے نہیں!"

"ضرور...... سمینتھا میری بچی...... میری بیٹی...... میں نے تجھے کس قدر غلط سمجھا تو تو اندر سے کتنی معصوم بھولی بھالی اور باپ کی متلاشی نکلی۔"

میں نے سر کو جھٹکا دیا۔ سمینتھا کہہ رہی تھی کہ "کافی گرم ہے۔ پی لیجئے ورنہ ٹھنڈی ہو

جائے گی۔" میں نے اسے بلا کر گلے لگایا۔ اس کی پیشانی چوم لی۔ "خدا تمہیں خوش رکھے۔" میں نے کہا۔

اس کے بعد کافی کیسے پی گئی اور اس دوران کیا کیا باتیں ہوئیں' کچھ پتہ نہیں......بس اتنا یاد ہے کہ ہم سب ہنستے بھی رہے مذاق بھی کرتے رہے لیکن میرے پلے کچھ نہ پڑا۔ شاید سمینتھا اور اس کی ممی نے جو ذہنی جھٹکے دیئے تھے انہوں نے سوچنے سمجھنے کی قوت عارضی طور پر سلب کر لی تھی۔

کافی کے بعد سمینتھا مجھے لندن کی سیر کرانے لے گئی۔ سب سے پہلے ہم سینٹ پال پہنچے۔ یہ بہت ہی بڑا گرجا گھر ہے اور اسے شاہی گرجا گھر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے چنانچہ شاہی گھرانے کی زیادہ تر شادیاں یہیں ہوتی ہیں اور بہت رونق رہتی ہے۔ یہاں دیکھنے کو بہت کچھ تھا لیکن میں کیا کرتا میرا دماغ اس قدر الجھا ہوا تھا کہ مجھے نہ تو کچھ دکھائی دیا اور نہ ہی میں نے کچھ سنا' بس اتنا یاد ہے کہ ایک عظیم الشان مقدس عمارت ہم نے اندر باہر سے دیکھی اور بس۔

اس کے بعد ہم نے ٹیکسی پکڑی اور وہ تاریخی جگہ دیکھنے چلے گئے جہاں سے "عظیم آگ" شروع ہوئی تھی اس "عظیم آگ" کا قصہ بھی عجیب ہے کیونکہ اگر یہ خوفناک اور تباہ کن آگ نہ لگتی تو شاید لندن کو اتنا عروج اور حسن حاصل نہ ہوتا۔

بات فقط اتنی ہے کہ پورا جزائر برطانیہ دنیا کے سرد ترین خطہ میں واقع ہے اور اسے بھی مکمل طور پر برف سے ڈھکا ہونا چاہئے تھا کیونکہ سردیوں کے موسم میں شمالی علاقہ یعنی اسکاٹ لینڈ میں درجہ حرارت منفی تیس درجہ تک پہنچ جاتا ہے' اس لحاظ سے یہاں کے باشندوں کی زندگی اسکیموں کی طرح ہوتی جو برف میں ہی پیدا ہوتے' جوان ہوتے اور مرتے ہیں' لیکن قدرت نے ان لوگوں پر ایک مہربانی کی ہے۔ سردیوں کی ابتدا میں دریائے سندھ سے دگنی چوڑی' سمندر جتنی گہری' تیز گرم پانی سے بھری ایک بحری رو جزائر غرب الہند سے شمال کی طرف چلتی ہے اور بحرالکاہل کو عبور کرتی ہوئی برطانوی ساحل سے ٹکرا کر دائیں طرف مڑ کر ڈوور یعنی برطانیہ اور فرانس کے درمیان 26 میل چوڑے سمندر میں داخل ہو جاتی ہے اور اس تمام علاقہ کو گرم کرتی ہوئی اوپر نکل جاتی ہے۔ اس رو کی وجہ سے یہ تمام برطانوی ساحلی علاقہ منجمد ہونے سے بچا رہتا ہے لیکن گرم رو اور سرد سمندر کے ٹکرانے سے زبردست دھند پیدا ہوتی ہے جو برطانیہ کے اندر سو سو میل دور تک پہنچتی ہے اور اتنی دبیز ہوتی ہے کہ دن کے وقت رات کا سا سماں پیدا ہو جاتا ہے۔ ٹریفک کے بے شمار حادثات ہوتے ہیں۔ لندن تک اس دھند کی مار ہوتی ہے۔ اس دھند اور اس رو کو اس لئے پسند

کیا جاتا ہے کہ یہ سردترین موسم میں گرمی فراہم کرتی ہے اور سمندری ٹریفک جاری رہتی ہے۔ بحری تجارت میں کمی نہیں ہوتی۔ بندرگاہیں سارا سال کھلی رہتی ہیں۔ قدرت کے کھیل بھی نیارے ہیں، جو کام بحری رو برطانیہ کے لئے کرتی ہے، وہی کام گرم پانی کے چشمے اور سو سوفٹ بلند ہونے والے ابلتے پانیوں کے فوارے آئس لینڈ کے جزیرے کے لئے کرتے ہیں جس کی وجہ سے وہاں زندگی رواں دواں رہتی ہے۔

اب ظاہر ہے اتنی سخت بلکہ چبھتی سردی میں مکانات پتھر یا اینٹوں کے تو نہیں بنائے جا سکتے تھے چنانچہ 1666ء سے قبل لندن کے تمام تر مکانات لکڑی سے بنے ہوئے تھے تاکہ سردی کا مقابلہ کر سکیں پھر اس سردی میں نہانا دھونا اور صاف ستھرا رہنا بھی ایک مشکل کام ہے۔ اس لئے ان دنوں نہ صرف لندن کے لوگ بلکہ تمام یورپی اقوام نہایت غلیظ زندگی گزارا کرتی تھیں۔ اب بھی کچھ عرصہ قبل تک یہ حال تھا کہ صبح صبح پانی کا ایک ٹب گرم کر لیا جاتا تھا اور خاندان کے تمام افراد باری باری سے اس میں غسل کرتے تھے اور اپنی اتری ہوئی میل اگلے آنے والے ممبر کو منتقل کرتے جاتے تھے اور اس سے کسی کو گھن نہیں آتی تھی۔ ان کے گھروں میں منہ دھونے کے جو بیسن لگے ہوتے ہیں ان کا صحیح طریقہ استعمال بھی یہ بتایا جاتا ہے کہ اس میں ڈاٹ لگا کر اسے بند کر دیا جاتا ہے پھر اسے گرم پانی سے بھر کر اسی میں بار بار منہ دھویا جاتا ہے۔ یہ خیال کئے بغیر کہ پانی گندہ ہو چکا ہے۔

ان حقائق سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ 1665ء سے قبل وہاں کیسی گندی اور غلیظ قوم آباد تھی۔ لکڑی کے چھوٹے چھوٹے مکانات میں رہنے والے ہفتوں چھوڑ مہینوں میں غسل نہیں کرتے تھے۔ ایک ہی قمیض مہینوں پہنی جاتی تھی۔ صرف کالر اور کف تبدیل کئے جاتے تھے وہ بھی کاغذ کے بنے ہوئے بازار میں عام ملتے تھے اور استعمال کر کے پھینک دیے جاتے تھے۔ کھانے پینے کی چیزیں باہر پھینک دینے کا عام رواج تھا۔ اس کے علاوہ ذہنی اور اخلاقی گندگی بھی عام تھی۔

اس گندگی اور غلاظت کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1665ء کے ابتدا میں ہی لندن میں چوہے اور بلیاں انتہا سے زیادہ ہو گئے۔ جون میں اچانک ہی طاعون پھوٹ پڑی...... جو گندگی اور غلاظت کی وجہ سے تیزی سے پھیلی۔ اسے کنٹرول کرنے کی کوشش کی گئی لیکن یہ اتنی تیزی سے بڑھی کہ کنٹرول سے باہر ہو گئی اور لندن میں محاصرہ کا اعلان کر دیا گیا۔ سارے دروازے بند کر دیے گئے۔ دہشت کا دور دورہ ہو گیا لوگ راہ چلتے مرنے لگے۔ محلے کے محلے خالی ہو گئے۔ مُردوں کا

سنبھالنا مشکل ہو گیا کیونکہ مرنے والے زیادہ تھے دفنانے والے کم، جب انسانی تدابیر ناکام ہو گئیں تو قدرت ان کی مدد کو آئی۔

1666ء میں لندن کے ایک گنجان آباد محلّہ میں ایک نانبائی کی دکان (بیکری) تھی۔ ایک دن اس کے تندور میں آگ بھڑک اٹھی۔ بالکل اسی طرح جس طرح طوفان نوح کی ابتدا ایک تندور سے ہوئی تھی جہاں سے پانی کا فوارہ پھوٹا تھا اور جس نے پورے کرہ ارض کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اسی طرح نانبائی کے تندور سے آگ کا فوارہ پھوٹا...... جس نے دنیا کو تو نہیں البتہ پورے لندن کو اپنی لپیٹ میں لے لیا چونکہ لندن بنا ہوا ہی لکڑی کا تھا اس لئے آگ بڑی آسانی سے پھیلی اور ہر رکاوٹ کو عبور کرتی چلی گئی۔ آگ کی تندی کا یہ عالم تھا کہ اس نے مکانوں اور دکانوں کی بنیادوں تک کو نہ چھوڑا اور نصف سے زیادہ لندن کو جلا کر رکھ دیا۔ بلکہ بقول شاعر:

''سوائے جلی ہوئی راکھ۔ آہوں اور سسکیوں کے کچھ نہ بچا۔''

یہاں تک کہ دریائے ٹیمز پر اس زمانے کے واحد پل جسے ''لندن برج'' بھی کہا جاتا ہے اور جس پر راستہ کے ساتھ ساتھ دورویہ مکانات بھی ہوتے تھے، اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ لکڑی کے مکانات جلے سو جلے آگ نے اس کی جڑوں اور بنیادوں تک کو جلا کر رکھ دیا۔ اس لئے آگ بجھنے کے بعد بھی پل کو سہارا دیتے ستون اور محرابیں بھی ایک ایک کر کے دریا میں گرتے رہے۔ یہاں تک کہ پورا پل دریا برد ہو گیا۔ اس دریا برد ہونے کی یاد میں ایک شاعر نے وہ نظم لکھی جو آج بھی پڑھائی جاتی ہے یعنی۔

"London bridge is falling" (لندن برج گر رہا ہے)۔

اس آگ نے جہاں لندن کو جلا کر راکھ کر دیا، وہاں مکانوں اور دکانوں کی بنیادوں اور تہوں میں جہاں بیمار چوہوں اور بلیوں نے بل بنا رکھے تھے۔ پہنچ کر انہیں بھی جلا کر ختم کر دیا اور طاعون کی وبا بھی اس میں جل کر ختم ہو گئی۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ لندن شہر کی از سر نو پلاننگ کی گئی اور اسے مزید خوبصورت بڑا اور ہوادار بنایا گیا۔ موجودہ لندن اسی پلاننگ کی یادگار ہے۔

اس یادگار کو انگریزوں نے برقرار رکھا ہے۔ جس جگہ سے آگ لگی تھی اس جگہ ایک تختی لگا رکھی ہے جب میں اور سمینتھا اس یادگار پر پہنچے تو میں یوں ہی بے زار اور لاتعلق سا ہو رہا تھا، کیونکہ میرے ہوش و حواس بجا نہ تھے۔ مجھے کچھ بھی نہ پتہ چلا کہ ہم کس راستہ سے آئے تھے اور کہاں کھڑے ہیں اور ہمارا آنے کا مقصد کیا تھا؟ حالانکہ اس جگہ کو دیکھنے کا مجھے اس لئے بھی شوق تھا کہ

میں نے انگریز مصنف Guy Bothby کا اس عظیم آگ کے پس منظر میں لکھا ہوا بہت ہی دلچسپ ناول "فیروز دی آیجپشن" (Fehrose the Egyption) (یعنی فیروز مصری) پڑھ رکھا تھا۔اس کے کردار مجھے بخوبی یاد تھے اور میرا خیال تھا کہ جب بھی موقع ملے گا اس جگہ کو دیکھوں گا۔اس کے علاوہ ایک فلم بھی اس موضوع پر دیکھ رکھی تھی لیکن جب اس جگہ پہنچے تو دلچسپی یکا یک ہی ختم ہوگئی۔

سمینتھا کو اس تاریخی یادگار کے متعلق کچھ زیادہ علم نہ تھا۔اس لئے میں ہی کچھ بے ربط سی باتیں کرتا رہا۔سمینتھا غریب حیرانگی سے مجھے دیکھتی رہی پھر کچھ نہ سمجھ کر اور میری عدم دلچسپی کو محسوس کر کے وہ وہاں سے چل دی، میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔باہر نکلنے کے بعد میرا ذہن اس تاریخی عمارت کے بارے میں اتنا ہی کورا تھا جتنا اس سے قبل تھا۔ مجھے کچھ بھی یاد نہیں کہ میں نے وہاں کیا دیکھا تھا۔!

ہم دونوں ایک قریبی پارک میں چلے گئے۔شام کا دھندلکا پھیل رہا تھا۔پارک میں رونق خاصی کم تھی۔دو چار ہی لوگ بینچوں پر بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔چند بچے کھیل رہے تھے۔اکا دکا آئس کریم بیچنے والے بھی گھوم رہے تھے۔پت جھڑ کی وجہ سے پارک کا فرش پتوں سے کم وبیش ڈھکا ہوا تھا۔درخت اور شاخیں ٹنڈ منڈ ہو رہی تھیں۔ماحول خاصا اداس ہو رہا تھا۔ ہم دونوں ایک بینچ پر خاموش بیٹھ گئے۔اس خاموشی کو توڑنے کے لئے سمینتھا نے ایک آئس کریم والے سے دو آئس کریم خریدیں۔ایک مجھے دی اور ایک خود کھانے لگی۔اس کے باوجود ہم کافی دیر تک بیٹھے اپنے اپنے حصہ کی آئس کریم کھاتے رہے۔میرا سر بھاری ہو رہا تھا اور بات کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔

سمینتھا پہلے تو خاموشی سے آئس کریم کھاتی رہی اور وقفہ وقفہ سے میری طرف دیکھتی رہی لیکن جب میں چپ ہی رہا تو نہ رہ سکی۔بولی:

"آپ آج بہت خاموش ہیں۔کیا عظیم آگ کی یادگار نے آپ کو اتنا متاثر کیا ہے...... جو اس طرح گم سم بیٹھے ہیں......"

"نہیں تو...... میں اس کے متعلق پہلے ہی بہت کچھ جانتا تھا۔"

"پھر کیا بات ہے۔کیا کسی نے یاد آ کے آپ کو اداس کر دیا......؟ یا پھر ممی نے کچھ کہہ دیا ہے۔؟"

''سمینتھا۔تمہاری ممی واقعی گریٹ ہیں......انہوں نے ایسا کہا تو کچھ نہیں۔ ہاں بہت کچھ دینے کی کوشش کی۔''

''پھر آپ نے کیا جواب دیا؟''سمینتھا کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔

''میں نے کیا جواب دینا تھا سمینتھا؟ میرا دامن ہی اتنا مختصر ہے کہ اس میں اتنی پیشکش کے سمانے کی گنجائش ہی نہیں۔ کاش کہ میرا دامن وسیع ہوتا اور اس قابل ہوتا کہ تمہاری امی کی خوبصورت پیشکش کو قبول کر سکتا؟''

سمینتھا بولی:''ممی نے آپ سے جو کچھ کہا ہے مجھے اس کا علم ہے۔ میں نے ہی ان کو اس بات کا مشورہ دیا تھا! میری ممی انتہائی شاندار اور بہادر خاتون ہیں۔ انہوں نے ہم بہن بھائیوں پر اپنا سب کچھ قربان کر دیا ہے لیکن خود عرصہ سے تنہائی کی آگ میں جل رہی ہیں جس کو سوچ سوچ کر میں بھی اندر سے سلگنے لگتی ہوں۔ آپ کو دیکھ کر میرا جی چاہا کہ آپ امی کی اس تنہائی کو دور کریں؟''

''کیوں......؟''میں نے تعجب سے پوچھا۔

''اس لئے کہ مجھے آپ میں خلوص محسوس ہوا۔ میں چار دن سے آپ کے ساتھ ہوں لیکن آپ نے ایک دفعہ بھی کوئی غلط حرکت نہیں کی حالانکہ میں آپ کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلتی رہی آپ کے قریب بھی ہوئی۔ یہ ہمارے ملک میں عجوبہ سے کم نہیں۔'' کچھ دیر خاموش رہی پھر وہ بولی۔

''ممی بھی اس پر راضی ہیں!''

مزید خاموش رہنا میرے لئے ناممکن ہو گیا!

''سمینتھا۔ میں تمہارا اور تمہاری ممی کا ازحد شکر گزار ہوں۔تم نے مجھے اتنی چاہت اور اپنائیت دی کہ گھر کا فرد بنانے کی پیشکش تک کر دی لیکن تمہاری امی کو تو میں بتا چکا ہوں۔اب تمہیں بھی بتا رہا ہوں کہ میں نہ صرف یہ کہ شادی شدہ ہوں بلکہ تین بچوں کا باپ ہوں۔ بڑا بیٹا اولیول میں زیر تعلیم ہے باقی دو چھوٹے ہیں میرے وطن میں میرے منتظر ہیں۔ اگر میں ایسا کروں جیسا تم کہہ رہی ہو تو جہاں میں اپنی جنت کھو بیٹھوں گا۔ وہاں میری بیوی اور بچوں کا اعتماد نہ صرف مجھ پر سے اٹھ جائے گا بلکہ وہ آئندہ دنیا میں کسی پر بھی اعتبار نہ کریں گے۔تمہاری امی سے شادی ایک سہانا اور دلکش خواب سہی لیکن فی الحال میں یہ خواب دیکھنا نہیں چاہتا۔ دیکھو سمینتھا ایک کو خوشی دینے

کی خاطر دوسرے کی خوشی چھیننا کہاں کا انصاف ہے؟ اپنے خاندان کی حد تک میں انتہائی خودغرض ہوں اور پلیز مجھے خودغرض ہی رہنے دو۔!''

سمیتھا خاموشی سے میری طرف تک رہی تھی۔ اس کے چہرے پر مایوسی کے آثار نمودار ہوئے لیکن جب بولی تو اس میں ان کا شائبہ تک نہ تھا۔

''آپ نے اچھا کیا کھل کر بات کر دی۔ ارشد کی طرح دھوکے میں نہیں رکھا۔ میں اس کی قدر کرتی ہوں لیکن ایک بات بتائیں۔ آج صبح تو آپ اپنے آپ کو میرے حوالے کر رہے تھے۔''

''لیکن وہ تو ایک مذاق محض تھا۔ تم خود جانتی ہو!''

''ہاں مجھے معلوم ہے۔'' وہ بولی۔ ''اچھا ایک اور بات بتائیں۔ آج کی بات کے بعد کیا ہم بدستور دوست رہ سکتے ہیں؟''

''ہاں ہاں...... کیوں نہیں ...... دوستی کے لئے رشتہ داری ضروری تو نہیں۔'' سمیتھا کھل کر مسکرائی۔ ''ہاں اب ٹھیک ہے۔ وعدہ کیجئے ہم ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے مخلص دوست رہیں گے۔'' یہ کہہ کر اس نے ہاتھ بڑھایا۔ چوڑیوں والا ہاتھ ...... جسے میں نے تھام لیا اور گرم جوشی سے ہاتھ ہلایا۔

سمیتھا کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر بولی۔

''آپ اور کتنے دن لندن میں۔ رہیں گے؟''

''ہماری دوستی کی میعاد بہت مختصر ہے۔ شاید دو یا تین دن۔ یہ اس پر منحصر ہے کہ تم کتنا جلدی مجھے پورا لندن دکھا دیتی ہو۔'' میں نے جواب دیا۔

''پھر...... پھر آپ واپس پاکستان چلے جائیں گے؟''

''نہیں۔ فی الحال نہیں ...... یہاں سے میں۔ شیفیلڈ کے پاس ایک چھوٹا سا مضافاتی شہر ہے۔ رادھرم۔ وہاں جاؤں گا' وہاں میرا چھوٹا بھائی رہتا ہے کسی ہسپتال میں ڈاکٹر ہے۔ اس کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں۔ دو ہفتہ قیام کے بعد میں اپنے وطن اپنی جنت پاکستان' لوٹ جاؤنگا۔'' میں نے دھیرے دھیرے جواب دیا۔

سمیتھا حسرت سے بولی۔ ''بہت محبت ہے آپ کو اپنے وطن سے؟ جب بھی اپنے وطن کا ذکر کرتے ہیں بہت احترام سے کرتے ہیں۔ میرا بھی جی چاہنے لگا ہے کہ پاکستان اور خاص طور پر آپ کی بیوی اور بچوں کو دیکھوں جنہیں آپ بار بار یاد کرتے ہیں۔''

میں نے کچھ جواب نہ دیا' پھر کچھ سوچ کر سمینتھا بولی۔

''کیا آپ اپنے وطن پہنچ کر بھی ہمیں یاد رکھیں گے یا زندگی کی گہما گہمی میں ہماری یادیں بھی گم ہو کر رہ جائیں گی؟ لیکن آپ کہاں اور کیوں یاد کریں گے' نہ ہماری رفاقت اتنی لمبی' نہ اپنائیت اتنی گہری۔''

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

''سمینتھا۔ یاد تو اسے کیا جاتا ہے جسے بھلایا جا سکے یا بھلایا گیا ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا تم یا تمہاری عظیم ممی ایسی چیز ہیں جسے آسانی سے بھلایا جا سکتا ہے۔ تم تو مجھے ہمیشہ یاد آتی رہو گی۔ کیا پتہ تم سے جدا ہو کر میں تمہیں خوابوں میں دیکھوں...... تمہارے ساتھ بیتے ہوئے لمحے امر ہیں اور میری زندگی کا انمول خزانہ۔ تم تو مجھے زندگی کے ہر موڑ پر یاد آؤ گی۔ واپس وطن پہنچ کر میں اپنے بیوی بچوں اور دوسروں کو بھی بتاؤں گا کہ لندن جاتے ہوئے ٹرین میں مجھے ایک خوبصورت گڑیا سی لڑکی ملی تھی۔ وہ میری مفت کی گائیڈ بن گئی تھی اور اس حوالہ سے اس نے مجھے پورے لندن کی سیر کرائی تھی۔ مجھے اپنے گھر لے گئی اپنی پیاری سی ممی سے ملوایا۔ اپنے ننھے منے پیارے پیارے بہن بھائیوں سے ملوایا۔ میرا بہت خیال رکھا۔ مجھے اتنی اچھی رفاقت دی کہ ایک لمحہ کے لئے بھی مجھے محسوس نہ ہونے دیا کہ میں دیارِ غیر میں ہوں۔ تمہاری یہی دلچسپ رفاقت مجھے ساری عمر نہ بھولے گی۔ ہم نے یقیناً بہت اچھا وقت ساتھ گزارا ہے اور اچھا وقت زندگی کے ہر موڑ پر یاد آتا ہے۔''

سمینتھا خالی خالی نظروں سے مجھے گھور رہی تھی جیسے مجھ سے پار کسی اور چیز کو دیکھ رہی ہو۔ میری بات ختم ہو جانے کے بعد بھی ویسے ہی گھورتی رہی' پھر جیسے بے خیالی میں بولی۔

''آپ ممی کو اچھے لگے! کل جب آپ چلے گئے تو میں بہت دیر تک بیٹھی ممی سے آپ کے متعلق باتیں کرتی رہی۔ میں نے ممی کو بتایا تھا کہ انکل کے ساتھ میرا وقت اچھا گزرا۔ وہ تو بہت اچھے نکلے۔ وہ بڑی یادیں چھوڑے جا رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ جس طرح اس سال تیز رنگوں والے رنگ برنگے پھول کھلے تھے۔ اس طرح جب اگلے سال پھول کھلیں گے تو ہماری یادیں انہیں یہاں لے آئیں گی اور ہمیں ملنے ضرور آئیں گے...... اگر نہ بھی آئے تو جہاں بھی ہوں گے ہمیں ضرور یاد کریں گے۔ کیوں انکل۔ میں نے ٹھیک کہا نا؟ میں نے ممی سے یہ بھی کہا تھا کہ سردیوں کی اندھیری شاموں میں جب باہر برف باری ہوا کرے گی تو ہم آتشدان کے سامنے بیٹھ

کرانکل کی باتیں کریں گے۔ جب بھی میں پکاڈلی سرکس جاؤں گی۔ آپ مجھے بہت یاد آئیں گے۔ آپ کی دی ہوئی چوڑیاں۔ بالوں کا بینڈ اور پیاری سی گھڑی میں سنبھال کر رکھوں گی اور جب آپ یاد آئیں گے تو انہیں نکال کر دیکھ لیا کروں گی۔"

سمینتھا لحہ بہ لحہ جذباتی ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش آ چلی تھی ......میرے لئے سمینتھا اور اس کی ممی واقعی پاؤں کی زنجیر بنتی جا رہی تھیں اگر یہی حال رہا تو پھر شاید میں خود پر قابو نہ رکھ سکوں گا۔ اس لئے اس زنجیر کو توڑنا کچھ ضروری سا ہو چلا تھا' یہی سوچ کر میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بولا۔

"سمینتھا۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے۔ تم جانتی ہو کہ اندھیرے کے بعد عام طور پر اور تارکین وطن کے لئے خاص طور پر لندن خطرناک ہو جاتا ہے پھر کل میں راستہ بھول گیا تھا جس کی وجہ سے مجھے سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ میری وجہ سے میرے میزبان بھی پریشان ہوئے تھے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آج وقت پر گھر پہنچ جاؤں۔"

سمینتھا جب اٹھی تو اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ ہم دونوں پارک سے باہر نکل آئے۔ باہر سڑک پر سمینتھا نے دونوں ہاتھوں سے میرا بازو تھام لیا اور ساتھ لگ کر چلنے لگی۔ بس سٹاپ ایک دوگلیاں چھوڑ کر تھا۔ اتفاق سے بس جلد ہی آ گئی۔ کچھ دیر بعد ہم وکٹوریہ اسٹیشن پر جا اترے۔ سامنے ہی پچیس نمبر بس تیار کھڑی تھی۔ میں جب سوار ہونے لگا تو الوداعی مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ سمینتھا نے ہاتھ پکڑ کر چوم لیا۔ جواب میں میں نے ٹھیٹ مشرقی انداز میں اس کا سر دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لے کر سر پر ایک طویل بوسہ دیا۔

بس چلی تو سمینتھا کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی صاف نظر آ رہی تھی جبکہ میری آنکھیں پرنم تھیں۔ سمینتھا چلا کر بولی۔ "کل نو بجے۔ پکاڈلی سرکس۔ میں انتظار کروں گی۔"

میں بھی چلایا۔ "نہیں دس بجے......یاد رکھنا۔"

ہم دونوں نے ہاتھ ہلائے پھر اچانک سمینتھا دور ہوتی چلی گئی۔ بس نے دائیں طرف ٹرن لیا اور سمینتھا نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ یہ میری سمینتھا سے آخری ملاقات تھی۔



# پروفیسر سے ملاقات

سمینتھا اور اس کی ممی نے باتوں ہی باتوں میں جو ذہنی جھٹکے مجھے دیئے تھے میں انہیں اپنے رگ و پے میں محسوس کر رہا تھا۔ ان کی وجہ سے میرا دماغ بھی ماؤف ہو رہا تھا۔ میرا ذہن اس صورت حال کو قبول نہ کر پا رہا تھا۔ چونکہ میں کچھ کر نہ سکتا تھا اس لئے بے چارگی اور بے بسی کے عالم میں اپنے اوپر ہی غصہ چڑھ رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ کسی سے لڑ پڑوں اور اتنا لڑوں اتنا لڑوں کہ سارا ابال نکل جائے یا پھر اس ذہنی اذیت سے بھی بڑی کوئی اور اذیت اٹھاؤں تا کہ موجودہ اذیت کا اثر ختم ہو جائے۔

''اب مجھے کیا کرنا چاہئے؟ صدیق کی بات سچ ثابت ہو رہی ہے۔ لندن شہر تو واقعی پاؤں کی زنجیر بنتا جا رہا ہے۔ تو کیا میں بھی ہزاروں پاکستانیوں کی طرح اس نظر نہ آنے والی زنجیر میں جکڑا جاؤں گا۔ میں تو چند ایام کے لئے یہاں آیا تھا لیکن یہ شہر تو مجھے ہمیشہ کے لئے اپنے اندر جذب کر لینا چاہتا ہے! کیا میرا حشر بھی صدیق کی طرح ہو گا جو اپنے قفس سے اس درجہ مانوس ہو چکا ہے کہ اپنی پرانی اور خوشگوار یادوں سے بھی خوفزدہ ہے۔ نہیں مجھے جلد از جلد اس زنجیر سے پیچھا چھڑا لینا چاہئے اور اس شہر کو خیر باد کہہ دینا چاہئے۔ مجھے اپنا خاندان بیوی بچے' اپنا وطن اپنی مٹی' اپنا کلچر زیادہ عزیز ہے۔ میں اس اجنبی خاک کا حصہ نہیں بنوں گا...... سمینتھا اور اس کی ماں کا کیا ہے۔ دو چار دن یاد کریں گی پھر بھول بھال کر اپنے کام کاج میں لگ جائیں گی۔ کچھ دنوں کے بعد انہیں تو یاد بھی نہیں رہے گا۔ کہ کوئی اجنبی مسافر ان کی زندگی میں کبھی آیا بھی تھا۔؟

ان خیالات میں گم تھا کہ اگلے اسٹاپ پر بس رکی۔ نئے سوار ہونے والے مسافروں کی آوازوں نے خاموشی کو توڑا۔ مجھے بھی محسوس ہوا کہ کوئی میرے برابر کی سیٹ پر بیٹھ گیا ہے لیکن ابلتے جذبات نے مجھے اجازت نہ دی کہ آنکھیں کھول کے دیکھوں کہ کون آن کے بیٹھا ہے؟ مجھے کیا علم تھا کہ میری قسمت میں ایک عجیب و غریب لیکن عظیم ہستی سے ملاقات لکھی تھی جسے اتفاقات

نے میرے برابر لا بٹھایا ہے۔!

بس چل پڑی۔ لگ بھگ پانچ منٹ گزر گئے۔ اس اثنا میں مجھے اپنے دائیں کندھے پر انگلیوں کا دباؤ سا محسوس ہوا جیسے کوئی شخص مجھے مخاطب کرنا چاہ رہا ہو...... میں نے آنکھیں کھول کے دیکھا کہ یہ عجیب وغریب حرکت کرنے والا کون ہے۔ (کیونکہ برطانیہ کے مہذب معاشرے میں خالص انگریز کبھی بھی بات چیت میں پہل نہیں کرتا)۔ تو سامنے ایک عجیب وغریب شخصیت کو بیٹھے پایا۔ عجیب وغریب اس لئے کہ رات کے وقت اس نے سیاہ سوٹ زیب تن کر رکھا تھا اور وہ بھی بغیر نکٹائی کے۔ سر پر بجائے کسی ٹوپی کے وہ ہیلمٹ پہن رکھا تھا جو پہاڑوں یا غاروں میں کھدائی کرنے والے مزدور پہنتے ہیں۔ اس ہیلمٹ کے عین درمیان پیشانی پر ایک روشن بلب نصب تھا۔ جس کو دیکھ کر ایک آنکھ والا افسانوی دیو یاد آ جاتا تھا۔ ہاتھ میں ایک کھلی کتاب پکڑی ہوئی تھی جس پر روشنی مرکوز تھی۔ گویا اس نیم روشن ماحول میں اس روشنی کی مدد سے مطالعہ کیا جا رہا تھا۔ لطف کی بات یہ تھی کہ ٹھوکا دے کے مجھے متوجہ کیا گیا تھا...... مخاطب بھی مجھے کیا جا رہا تھا لیکن توجہ پوری طرح کتاب پر مرکوز تھی۔

''تمہیں پتہ ہے کہ ابھی ابھی کون سی اسٹریٹ گزری ہے؟'' ان کے منہ سے آواز آئی۔

میں خاموش رہا...... یا تو یہ شخص پاگل تھا جو اس بیہودہ طریقہ سے ایک اجنبی سے مخاطب ہو رہا تھا۔ یا خود غرض...... خود غرض ان معنوں میں کہ آپ نے کئی لوگ ایسے دیکھے ہوں گے جو اگر کوئی کتاب، اخبار یا رسالہ پڑھ رہے ہوں اور انہیں کوئی خبر پسند آ جائے تو خوامخواہ ہی زور زور سے پڑھ پڑھ کے دوسروں کو سنانا شروع کر دیتے ہیں یہ احساس کئے بغیر کہ دوسرے کو ان کی پسندیدہ چیز سے کتنی دلچسپی ہے۔ یا لطیفہ پسند آ گیا تو زور زور سے سنا کر ہنسنا شروع کر دیتے ہیں...... گویا دوسروں پر اپنی پسند زبردستی مسلط کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے لوگ خود غرض کہلاتے ہیں۔

میری طرف سے جواب نہ پا کر بولے۔

''یہ کیتھرائن اسٹریٹ تھی۔ پتہ ہے کیتھرائن کون تھی۔؟''

میں پھر بھی خاموش رہا۔ ایک تو بات کرنے کو جی نہ چاہ رہا تھا۔ دوسرا میری جانے بلا یہ کم بخت کیتھرائن کون تھی۔؟ میری طرف سے جواب نہ پا کر خود ہی بولے:۔

''یہ کیتھرائن بادشاہ ہنری ہشتم کی چہیتی بیوی تھی جس کے نام پر اس اسٹریٹ کا نام رکھا گیا۔ اگلی اسٹریٹ جس پر سے ہم ابھی گزریں گے۔ اس کا نام بھی ہنری ہشتم کی دوسری بیوی کے

نام پر رکھا گیا ہے۔'' محترم کی نظریں ابھی تک کتاب پر مرکوز تھیں...... میرا غصہ ابل پڑا۔اس کی تو ایسی تیسی...... سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو۔بلا وجہ ڈسٹرب کر رہا ہے۔نہ جان نہ پہچان اور خوامخواہ میں علمیت جھاڑ رہا ہے۔

''یہ ہنری ہشتم برطانیہ کا وہی بادشاہ ہے نا جس نے کم وبیش آٹھ شادیاں کی تھیں جبکہ عیسائیت میں فقط ایک کی اجازت ہے اور طلاق کا کوئی تصور نہیں جبکہ اس کم بخت نے کئی طلاقیں بھی دی تھیں۔'' میں نے غصہ جھاڑا۔

''آپ کی معلومات خاصی معلوم ہوتی ہیں۔'' محترم نے پھر بھی میری طرف دیکھے بغیر فرمایا۔''اور کیا کچھ جانتے ہیں آپ ہنری ہشتم کے بارے میں۔؟''

''ہنری ہشتم وہی ذات شریف ہے جس نے عیسائی مذہب میں تفرقہ کی بنیاد رکھی'' میرا غصہ ابھی تک برقرار تھا۔

''وہ کیسے۔؟''...... محترم ابھی تک کتاب کی طرف ہی متوجہ تھے۔!

''ذاتی خودغرضی کی بناپر...... حضرت نئی شادی رچانے کے لئے اسپین کے بادشاہ کی بہن کوجوان کی بیوی تھی طلاق دینا چاہتے تھے۔پوپ سے اجازت مانگی۔سیاسی وجوہ کی بناپر روم کے پوپ نے اجازت نہ دی تو روم سے بغاوت کردی اور اپنا نیا مذہب''چرچ آف انگلینڈ'' بناڈالا۔ اس طرح ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی۔'' میں نے برسوں پہلے پڑھی ہوئی غلط ملط معلومات اگل دیں۔بڑا ہی ٹھنڈا ٹھار سا جواب آیا۔بغیر کسی اشتعال کے۔

''ارے بھئی یہ نیا مذہب نہیں۔بلکہ نیا فرقہ تھا جیسا کہ پروٹسٹنٹ...... یا کوئی اور عیسائی فرقہ۔مثلاً مارمن فرقہ جوعیسائی ہوتے ہوئے بھی عیسائیوں کی بہ نسبت مسلمانوں سے زیادہ قریب ہے۔اس فرقہ کے لوگ مسلمانوں کی طرح ایک سے زیادہ شادیاں بھی کرتے ہیں اور طلاق بھی دیتے ہیں۔میرے نزدیک فرقہ بازی کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہونی چاہیے۔''

میں نے کچھ سنا کچھ نہ سنا۔لڑنے کے انداز میں تقریر شروع کردی۔

''جی ہاں...... تاریخ کا وہ دور بھی خوب تھا جب عیسائی فرقے پیدا ہورہے تھے۔ساتھ ہی ''گناہوں کے معافی نامے'' اور ''جنت کے سرٹیفکیٹ''۔مقدس پوپ کے دستخطوں سے مزین۔ روم کے گلی کوچوں میں ریڑھیوں اور فٹ پاتھوں پر عام بکا کرتے تھے۔کیا ریٹ تھے ان معافی ناموں کے۔؟ دو شلنگ میں چوری کا جرم معاف۔ڈیڑھ پونڈ میں عورت کی عصمت دری کا جرم

معاف۔ڈھائی پونڈ میں قتل کا جرم معاف۔اور پھر کیا مزے کی بات تھی۔اپنے تو اپنے۔اپنے ماں باپ۔بہن بھائیوں اور دیگر رشتہ داروں کے گناہ بھی یہ معافی نامے خرید کے معاف کروائے جا سکتے تھے۔لوگ بھی کیسی مزے مزے کی آوازیں لگا لگا کر بیچا کرتے تھے۔''کوٹ بیچ کر معافی نامہ خریدو اور اپنے باپ کو جنت میں بھیجو''۔''سواری کا گدھا بیچو اور ڈھیر سارے معافی نامے خریدو۔ اور سارے خاندان کی بخشش کرالو''۔''گھر کا سامان بیچ کر جنت کے سٹرفکیٹ خرید کر جنت کے حقدار بنو......پھر جو جی چاہے کرو اور بے خطر کرو......پھر جناب بیچنے والے کا پوپ سے کمیشن پر جھگڑا ہو گیا تو......بہانہ یہ بنا کہ عیسائیت میں بت پرستی عام ہو رہی ہے۔اس پر احتجاج کرنے کے لئے دوسرا فرقہ بنانا ضروری ہے۔''

میں بھی غصہ میں نہ جانے کیا کچھ الٹا سیدھا بک گیا......اس سے میرا غصہ بہت حد تک کم ہو گیا......!

میری اس تقریر پر کتاب کھٹ سے بند ہو گئی اور ایک ہلکا سا قہقہہ فضا میں گونج گیا...... رخ میری طرف ہو گیا......اور پھر ماتھے کی......بتی بھی گل کر دی گئی۔

''میرے دوست کی معلومات اچھی خاصی ہیں لیکن ماضی کی غلطیوں کا مداوا حال تو نہیں کر سکتا۔اس زمانے کے بھولے بھالے مظلوم عوام کی سادہ لوحی اور جہالت کو اگر کسی نے کیش کرایا تو اس میں اکابرین کا کیا قصور۔؟ یہ بتاؤ کون سا مذہب ہے جس کو اس کے ماننے والوں نے ایکسپلائٹ نہیں کیا اور اس سے فائدہ اٹھا کے سادہ لوح لوگوں کو نہیں ٹھگا۔مذہب جب بھی پیغمبر اور مخلص لوگوں کے بعد عام لوگوں کے ہاتھوں میں آتا ہے مال تجارت بن جاتا ہے۔ایسا تو آج کل بھی ہو رہا ہے۔کیا ہندو مت میں مندروں کے نام پر چندہ نہیں مانگا جاتا۔کیا مسلمان درگاہوں اور مسجدوں کے نام پر چندہ نہیں جمع کرتے۔کیا بدھ اور جین مت کے ماننے والے اپنے مندروں کے نام پر دان نہیں دیتے۔تاؤ اور شنتو مت والے بے تحاشہ رقم نہیں بٹورتے۔کیا یہودی اپنی عبادت گاہوں بلکہ مذہب کی ترویج کے نام پر لاکھوں ڈالر چندہ نہیں دیتے۔آخر کس مذہب میں لوگوں نے اپنی ذاتی خواہشات اور دولت جمع کرنے کے لئے مذہب کو نہیں بیچا''۔

میں لاجواب ہو گیا......ان محترم نے اس خطرناک بحث کا رخ موڑ دیا۔جس پر بس کے دوسرے مسافر بھی دھیان دینے لگے تھے۔

بس کھڑکھڑاتی ہوئی تیزی سے چلی جا رہی تھی۔باہر سڑک خالی خالی تھی جس پر تاریخی

رنگ کی روشنی چمک رہی تھی۔

کہیں کہیں کھلی اور اکثر بند دکانوں کے نیون سائن جگمگاتے اور پل بھر کے لئے بس میں روشنی کئے نکلے چلے جارہے تھے۔

کچھ دیر کے بعد ٹکٹ کنڈیکٹر آ نازل ہوا۔ ان محترم نے ویسٹ ہائیم کا ٹکٹ خریدا جو ایسٹ ہائیم سے چند کلومیٹر پہلے آتا تھا۔ میں نے پاس دکھا دیا...... کنڈیکٹر مطمئن ہو کر پیچھے کی طرف لوٹ گیا۔

محترم نے ہمت کی اور پوچھا...... میں تو ویسٹ ہائیم جا رہا ہوں۔ آپ کہاں جا رہے ہیں۔؟

''ایسٹ ہائیم۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

وہ کہنے لگے...... ''میں آپ کی معلومات سے متاثر ہوا ہوں۔ ابھی گھنٹہ بھر کا سفر اور ہے۔ کیا خیال ہے آپ کے علم سے تھوڑا سا استفادہ نہ کر لیا جائے۔ آپ مجھے مقامی نہیں لگتے۔...... میں یہ نہیں پوچھونگا کہ آپ کون ہیں۔ کس ملک سے آئے ہیں اور کیوں آئے ہیں......؟ ۔ یہ ذاتی سوالات ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ برا مان جائیں۔ یہ بتائیں یہ ملک اور اس کے رہنے والے آپ کو کیسے لگے......؟''

''یہ ملک خاصا ٹھنڈا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ برفانی خطہ میں واقع ہے۔ پھر اس پر سورج کی شعائیں کبھی بھی سیدھی نہیں پڑتیں۔ ہمیشہ ترچھی پڑتی ہیں۔ جن میں حدت کم ہوتی ہے۔ چنانچہ یہاں گھاس کبھی خشک نہیں ہوتی اور مٹی وغیرہ کو دبائے رکھتی ہے۔ اس لئے دھول مٹی نہیں اڑتی جس کے نتیجہ میں صفائی ستھرائی زیادہ ہے۔ ہریالی ہونے کی وجہ سے یہاں خوبصورتی زیادہ ہے۔ شمالی علاقہ یعنی اسکاٹ لینڈ پہاڑی ملک ہے اور ظاہر ہے زمین میں جتنے نشیب و فراز ہونگے علاقہ اتنا ہی زیادہ خوبصورت ہوگا۔ جنوبی اور وسطی علاقے یعنی انگلینڈ میں زیادہ پیچ و خم نہیں بلکہ زیادہ تر ہموار ہے اس لئے لوگ بھی تیز طرار ہیں اور چالاک بھی۔ جوں جوں شمال یعنی اسکاٹ لینڈ کی طرف جائیں زمین اونچی ہوتی چلی جاتی ہے اور اسی حساب سے لوگ قد میں اونچے لمبے، جفاکش اور بھولے بھالے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور اسی حساب سے اکھڑ اور خونخوار بھی ہیں۔ رہ گیا ویلز۔ تو وہ ایک چھوٹی سی دیہاتی ریاست سی ہے۔ لوگ دیہاتی اور سیدھے سادے ہیں۔ اب باقی بچا آئر لینڈ...... تو وہ آپ لوگوں سے پناہ مانگتا ہے اور الگ رہنا چاہتا ہے۔'' میں نے ہنس کر طنزیہ انداز میں کہا......

فضا میں ایک دفعہ پھر ہلکا سا قہقہہ گونجا......

''بہت خوب۔ اتنا عمدہ تبصرہ اور تجزیہ تو کوئی انگریز بھی نہ کر سکے گا برطانیہ اور اس کے لوگوں کا۔!اچھا۔ یہ بتائیں کہ یہاں کے لوگ کیسے لگے آپ کو۔؟''

''جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔''میں نے ایک لحظہ سوچ کر جواب دینا شروع کیا...... ''وہ انگریز قوم کا ڈسپلن ہے۔

میں نے نوٹ کیا ہے کہ اگر تین آدمی بھی کھڑے ہیں بس اسٹاپ پر تو بس کے آنے پر قطار بنا لیتے ہیں اور اپنی اپنی باری پر بس میں سوار ہوتے ہیں۔ یہی حال دوسری جگہوں پر بھی دیکھا ہے جہاں بھی لوگوں کا جمگھٹا ہوا لوگوں نے قطاریں بنالیں اور بغیر کسی دھینگا مشتی کے آرام اور خاموشی سے اپنی باری پر کام کیا۔''

''اب آپ پوچھیں گے انگریز قوم نے یہ ڈسپلن کہاں سے حاصل کیا۔؟''

''جی......!'' ......میرا غصہ ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔

''آپ نے صلیبی جنگوں کے بارے میں پڑھا ہوگا جنہیں دو احمق قومیں بلاوجہ لڑتی رہیں''

احمق قوم کے نام پر مجھے پھر غصہ سا آ گیا۔ ظاہر ہے یہ مقدس جنگیں تھیں۔ عیسائی اور مسلمان قومیں۔ فلسطین پر قبضہ کے لئے لڑتی رہیں۔ یہ احمق کہنے والا کون ہے۔؟

''جی ہاں......'' میں نے بھی تیزی سے بات کاٹی۔ میرے ذہن میں ایک صلیبی جنگ ابھر آئی تھی۔ جو میں نے کبھی بچپن میں پڑھی تھی۔ ''میں نے بھی ان احمقانہ صلیبی جنگوں کے بارے میں پڑھا ہے۔ مجھے تو صدیوں پر پھیلی ان آٹھ نو بڑی بڑی جنگوں میں سے ایک جنگ یاد رہ گئی ہے۔ نہ معلوم چوتھی تھی یا پانچویں۔ جس میں ایک بھی تیر نہیں چلا تھا۔ ایک بھی تلوار حرکت میں نہیں آئی تھی۔ خون کا ایک بھی قطرہ نہیں بہا تھا لیکن اس میں دنیا کا غالباً سب سے بڑا المیہ وجود میں آ گیا تھا......''

''تمہارا اشارہ ننھے فرشتوں کے اغوا کی طرف ہے؟'' ان صاحب نے دھیرے سے پوچھا......''آپ اس کے بارے میں کیا جانتے ہیں......؟''

میں نے جوش میں کہنا شروع کیا۔

''میں یہ جانتا ہوں کہ جب پے در پے شکستوں کے بعد متعصب اور تنگ نظر پادری یورپی حکومتوں کو مسلمانوں سے جنگ کرنے اور انہیں ارض مقدس یعنی فلسطین سے باہر نکالنے پر

آمادہ نہ کر سکے تو ان حکومتوں کو غیرت دلانے کے لئے یہ کام ننھے فرشتوں کے سپرد کر دیا۔ یہ ننھے فرشتے دراصل آٹھ سے پندرہ سال کی عمر کے ننھے منے بچے تھے جو جذبہ جہاد کی وجہ سے پیدل ہی گھروں سے چل پڑے کہ چل کر ارض مقدس کو جہاد کے ذریعے آزاد کرائیں۔ ابتدا میں ان کی تعداد چند درجن تھی۔ جن جن علاقوں سے بچوں کی یہ فوج گزری۔ حکومتوں اور عوام نے ان کی پذیرائی کی اور ان کے جذبے کو سراہا لیکن عملی طور پر ان کے لئے کچھ نہ کیا۔ ہاں جگہ جگہ سے مزید لوگ اور بچے ان کے مقدس جہاد میں شریک ہونے کے لئے ان کے ساتھ چل پڑے یہاں تک کہ ان کی تعداد پانچ ہزار کے لگ بھگ پہنچ گئی۔ سفید لباس اور سفید اونچی ٹوپی جس پر سرخ دھاری کھنچی ہوئی تھی، پہنے یہ بچے بہت معصوم اور خوبصورت دکھائی دیتے تھے۔ وینس کے جہاز رانوں نے اپنے جہازوں میں انہیں مفت سمندر پار کرانے کی پیشکش کی جو ننھے فرشتوں نے قبول کر لی لیکن وینس کے ان بردہ فروش جہاز راں عیسائیوں نے ان بچوں کا کیا حشر کیا اس کا تذکرہ تاریخ میں کم ہی ملتا ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ روم کے بازاروں میں ان ننھے فرشتوں کو فروخت کر دیا گیا۔

یہ مقدس ننھے فرشتے جو مقدس جہاد کے لئے گھروں سے نکلے تھے پھر کبھی اپنے گھروں کو نہ لوٹ سکے۔ کیا پتہ موجودہ امریکہ میں ان بچوں کی نسلیں آباد ہوں۔"

"آپ نے تو ایک ایسی المیہ داستان بیان کر دی جس پر یورپ ہمیشہ ہی شرمندہ رہا ہے اور اس کے تاریخ دان اس کو چھپانے کی کوشش کرتے رہے۔ ویسے یہ المیہ ہوا ضرور ہے۔ وینس کے بردہ فروش تاریخ میں مشہور ہیں۔ لیکن میں تو یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ یورپ نے ڈسپلن کہاں سے حاصل کیا۔؟"

"جی فرمایئے......!" میں ہمہ تن گوش ہو گیا...... میرا غصہ بالکل ختم ہو چکا تھا۔

"ان ہی صلیبی جنگوں میں...... عیسائی و یورپی حکومتوں کو کھلی کھلی شکستیں ہوئیں۔ جب ان کا سلسلہ ختم ہوا تو فاتح مسلمان فتح کے نشہ میں مست ہو کر غافل ہو گئے لیکن عیسائیوں نے اس پر کمیشن قائم کیا جس نے مسلمانوں کی فتح اور عیسائیوں کی شکست کے اسباب معلوم کئے۔ مسلمانوں کی فتح کے بارے میں جو اہم ترین تحقیق تھی وہ یہ کہ مسلمانوں کو بنیادی طور پر جنگ کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ ان کے نبی محمدؐ نے عبادت کے لبادے میں فوجی تربیت کا اہتمام کیا تھا۔

"اس پر میرے کان کھڑے ہوئے اور میں پوری طرح متوجہ ہو گیا۔" جی دوبارہ فرمایئے میں سمجھا نہیں۔"

''آپ نے کبھی مسلمانوں کو اپنی عبادت جسے وہ نماز کہتے ہیں۔ کی تیاری کرتے دیکھا ہے۔ اگر دیکھیں تو آپ کو حیرت ہوگی کہ ایک شخص کے بلاوے پر سب مقررہ وقت پر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ یکساں انداز میں ہاتھ منہ دھو کر فوجی انداز میں خود بخود قطاریں بنا لیتے ہیں اس انداز سے کہ مرد آگے۔ بوڑھے ان کے پیچھے اور بچے سب سے پیچھے۔ پھر کندھے سے کندھا اور ٹخنہ سے ٹخنہ ملا ہوا۔ اور یہ کام وہ خود بخود کرتے ہیں۔ کوئی ان کو بتاتا نہیں۔ پھر یہ فوجی مشق دن میں پانچ دفعہ کرتے ہیں اس طرح وہ اس فوجی عمل کے عادی ہو جاتے ہیں۔ یہ فوجی ٹریننگ نہیں تو پھر کیا ہے؟ اس کے بعد فوجی تربیت کا دوسرا اور اہم مرحلہ اپنے کمانڈر کا حکم ماننا اور اس کی ایک آواز پر بلا چوں و چرا عمل کرنا ہے۔ اب دیکھو کہ نماز میں ان کا ایک کمانڈر رہوتا ہے اس کے ایک حکم پر تمام مسلمان جھک جاتے ہیں۔ سجدے میں چلے جاتے ہیں۔ اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی فوجی عمل کا ایک حصہ ہے۔ اس کے بعد فوجی ٹریننگ میں کیا کمی رہ جاتی ہے۔ کیا یہ سب ملا کر ایک بہترین فوجی تربیت نہیں بنتی۔ دنیا کے کسی اور مذہب میں ایسی تربیت نہیں ہے۔

تمہیں شاید معلوم نہ ہو کہ مسلمانوں کی جنگوں سے پہلے جو جنگیں ہوا کرتی تھیں ان میں سپاہیوں کے دو غیر منظم گروہ ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے تھے۔ ان میں صف بندی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ کسی قسم کی تنظیم نہیں تھی۔ کمانڈر کا کام جنگ کا حکم دینے کے بعد ختم ہو جایا کرتا تھا اور اس کے بعد ہر سپاہی اپنی انفرادی لڑائی لڑا کرتا تھا۔ ان صلیبی جنگوں میں پہلی بار یورپی فوجیں مسلمانوں کے مدمقابل ہوئیں تو انہوں نے صف بندی دیکھی اور کمانڈر کی آواز پر جنگ ہوتے دیکھی یہ ان کے لئے بڑی عجیب و غریب چیز تھی۔ چنانچہ اس کمیشن نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ ہماری فوجوں میں تنظیم اور صف بندی کی کمی ہے۔ اگر ہمیں مسلمانوں سے جنگ جیتنی ہے تو یہ تنظیم پیدا کرنی ہوگی۔ چنانچہ جہاں یورپ کی فوجوں نے اپنے اندر ڈسپلن پیدا کرنے کی ابتدا کر دی وہاں عوام میں بھی ڈسپلن قائم کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس بات کو تین چار سو سال ہو چلے ہیں اور ان تین چار سو سالوں کی ریاضت کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے......''

''گویا...... یورپ اور برطانیہ کا ڈسپلن صلیبی جنگوں کا نتیجہ ہے۔؟'' میں نے پوچھا۔

''بالکل......'' وہ صاحب بولے۔

میں حیرت سے منہ کھولے اس شخص کی باتیں سن رہا تھا جس کو یہ پتہ نہیں کہ وہ ایک مسلمان سے باتیں کر رہا ہے اور اس مسلمان سے جسے خود بھی علم نہیں کہ انگریزوں نے یہ ڈسپلن اس

کے ہم قوموں سے حاصل کیا ہے۔

وہ کچھ دیر خاموش رہا...... پھر کہنے لگا۔ ''فوجی تربیت کی معاونت کے لئے اخلاقی تربیت بہت لازمی ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ محمدؐ نے فوجی تربیت کے ساتھ ساتھ اپنے وحشی عربی ساتھیوں۔ جن کے نزدیک اخلاق نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ کی اخلاقی تربیت کی۔ ان میں سچ بولنے۔ وعدہ پورا کرنے۔ ایمانداری برتنے اور ایک دوسرے کا ساتھ دینے جیسے جذبے پیدا کئے۔ سب سے عظیم نعرہ جو انہوں نے لگایا۔ وہ تھا۔ ''ہر انسان برابر ہے''۔ اس نعرے نے دنیا بھر کو تسخیر کرلیا۔ یورپ میں ان دنوں بدترین قسم کا جاگیرداری نظام رائج تھا۔ اخلاقی اقدار نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ریاست اور کلیسا نے گٹھ جوڑ کر کے عوام کو عملی طور پر غلام بنا رکھا تھا۔ مذہب انسانوں کو دہشت زدہ کرنے کے کام آتا تھا۔ سچا عیسائی نہ ہونے کے الزام میں ہزاروں عیسائی قتل کر دیئے گئے تھے عوام خوفزدہ رہتے تھے۔ اس لئے مسلمان جہاں بھی گئے ان کو خوش آمدید کہا گیا۔ مسلمانوں نے اپنے اخلاق کے بل بوتے پر کئی عظیم الشان کامیابیاں حاصل کیں۔ اس کمیشن نے اس طرف بھی اشارہ کیا کہ مسلمانوں کی کامیابی کی ایک بڑی وجہ ان کا اخلاقی معیار ہے۔ ہمیں بھی اپنا معیار بلند کرنا ہوگا۔ چنانچہ یورپ بھر میں اخلاق سدھارنے کی کئی تحریکیں چلیں۔ انسانی فطرت بدلی نہیں تبدیل ضرور کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ اس میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی اور اخلاقی معیار بلند ہوئے۔ چنانچہ جب عیسائیوں نے ڈسپلن اور اخلاق حاصل کرلیا تو پھر انہوں نے مسلمانوں پر پے در پے کامیابیاں حاصل کیں اور آج جو کچھ تم دیکھ رہے ہو اسی کا نتیجہ ہے۔

مجھے اس شخص کی باتوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ کوئی عیسائی یقیناً اس قسم کی باتیں نہیں کر سکتا۔ یقیناً یہ کوئی مسلمان ہوگا۔

''کیا آپ مسلمان ہیں یا شائد پھر عیسائی؟'' میں نے انتہائی سنجیدگی سے پوچھا۔

''مسلمان تو میں قطعی نہیں ہوں! پھر پتہ نہیں میں عیسائی بھی ہوں کہ نہیں۔؟ یہ ضرور ہے کہ میں عیسائی گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ یا پھر یہ کہ ہفتہ میں ایک دن اتوار کو گرجا گھر میں جاتا ہوں۔ شاید خدا کی ثنا سے زیادہ یار دوستوں یا گرل فرینڈز سے ملنے کے لئے۔ اگر یہ معیار ہوں تو میں واقعی عیسائی ہوں۔ خدا کو بھی میں نے حقیقت کے طور پر نہیں بس ایک عقیدے کے طور پر قبول کر رکھا ہے۔ کرائسٹ اور اس کے فرمان یعنی بائبل کو بھی سرسری طور پر کہانی کے انداز میں پڑھا تھا اب تو یاد بھی نہیں کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ جو احکامات اس میں درج ہیں میں تو ان سے واقف بھی

نہیں پھر میں کیوں کر دعویٰ کر سکتا ہوں کہ میں سچا عیسائی ہوں۔؟"

یہ حضرت تو خطرناک حد تک صاف گو اور بے باک نکلے۔ اپنے آپ کو بھی نہیں بخشا۔ سچ بولنے کے ریکارڈ توڑ رہے ہیں۔ میں نے سوچ سوچ کے سوال کیا۔

"صلیبی جنگوں کے متعلق آپ نے ابھی ابھی کہا تھا کہ دو احمق قومیں یہ جنگیں لڑتی رہیں۔ آپ اس نتیجہ پر کیسے پہنچے۔؟"

ان حضرت نے ہیلمٹ سر پر سے اتارا۔ سر کھجایا۔ میری طرف غور سے دیکھا اور بولے۔

"مجھے اس سے غرض نہیں کہ آپ کس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔ میں تو سچ بولتا ہوں چاہے کوئی بُرا مانے۔ میں تاریخ دان ہوں۔ تاریخ بہت بے رحم ہوتی ہے اسے لوگوں کے احساسات اور جذبات سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ پھر نرم اور میٹھے الفاظ سے یہ بدل تو نہیں جاتی۔ سنو۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ ان کا مذہب اسلام کوئی نیا نہیں بلکہ اس مذہب کا تسلسل ہے جو حضرت آدمؑ لائے تھے اور پھر وہ مختلف انبیا جن میں موزز (حضرت موسیٰ) اور جیسز (حضرت عیسیٰ) کے توسط سے ہوتا ہوا محمدؐ تک پہنچا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ معمولی سے فرق کے ساتھ اسلام اور عیسائیت ایک ہی مذہب ہے۔ دونوں کا بھیجنے والا ایک ہی ہے۔"

میں خاموش رہا

"اگر جیسز اور محمدؐ کے ماننے والوں کا مذہب ایک ہی ہے اور دونوں مذاہب کے ماننے والے ایک ہی خدا کو ماننے اور اس کے احکامات پر عمل کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ تو پھر اس مشترکہ مذہب کا سب سے بڑا حکم تو انسان سے محبت کرنا اور اس کی عزت و تکریم ہے تو پھر یہ دونوں آپس میں کیوں ایک زمین کے ٹکڑے کی خاطر لڑتے رہے اور ناحق ایک دوسرے کا خون بہاتے رہے...... عیسائیت اور اسلام' دونوں ہی محبت' دوستی اور مل جل کر ساتھ رہنے کا درس دیتے ہیں۔ عیسائیت تو سراپا محبت ہے اور اسلام اس سے بھی بڑھ کر پیار محبت کا دعویٰ دار ہے۔ پھر کیوں دونوں کے ماننے والے ایک دوسرے کے خلاف تلوار اٹھاتے رہے۔؟ یہ حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔؟"

دلیل خاصی وزنی تھی۔ میں نے ہمت کر کے سوال کیا۔

"پھر آپ ہی بتائیں کہ یہ دونوں احمق قومیں کیوں لڑتی رہیں آپس میں؟ کیا ان کی سمجھ میں اتنی سی بات نہ آسکی جو آپ نے سمجھا دی۔؟"

اس نے آنکھیں بند کر لیں اور ایک شفیق استاد کی طرح سمجھانا شروع کر دیا۔

''یاد رکھو۔ دنیا کا کوئی بھی مذہب۔ خاص طور پر الہامی مذاہب ایک دوسرے سے نفرت۔ حقارت اور جنگ وجدل کی تعلیم نہیں دیتا۔ کیونکہ خدا کا مقصد کبھی بھی یہ نہیں رہا کہ اس کی مخلوق ایک دوسرے کے ہاتھوں تباہ ہو...... ہر مذہب پیار محبت کی تعلیم دیتا ہے۔ لیکن جب انسان مذہب کے احکامات کی طرف سے آنکھیں بند کر کے ذاتی مفادات کے پیچھے لگ جائے بلکہ مذہب کو بھی اپنے وقار، شان وشوکت اور کمائی کی خاطر ہتھیار بنا لے تو پھر یہ جنگیں وجود میں آتی ہیں...... چاہے وہ صلیبی ہوں چاہے عام، مذہب نے کبھی جنگوں کی اجازت نہیں دی سوائے ان کے جو کسی ظلم کے خلاف یا ذاتی حفاظت کے لئے لڑی جائیں۔ یہ جنگیں بھی ذاتی خواہشات کا مظہر تھیں۔ کتنا بڑا المیہ ہے کہ خدا اور اس کے رسولوں نے انسان کو انسان سے محبت کا درس دیا لیکن انسان نے اسے غلام بنالیا۔!''

وہ خاموش ہوگیا۔

میں نے اسے کریدا۔ ''آپ کی معلومات کا ذخیرہ قابل قدر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے مذاہب عالم پر خاصی تحقیق کی ہے۔ یہ تو بتائیے کہ آپ نے ریسرچ کے لئے اس میدان کو کیوں منتخب کیا۔؟ کیا آپ کو مذہب سے بہت دلچسپی ہے؟''

اس نے گہری نظروں سے میری طرف دیکھا جیسے ٹٹول رہا ہو کہ میں سنجیدہ ہوں یا اس سے مذاق کررہا ہوں۔ پھر شاید میری آنکھوں کی چمک سے مطمئن ہوگیا۔ سر کو سیٹ ریسٹ پر ٹکادیا اور خود کلامی کے انداز میں بولنے لگا......

''مذہب سے میری وابستگی فطری چیز تھی۔ میں ایک عیسائی گھرانے میں پیدا ہوا۔ میرا باپ کٹر مذہبی اور ایک گرجا گھر میں پادری تھا۔ مجھ سے بھی توقع رکھتا تھا کہ میں پادری بن جاؤں اور اگر پادری نہ بن سکوں تو کم از کم ایک سچا عیسائی ضرور بن جاؤں۔ وہ مجھے باقاعدہ گرجا گھر لے جایا کرتا تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ میرا دل کبھی بھی گرجا گھر میں نہیں لگا کیونکہ وہاں کوئی بھی خلوص نیت سے عبادت کے لئے نہیں آتا تھا۔ بڑے بوڑھے ایک دوسرے سے مل کر اپنا غم بانٹنے آتے تھے۔ لڑکے لڑکیاں نئے نئے کپڑے پہن کر بن ٹھن کر معاشقہ لڑانے آتے تھے۔ بچے سیر تفریح کے لئے آتے تھے۔ جس چیز نے مجھے عیسائیت سے بد دل کیا وہ پادری صاحب کا ایک وعظ تھا جس میں انہوں نے ثابت کیا کہ دنیا میں ہر آنے والا گناہ گار ہے کیونکہ حضرت آدم اور اماں حوا نے جنت میں جو گناہ کیا تھا اس کا کفارہ ہر شخص نے بھرنا ہے۔ ان دنوں میں چھوٹا سا ہوا کرتا تھا۔ یہ

بات میرے حافظے میں محفوظ رہ گئی۔ شام کو میں اپنے ہمسائے کے گھر گیا جس کا تین چار ماہ کا بہت ہی خوبصورت بچہ تھا جو مجھ سے خاصا مانوس تھا۔ بچہ مجھے دیکھتے ہی مسکرانے اور پھر کلکاریاں مارنے لگا تا کہ میں اسے اٹھالوں۔ مجھے یکدم پادری کا وعظ یاد آ گیا لیکن میرے دل نے پادری کی بات ماننے سے صاف انکار کر دیا کہ اتنا خوبصورت معصوم بچہ جسے اپنے آپ کی بھی خبر نہیں اور جو اپنے اوپر بیٹھی مکھی بھی اڑا نہیں سکتا۔ کیوں کر گناہگار ہوسکتا ہے؟ وہ تو فرشتوں سے بھی زیادہ معصوم ہے۔ اس دن سے میرے دل میں شکوک پیدا ہو گئے۔ پھر ایک دن پادری صاحب نے وعظ میں فرمایا کہ حضرت عیسیٰ نے دنیا میں ہی صلیب پر چڑھ کے دنیا بھر کے انسانوں کے گناہ معاف فرما دیئے...... تو میں نے بھولے پن سے اپنے پادری باپ سے یہ سوال کر ڈالا کہ حضرت عیسیٰ سے قبل تو ہزاروں پیغمبر اور اللہ کے برگزیدہ بندے آ چکے ہیں تو کیا حضرت عیسیٰ کے تشریف لانے اور صلیب پا جانے تک وہ سب ہی گناہگار تھے اور پھر کیا حضرت عیسیٰ بھی صلیب پانے تک گناہگار تھے کیونکہ گناہ تو حضرت عیسیٰ کے صلیب پر چڑھنے کے بعد ہی معاف ہوئے تھے۔ اگر یہ سب گناہ گار ہیں تو بے گناہ کون ہوا؟ اس پر پادری صاحب اور میرے باپ نے جواب دینے کی بجائے میری ٹھکائی کر دی اس الزام میں کہ میں نے پیغمبر کی شان میں گستاخی کی ہے۔ اس ٹھکائی نے میرے اندر بغاوت پیدا کر دی اور میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ بڑا ہو کر...... حق اور سچائی کی تلاش کرونگا اور جو سچا مذہب ہوگا اسے اختیار کرونگا......" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

"پھر آپ نے سچائی کی تلاش کی۔؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"جی ہاں۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں میں بچپن سے ہی سچائی اور حق کا متلاشی تھا۔ میں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی پھر ایک دن حق کی تلاش میں گھر سے نکل گیا۔ ملکوں ملکوں بستیوں بستیوں مارا مارا پھرتا رہا۔ مختلف مذاہب کے علماء، پادریوں، پنڈتوں، کاہنوں سے ملتا رہا۔ لوگوں سے ولی اللہ۔ اللہ کے نیک و برگزیدہ بندوں کا پتہ پوچھتا رہا۔ تا کہ ان سے مل کر سچائی کی تلاش کر سکوں"۔

"پھر ملی سچائی آپ کو۔؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں...... بلکہ میں اور الجھتا چلا گیا...... کیونکہ ایسی ایسی باتیں سننے میں آئیں جنہیں عقل سلیم تسلیم نہیں کر سکتی"۔

"پھر آپ کس نتیجہ پر پہنچے۔؟" میں نے دریافت کیا!

"میری بیس بائیس سالہ تحقیق کا نچوڑ یہ ہے کہ مذہب ابتدا ہی سے انسان کی ضرورت رہا

ہے۔اسے دراصل ایک ایسی عظیم قوت کی تلاش تھی جو اسے۔اس کے خاندان اور معاشرے کو بدی کی قوتوں سے محفوظ رکھ سکے اور یہ بدی کی قوتیں کم علمی کی بنا پر اس کی اپنی خود ساختہ تھیں۔اس سے اسے خدا۔اس کی عظیم قوت اور اختیارات کا پتہ چلا۔اس نے اس عظیم قوت کی تلاش وتشریح کی کوشش کی...... جو ارتقا پذیر انسانی عقل کے مطابق' پند ونصائح وحمد وثنا سے شروع ہوئی سحر وجادو اور اس کے بعد انسانی ساختہ مذاہب سے ہوتی ہوئی الہامی مذاہب پر ختم ہوگئی...... جہاں خدا خود اپنے بندوں کی مدد کو آیا اور ان پر اپنے پیغمبر بھیجے اور کتابیں اتاریں۔میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کا ہر مذہب۔ چاہے تخلیق ہوا ہو میرا مطلب یہ ہے کہ انسان نے بنایا ہو...... یا خدا کی طرف سے نازل ہوا ہو۔ اگر اس وقت کے مقامی حالات کے مطابق ہو...... خدا کا چاہے دھندلا سا تصور ہی دیتا ہو۔ انسانوں کو آپس میں پیار محبت کا درس دیتا ہو اور عظمت آدم کا درس دیتا ہو۔سچا ہے۔کیوں کہ خدا نے انسان کو اپنے نائب کے طور پر اپنی شکل پر پیدا کیا اور اس لئے پیدا کیا کہ وہ اس کی عبادت کرے اور آپس میں پیار محبت سے رہے۔اور بس یہی خدا کا مذہب ہے۔سچا اور پسندیدہ...... لیکن کیا کیا جائے انسانی فطرت میں گندھی ہوئی برائی۔جس کو کنٹرول کرنا ان مذاہب کا اولین مقصد رہا ہے۔ان سے کبھی بھی پوری طرح کنٹرول نہ ہوسکی۔وقتی طور پر دب ضرور گئی لیکن فوراً ہی اسپرنگ کی طرح دوبارہ ابھر آئی۔

''جی ہاں......''میں نے ہنکارا ابھرا۔میں کچھ سمجھا۔کچھ نہ سمجھا۔

وہ پھر شروع ہوگیا......

''دوسری بات یہ کہ جو مذہب جتنا پرانا ہے۔اتنا ہی سادہ اور چھوٹا ہے یعنی مختصر تعلیمات والا۔کیونکہ ان زمانوں میں لوگوں کی ضروریات بھی اتنی ہی مختصر تھیں اس کے علاوہ انسانی سوجھ بوجھ اور عقل بھی اتنی ہی محدود تھی۔جوں جوں انسانی عقل ارتقائی منازل طے کرتے کرتے پختہ ہوتی گئی۔ان کے مسائل بھی بڑھتے گئے اس لئے ان کے مداوے کے لئے آنے والا ہر مذہب بھی نسبتاً اتنا ہی وسیع اور پختہ ہوتا چلا گیا...... یہاں تک کہ عرب میں آنے والے واحد پیغمبر محمدؐ نے اس سلسلہ کے مکمل ہونے کا اعلان کر دیا۔ورنہ شاید اور بھی مدارج طے ہوتے''۔

اس اثنا میں ایسے محسوس ہوا کہ ہم سفر کرنے کی بجائے ہوا میں معلق ہیں اور حرکت نہیں کر رہے۔بس بھی خالی تھی۔باہر جھانک کر دیکھا تو ایک چھوٹا سا ہجوم کھڑا چہ میگوئیاں کرتا نظر آیا جس میں بس کا ڈرائیور اور کنڈیکٹر کھڑے نظر آئے۔پتہ لگا کہ بس کا پچھلا ٹائر برسٹ ہو چکا ہے اس

لئے بس کھڑی ہو چکی ہے۔ ڈپو پر بذریعہ ٹیلی فون اطلاع دی جا چکی ہے۔ پنکچر لگانے والا نیا ٹائر لے کر آنے ہی والا ہے۔ اچھا ہوا۔ مجھے بھی مذاہب کے بارے میں معلوم کرنے کے لئے کچھ وقت مل گیا......

میں نے آغاز کیا۔" آپ نے تو مذاہب عالم کے متعلق ایک نظریہ پیش کیا ہے جو مجھے پسند آیا ہے۔ اب آپ اپنی تحقیق سے حاصل شدہ تاثرات بتایئے......"

"تحقیق سے قبل میں نے مذاہب کے بارے میں مختلف لٹریچر جمع کیا اور اسے پڑھا تا کہ ابتدائی معلومات حاصل کر سکوں ان کو پڑھ کر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ دنیا میں دو قسم کے مذاہب ہیں۔ الہامی یعنی خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے اور غیر الہامی یعنی انسان کے ساختہ......ان دونوں کو بحیرہ عرب جدا کرتا ہے۔ اس کے مغرب میں الہامی مذاہب ہیں اور مشرق میں غیر الہامی۔ ان کے فلسفے بھی جدا جدا ہیں۔ مغرب میں چار بڑے بڑے الہامی مذاہب ہیں۔ ایران کا زردشت یا پارسی مذہب۔ فلسطین کی یہودیت اور عیسائیت اور صحرائے عرب کا اسلام...... یہ سب خدا پر یقین رکھتے ہیں اور ان کے پیغمبروں پر باقاعدہ صحیفے اترے ہیں۔ بحیرہ عرب کے مشرق کے مذاہب میں خدا کا تصور کہیں کہیں ہے۔ وہ بھی مدھم مدھم سا۔ لیکن خدا سے زیادہ یہ مذاہب دیوتاؤں پر یقین رکھتے ہیں۔ ان پر کتابیں ضرور اتری ہیں لیکن ان کے قوائد وضوابط اور عبادت کے طریقے انسانوں نے متعین کئے ہیں اور ان میں باقاعدہ ردوبدل بھی ہوتا رہا ہے۔ اس کے علاوہ افریقہ' امریکہ اور آسٹریلیا میں ہزاروں کی تعداد میں چھوٹے چھوٹے گمنام سے مذاہب ہیں جن کے ماننے والوں کی تعداد چند درجن سے لے کر لاکھوں تک ہے۔ یہ عجیب وغریب عقائد رکھتے ہیں۔ درختوں' جانوروں اور غیر مرئی چیزوں سے ڈرتے ہیں اور انہیں خدا تسلیم کرتے ہیں۔

"تفتیش کا آغاز میں نے الہامی مذاہب سے کیا۔ کتابوں کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ دنیا کا سب سے قدیم الہامی مذہب "دین ابراہیم" تھا۔ جو موجودہ الہامی مذاہب کی ماں تسلیم کیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہودیت' عیسائیت اور اسلام اسی مذہب کی پیداوار ہیں۔ میں نے اس مذہب کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ یہ مذہب خود تو ختم ہو چکا ہے لیکن دوسرے مذاہب میں زندہ ہے۔

یہودیت کے مطالعے نے مجھے بہت مایوس کیا کیونکہ یہ ایک نسلی مذہب ہے تبلیغی نہیں۔ یہ صرف بنی اسرائیل کے لئے مخصوص ہے اور اس میں کوئی دوسرا شخص شامل نہیں ہو سکتا یعنی اگر آپ یہودی مذہب اختیار کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ خدا نے اس قوم کے پیغمبر

حضرت موسیٰ کو حوصلہ دلانے کے لئے کچھ وعدے وعید کئے تھے۔ کہ میں تجھے دنیا کی بادشاہت دونگا۔ تیرا خاندان بڑا کرونگا۔ اس میں برکت دونگا۔ وغیرہ وغیرہ......اور یہ وعدے اس قوم کی جڑوں میں بیٹھ گئے۔ ان وعدوں کی بنا پر یہ اپنے آپ کو اللہ کی برگزیدہ۔ خاص اور چنی ہوئی قوم Chosen People سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا بس ان ہی کا ہے۔ اور دنیا پر حکمرانی کا حق بھی ان ہی کا ہے۔ اور یہ کہ دنیا کے دیگر مذاہب۔ قومیں اور نسلیں ان سے کمتر ہیں اور ان کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ اور یہ احساس برتری اس قوم کے بچے بچے کی رگ رگ میں سمایا ہوا ہے۔ اور اس نسلی تفاخر نے کہ "وہ خدا کے چہیتے ہیں اور خدا ان سے کسی قسم کی باز پرس نہیں کرے گا"۔ اس قوم کو انتہائی بے رحم بلکہ سنگدل بنا دیا۔ انہوں نے اپنے پیغمبروں تک کو نہ چھوڑا۔ کون سی برائی ایسی تھی جو ان میں نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ نسلی تفاخر خدا کی منشا کے خلاف تھا۔ اس کے نزدیک تو اس کی پیدا کردہ تمام مخلوق برابر ہے۔ آخر کار یہی نسلی تفاخر اس قوم کو لے ڈوبا......کلدانی شہنشاہ بخت نصر نے اس قوم کو تباہ و برباد کر دیا۔ بڑی تعداد کو قتل کر دیا۔ جو باقی بچے ان کو غلام بنا کے ساتھ لے گیا۔ اس کے بعد یہ قوم پوری دنیا میں تتر بتر ہو گئی اور آج دو ہزار سال سے ان کا نہ اپنا وطن ہے نہ اپنا ٹھکانا......اس دوران ہر قوم نے حتی المقدور اس قوم کی پٹائی کی۔ ابھی کل کی بات ہے دوسری جنگ عظیم سے قبل اور دوران......ہٹلر نے اس قوم کا جو حشر کیا وہ سب کو یاد ہے۔

عیسائیت جیسا کہ میں سمجھتا ہوں۔ بذات خود یہودیت کی ایک شاخ تھی بلکہ اس کا ایک باغی گروہ......بعد میں کچھ حق پرست لوگوں نے اسے یہودیت سے علیحدہ مذہب قرار دے دیا۔ کیونکہ یہودیوں کے مغرور اور متکبر لوگوں سے گزارا ناممکن ہو چلا تھا۔ اس مایوسی کی وجہ میں بیان کر چکا ہوں۔

اسلام کے متعلق میں نے تفصیلی تحقیق کی ہے اور لگ بھگ اٹھارہ سال اسے سمجھنے میں گزارے ہیں۔ جزیرہ نما عرب کے ریگستان میں جنم لینے والا یہ مذہب۔ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ یہودیت اور عیسائیت کا اس لحاظ سے تسلسل ہے کہ خدا نے جو پیغام اپنے بندوں کو ان مذاہب کے ذریعے دیا تھا۔ وہی پیغام یہ بھی لے کے آیا ہے کیونکہ اگلی نسلوں نے اسے بھلا دیا تھا۔ لیکن یہ مذہب ان دونوں مذاہب سے اس لئے علیحدہ گنا جاتا ہے کہ یہ پیغمبروں کی سرزمین فلسطین سے باہر نازل ہوا اور اس کے اس قصور کو ان دونوں مذاہب کے ماننے والوں نے آج تک معاف نہیں کیا۔ ویسے دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں اسلام تازہ ترین مذہب ہے۔ اور اس کے پیغمبر کا دعویٰ

ہے کہ خدا نے آج تک جتنے مذاہب اتارے تھے اسلام ان سب کا خلاصہ ہے۔ اور یہ کہ یہ آخری مذہب ہے اس کے بعد نہ کوئی مذہب آئے گا اور نہ پیغمبر...... گویا ہدایت کا راستہ بند ہو گیا......

اس مذہب کی تعلیمات سیدھی سادی اور متاثر کن ہیں اور ان میں انسانی فطرت کا خیال رکھا گیا ہے۔ میں نے اسلامی تعلیمات اور مذہبی کتاب جسے قرآن کہتے ہیں۔ کا مطالعہ کیا ہے اور میں اس سے خاصا متاثر ہوا ہوں۔ دراصل......"

میں نے اسے ٹوک دیا...... کیونکہ میرا دل دھک دھک کرنے لگا تھا۔

"آپ قرآن کی کس بات سے متاثر ہوئے ہیں۔؟"

وہ بولا...... "یہ کتاب ہدایتوں سے بھری ہوئی ہے۔ جس پر عمل کر کے صاف ستھری زندگی گزاری جا سکتی ہے لیکن سرسری طور پر پڑھنے والوں کے لئے اس میں کچھ نہیں۔ اس سے فیض صرف وہ شخص اٹھا سکتا ہے جو اسے پڑھ کر اس پر غور و فکر کرے بلکہ سمجھنے کی کوشش کرے کیونکہ اس میں اشاروں کی زبان استعمال کی گئی ہے جو ہر زمانے کے ترقی کرتے ہوئے ذہنوں کے لئے ہے۔ ہر زمانے کا شخص اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔"

میرا ذہن سائیں سائیں کرنے لگا...... کیا یہ ایک عیسائی کے کلمات ہیں۔؟ کیا عیسائیوں میں بھی ایسے غیر متعصب لوگ موجود ہیں۔ میں نے اسے مزید ٹٹولنے کے لئے پرانے متعصب عیسائیوں کا طرز اختیار کیا۔

"اس کتاب میں محمدؐ نے کیا کچھ کہا ہے۔؟"

ان صاحب نے میری طرف گہری نظروں سے دیکھا جن میں ملامت بھی جھلک رہی تھی پھر ایک لحظہ باہر دیکھا اور پھر کچھ سوچ کے بولے۔

"آپ کی طرح مغربی فلسفی عیسائی پادری اور یہودی لابی بھی قرآن کو محمدؐ کا کلام بتاتے ہیں۔ میں خود بھی یہ سمجھا کرتا تھا۔ لیکن اب مجھے اس پر اس لئے یقین نہیں۔ کہ محمدؐ تو سیدھے سادے۔ ان پڑھ۔ بھیڑ بکریاں چرانے والے تھے۔ انؐ کے پاس اتنی حکمت اور معلومات کہاں سے آئیں جو اس حکمت سے بھری کتاب میں سمو سکتیں...... چنانچہ یہ انؐ کا کلام نہیں ہو سکتا۔ پھر قرآن میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا انداز اتنا جلالی ہے کہ انسان ہل کر رہ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا کلام خدا کا ہی ہو سکتا ہے۔"

میری روح تک خوش ہو گئی۔ مغرب میں ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں۔ میں نے سوچا۔

''پھر آپ نے اس مذہب کو کیوں نہیں اختیار کیا جس سے آپ اتنے متاثر ہوئے ہیں۔؟'' میں نے پوچھا۔

کہنے لگے..... ''اس کی وجہ میں بعد میں بتاؤنگا۔ پہلے میری تحقیق کا دوسرا حصہ سن لو......
الہامی مذاہب سے مایوس ہو کر میں نے غیر الہامی مذاہب کی طرف رجوع کرنے کا فیصلہ کیا۔ سب سے پہلے میری توجہ مشرق بعید یعنی جاپان کے شنٹو مذہب نے کھینچی۔ میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا کیونکہ جاپانیوں نے مدتوں باہر کے لوگوں پر اپنے دروازے بند کر رکھے تھے اس لئے یہ مذہب جاپان سے باہر کبھی نہ جا سکا۔ اس لئے دنیا بھر میں سوائے جاپان کے اس کا کہیں وجود نہیں۔ جاپان کی حیرت انگیز ترقی کو دیکھتے ہوئے خیال ہوا کہ شاید اس ترقی میں اس مذہب کا بھی کوئی ہاتھ ہو۔ چنانچہ اسے آزمایا جائے۔ چنانچہ میں نے جاپان کا سفر کیا۔ جاپان کے دارالحکومت ٹوکیو سے معلوم ہوا کہ جاپان کے پرانے متروک دارالحکومت کیوٹو میں اس کے عالم ملیں گے جو اس سلسلہ میں معلومات فراہم کر سکتے ہیں۔ چنانچہ میں کیوٹو میں شنٹو مذہب کے عالموں سے ملا۔ ان سے جی بھر کے باتیں کیں۔ لیکن میری مایوسی کی انتہا نہ رہی جب یہ معلوم ہوا کہ یہ ہزاروں سال پرانا مذہب ہے غالباً پتھر کے زمانے کا اور اس زمانے کی عقل اور سمجھ کے مطابق ہے۔ اس پر ایمان لانے کے لئے پچاسی کروڑ دیوتاؤں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اس مذہب کے مطابق دنیا کی ہر چیز کے لئے ایک علیحدہ دیوتا یا بھگوان ہے۔ حتیٰ کہ میز پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کا بھی ایک خدا ہے۔ جس قلم سے آپ لکھتے ہیں اس کا بھی ایک خدا ہے۔ اس بس کو چلانے کے لئے لگ بھگ سو علیحدہ علیحدہ دیوتا کام کر رہے ہیں۔

میں نے دل ہی دل میں حساب کیا کہ جاپان کی کل آبادی دس کروڑ کے لگ بھگ ہے جس میں مرد عورتیں اور بچے بھی شامل ہیں۔ پچاسی کروڑ دیوتا ہیں۔ اس حساب سے تو ہر جاپانی کے حصہ میں سالم ساڑھے آٹھ دیوتا آتے ہیں۔ اس لحاظ سے جاپان دیوتاؤں کے معاملے میں نہ صرف خود کفیل ہے بلکہ ضرورت پڑنے پر دیوتا برآمد بھی کر سکتا ہے۔

پھر یہ عجیب وغریب انکشاف بھی ہوا کہ پچاسی کروڑ دیوتاؤں میں سب سے زیادہ طاقت ور سورج دیوتا ہے..... دراصل آج سے پانچ ہزار پہلے جب جاپان میں پتھر کا زمانہ اور قبائلی رواج تھا۔ اس کا حکمران قبیلہ سورج کا پجاری تھا۔ پھر لگ بھگ دو ہزار سال قبل اسی قبیلہ کے ایک حکمران نے سورج دیوتا کی اولاد ہونے کا دعویٰ کر دیا جسے جاپان بھر میں تسلیم کر لیا گیا۔ موجودہ شاہی

خاندان اسی حکمران کی نسل سے ہے اور سورج دیوتا کی اولاد کہلاتا ہے۔ چنانچہ شہنشاہ جاپان کو سورج دیوتا کی اولاد ہونے کے ناطے جاپانی قوم کا دیوتا ہونے کا درجہ بھی حاصل ہے۔ چنانچہ جاپانی قوم اپنی عبادت میں شہنشاہ کی سلامتی کی دعا کرتی ہے۔ اپنے لئے کچھ نہیں مانگتی۔ جاپانی اپنے شہنشاہ پر جان نچھاور کرنا ایک اعزاز سمجھتے ہیں کیونکہ شنٹو مذہب انہیں یہی کچھ سکھاتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں شہنشاہ کے نام پر لاکھوں جاپانیوں نے اپنی جانیں قربان کر دیں اور جس دن شہنشاہ جاپان نے شکست تسلیم کرتے ہوئے صلح نامہ پر دستخط کئے اس دن ہزاروں جاپانیوں نے اپنے پیٹ چاک کر کے خودکشی کر لی...... جاپانیوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ذہنی اور جسمانی دونوں طور پر شہنشاہ کے غلام ہیں۔ محض اس لئے کہ شنٹو مذہب کی ان پر گرفت بہت مضبوط ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جاپانی شہنشاہوں نے اپنے مذہب کو سمجھتے ہوئے اسے غیر ملکی لوگوں، مذاہب اور کلچر سے بچائے رکھا اور اس مقصد کے لئے جاپان کے دروازے اس صدی کے اوائل تک غیر ملکیوں پر بند رکھے۔ اس طرح تازہ افکار کا کوئی جھونکا ان تک پہنچنے نہ دیا۔ جوں ہی یہ دروازہ کھلا غیر ملکی ترقی یافتہ مذاہب نے جاپان پر یلغار کر دی۔ چنانچہ اس مذہب میں کچھ دراڑیں پڑی ہیں اور آج آپ کو جاپان میں ہزاروں کی تعداد میں عیسائی، مسلمان اور بدھ ملیں گے۔''

''بڑا دلچسپ مذہب ہے۔ اس کے بارے میں کچھ اور بتایئے۔ یہ بتایئے کہ تخلیق کائنات کے بارے میں یہ کیا کہتے ہیں۔؟'' میں نے پوچھا......

''شنٹو مذہب میں تخلیق کائنات کا عجیب و غریب تصور ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس ترقی یافتہ دور میں ایک پڑھے لکھے شنٹو مذہب کے عالم کے منہ سے یہ سن کر تعجب ہوا کہ یہ زمین اس طرح پیدا ہوئی کہ آسمان کے ایک تیرتے ہوئے پل پر سارس کا ایک جوڑا بیٹھا ہوا تھا اور آپس میں چہلیں کر رہا تھا کہ ایک نے ناراض ہو کر دوسرے کو چونچ مار دی۔ دوسرے نے منہ پھیر لیا لیکن درد کی شدت سے اس کی آنکھوں سے ایک آنسو ٹپکا اور اس سے پورا جاپان وجود میں آ گیا۔ پھر اس سارس نے دوسرے کے چونچ ماردی اور اس کی آنکھ سے چند آنسو ٹپکے اس طرح سے باقی دنیا وجود میں آ گئی۔ پھر دونوں ایک دوسرے سے راضی ہو گئے اور ان کی اولاد سے دیوی دیوتا پیدا ہو گئے۔

میں ہنسنے لگا...... ''کیا عمدہ فلسفہ ہے تخلیق کائنات کا۔''

مجھے ہنستا دیکھ کر وہ بھی مسکرایا۔ پھر کہنے لگا۔ ''یہ سلسلہ ابھی اور بھی چلتا ہے۔ لیکن مجھے ایسا

محسوس ہو رہا تھا جیسے کرسچن اینڈرسن Christian Anderson مجھے اپنی کوئی دلچسپ پریوں کی کہانی Fairy Tale سنا رہا ہے۔ ظاہر ہے جدید تعلیم سے آراستہ ایک شخص اس سائنسی دور میں اس قسم کی کہانی پر کیسے ایمان لا سکتا ہے' لیکن ہمت ہے ان لاکھوں کروڑوں جاپانیوں کی جو سائنسی طور پر دنیا میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ قوم ہونے کے باوجود صدق دل سے تخلیق کائنات کے اس انوکھے افسانوی فلسفہ پر یقین رکھتے ہیں۔''

''جاپان کے بعد آپ نے کہاں کا رخ کیا۔؟'' میں نے پوچھا۔ اور باہر دیکھا جہاں سے نارنجی روشنی چھن چھن کر اندر آ رہی تھی۔

مسافروں کا چھوٹا سا گروہ کھڑا سرگوشیاں کر رہا تھا۔ ٹائر بدلنے والے آ چکے تھے اور بس کو جیک لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔

''ظاہر ہے چین کا۔!'' اس نے جواب دیا...... ''جاپان کے بعد میں نے چینی مذاہب کو ٹٹولنے کی کوشش کی۔ چین میں لاتعداد چھوٹے چھوٹے مذاہب ہیں اور ان میں سے زیادہ تر توہم پرستی پر مبنی ہیں۔ کچھ بیرونی مذاہب بھی موجود ہیں جو یلغار کر کے چین پہنچے تھے۔ ان میں ہندو مت' بدھ مت' جین مت' عیسائیت اور اسلام قابل ذکر ہیں۔ بدھ مت سب سے پہلے پہنچا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مہاتما بدھ کی زندگی میں ہی کچھ پارٹیاں مذہب پھیلانے کے لئے دوسرے ممالک گئی تھیں...... ان میں سے چند چین جا پہنچی تھیں۔ اس کے بعد ہندو بدھ مناظرے کے نتیجے میں سینکڑوں بدھ چین جا پہنچے۔ ان بدھوں کے تعاقب میں ہندو بھی چلے گئے اور بدھ مت کے مقابلے میں اپنے مذہب کی اشاعت کی کوشش کی لیکن زیادہ کامیاب نہ ہو سکے۔ بدھوں کا حشر دیکھ کر کچھ جین بھی چین چلے گئے لیکن وہ بھی زیادہ کامیاب نہ ہو سکے۔ عیسائیت وہاں یورپی حملہ آوروں کے ذریعے پہنچی اس لئے اتنی کامیاب نہ رہی۔ اسلام اپنے ابتدائی ایام میں ہی تاجروں کے توسط سے پہنچا۔ اس کے علاوہ مسلمان ایک اور ذریعے سے بھی چین پہنچے۔ چین کے ایک بادشاہ کی درخواست پر عباسی خلافت نے لگ بھگ دو لاکھ مسلمان سپاہی اس کی مدد کے لئے بھیجے۔ جنگ میں کامیابی کے بعد اس فوج میں سے چار ہزار سپاہی چین میں ہی رہ گئے۔ باقی واپس چلے گئے ان سپاہیوں کی خوب خاطر مدارت ہوئی۔ ان کی وجہ سے اسلام پھیلا۔ ممکن ہے کہ سارا چین ہی مسلمان ہو جاتا کہ اگلے چینی بادشاہ نے ان مسلمان سپاہیوں اور ان کے خاندانوں پر پابندیاں لگا کر اشاعت اسلام پر بریکیں لگا دیں۔ چین کے اپنے دو ہی مذاہب قابل ذکر ہیں۔ پہلا

کنفیوشس ازم دوسرا تاؤ ازم۔ کنفیوشس ازم کا نام اس کے بانی کنفیوشس کے نام پر رکھا گیا۔ یہ لگ بھگ ڈھائی ہزار سال پرانا مذہب ہے کیوں کہ کنفیوشس، حضرت عیسیٰ سے لگ بھگ ساڑھے پانچ سو سال پہلے پیدا ہوا تھا۔ اس زمانے میں چین میں سخت افراتفری کا عالم تھا۔ ہر طرف فتنہ فساد برپا تھا۔ امن کی صورت حال سخت خراب تھی۔ اس صورت حال میں کنفیوشس امن و محبت کا پیغام لے کر آیا۔ اس کی آواز میں اثر تھا اور لوگوں نے اسے دھیان سے سنا۔ اس صورت حال سے حوصلہ پا کر اس نے اپنی تعلیمات چاروں طرف پھیلائیں۔ اس نے انسانوں کو چھ طبقات میں تقسیم کیا اور انہیں اہمیت کے اعتبار سے مرحلہ وار رکھا اور ہر نچلے طبقہ کو بالا طبقہ کی اطاعت کا حکم دیا۔ حکم عدولی کی صورت میں سختی اور بعض حالات میں قتل تک کرنے کا حکم ہے۔ بادی النظر میں یہ مناسب نہیں دکھائی دیتا لیکن اس زمانے کی صورت حال کے مطابق یہ تعلیمات مناسب سمجھی گئیں۔ کنفیوشس نے روحانی اور جسمانی صفائی اور پاکیزگی پر بہت زور دیا۔''

''خدا کے متعلق کنفیوشس کا کیا نظریہ تھا۔؟''

''وہ ایک عظیم قوت کا معترف تو تھا لیکن اس کو بیان کرنے کے قابل نہ تھا اس لئے خدا کی شخصیت ڈھکی چھپی تھی۔ اس کے یہاں۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ اس نے اپنی تعلیمات کو مذہب کا درجہ دیا نہ اپنے آپ کو پیغمبر قرار دیا۔ مہاتما بدھ کی طرح اس نے بھی اپنے آپ کو ایک استاد ہی قرار دیا......''

''تو گویا یہ ایک باضابطہ مذہب تو نہ تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔ لیکن اس زمانے کے حالات کے مطابق یہ موزوں ترین بلکہ کامیاب ترین مذہب تھا۔ گو یہ مذہب چین کی حدود سے باہر نہیں نکلا لیکن چین کا نام اسی مذہب نے دنیا بھر میں پھیلایا۔ آج جہاں کنفیوشس کا نام آتا ہے ساتھ ہی چین کا نام بھی ذہن میں آجاتا ہے۔''

''کنفیوشس ازم کے بعد آپ نے کس مذہب پر تحقیق کی۔؟'' میں نے دریافت کیا۔

وہ مسکرایا...... چین کا دوسرا بڑا مذہب ''تاؤ ازم'' ہے اور اس میں خدا کا واضح تصور موجود ہے لیکن اس تک پہنچنے کا واضح راستہ یہ مذہب تجویز نہیں کرتا۔ دراصل چینی زبان میں ''تاؤ'' خدا کو کہتے ہیں یا پھر اس سیدھے راستے کو جس میں کسی قسم کا خم نہ ہو اور روک ٹوک نہ ہو۔ اس کے بانی کا اصل نام تو کچھ اور تھا لیکن وہ مشہور ''لاوزے'' کے نام سے تھا۔ لاوزے کا لفظی ترجمہ ''بوڑھا بچہ'' یا ''بوڑھا فلسفی'' ہے۔ روایت ہے کہ جب یہ شخص پیدا ہوا تھا تو اس کے سارے جسم پر سفید بال تھے

اور پھر ساری عمر رہے۔ اس لئے اسے ''بوڑھا بچہ'' کا خطاب دیا گیا...... کنفیوشس اور لاوزے دونوں لگ بھگ ہمعصر تھے۔ لاوزے نے صحیح معنوں میں خدا کا تصور اور اس کے وجود کا احساس دلانے کی کوشش کی لیکن خود اس کے اپنے ذہن میں یہ تصور واضح نہ تھا اس لئے وہ اس عظیم ان دیکھی قوت کی صفات ہی گنوا کر رہ گیا۔ اس کے نزدیک خدا تک پہنچنے کا راستہ خدا کی اپنی تخلیقات کا مطالعہ تھا۔ اس لئے اس نے مظاہر فطرت کے مطالعے پر زور دیا کہ جنگلوں پہاڑوں' دریاؤں میں جا کر دیکھیں خدا وہاں ملے گا۔

بہر حال اس نامکمل مذہب نے بھی دل کو مطمئن نہ کیا۔

چین میں میرا قیام ڈیڑھ سال تک رہا۔ اس دوران میں نے دیگر مذاہب کا بھی مطالعہ کیا لیکن خدا تک پہنچانے والا ذریعہ مجھے نہ مل سکا۔ اس لئے میں نے ہندوستان کا رخ کیا۔

ہندوستان کا سب سے بڑا مت (جسے اگر مذہب کہا جا سکے تو......!)۔ ہندو مت ہے جس کی وجہ سے یہ وسیع و عریض اور آبادی سے بھرا ہوا ملک ہندوستان کہلاتا ہے۔ میں نے ہندو مت کی بہت تعریف سنی تھی۔ اس کے مطالعے اور تحقیق کے لئے میں ہندوستان میں جگہ جگہ پھرتا رہا۔ اس کے عالموں سے ملا۔ ان کے مندروں کو دیکھا۔ ان کے اشلوک پڑھوا کے سنے۔ ان کے پنڈت بھی دیکھے اور برہمن بھی۔ خوبصورت دیوداسیاں بھی دیکھیں اور ان کی زبانی بھجن بھی سنے اور مشہور رقص بھی دیکھے جو وہ دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے کرتی ہیں۔

اس ساری مشقت کا حاصل یہ ہوا کہ مجھے احساس ہو گیا کہ جاپان کے اکلوتے مذہب شنٹو مت اور ہندو مت میں کوئی خاص فرق نہیں اگر شنٹو مذہب میں پچاسی کروڑ دیوتا پر ایمان لانا پڑتا ہے تو ہندو مت میں بھی پینسٹھ کروڑ دیوتا ہیں۔ شنٹو مت میں سورج دیوتا کی اولاد ہونے کا دعویٰ کرنے والے موجود ہیں تو ہندو مت میں بھی سورج بنسی اور چندر بنسی (چاند دیوتا) کی اولاد ہونے کے دعوے دار ہیں۔ دونوں مت کا بانی کوئی نہیں اور دونوں ہی کسی پیغمبر کی رہبری اور تعلیمات سے محروم ہیں۔ شنٹو مذہب والے چالاک نکلے انہوں نے سورج دیوتا کی اولاد کو جاپان کی شہنشاہی دے کر جاپان کے راستے دنیا پر بند کر دیئے اس لئے بیرونی اثرات اس میں داخل نہ ہو سکے اس لئے وہ اچھی یا بری۔ اپنی اصل شکل میں زندہ ہے۔ ہندو مت کے ساتھ زیادتی یہ ہوئی کہ ابتدائی چند سو سالوں میں جب یہ ویدک دھرم یعنی ویدوں کا دھرم کہلاتا تھا۔ بالکل خالص رہا۔ اس کے بعد دفاعی ضروریات کے تحت یہ برہمنوں کے ہتھے چڑھ گیا اور انہوں نے اس میں اتنی

تبدیلیاں کیں کہ اس مت کا حلیہ ہی بگڑ گیا۔''

''بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ ذرا تفصیل سے بتائیے۔!''میں نے کہا۔

''بات سیدھی اور صاف ہے۔ یہ مذہب ابتدا میں ان رسومات کا مجموعہ تھا جو اس قدیم جرمن قوم میں رائج تھی جنہیں آرین کہا جاتا ہے۔ وہ ہزاروں سال پہلے اپنے وطن سے ہجرت کر کے درہ خیبر کے راستے ہندوستان آئے تھے تو اپنے ساتھ یہ رسومات لائے تھے۔ اس وقت ان کے پاس اس وقت کے حساب سے ایک عظیم فلسفہ تھا جس میں خدا کا ایک دھندلا سا تصور موجود تھا۔ وہ اسے اعلیٰ اور برتر بھی مانتے تھے اور اپنے طور پر اس کا اظہار بھی کرتے تھے۔ ہندوستان میں داخلے کے بعد ان کا ٹکراؤ شمالی ہندوستان میں موجود دراوڑ قوم اور اس کی وسیع تہذیب سے ہوا جن کو شکست دے کے آریا قوم نے جنوبی ہندوستان کی طرف دھکیل دیا۔ اس سے قبل دراوڑ قوم بھی اپنے سے پہلے یہاں رہنے والی قوموں یعنی کول بھیل چنڈال کو شکست دے کر جنوبی ہندوستان دھکیل چکی تھی چنانچہ دراوڑ قوم جب ان قوموں سے جا ملی تو نئے دشمنوں کے خلاف ان میں اتحاد پیدا ہو گیا۔ اس سے دراوڑ قوم کی قوت میں بہت اضافہ ہو گیا۔ آرین قوم کو بجا طور پر خطرہ ہوا کہ شاید دراوڑ قوم ان کے خلاف اٹھ کھڑی ہو۔ چنانچہ آرین قوم کے بڑے بڑے دماغ جمع ہوئے انہوں نے فیصلہ کیا کہ فوجی طور پر یعنی جنگ کے ذریعے تو دراوڑ قوم کی نئی طاقت کو مغلوب کرنا شاید ممکن نہ ہو۔ لہٰذا ان کو ذہنی طور پر غلام بنایا جائے۔ چنانچہ سوچ سمجھ کر انہوں نے دنیا کا سب سے زیادہ قابل نفرت اور انسانیت کے ماتھے پر داغ نظام تشکیل دیا یعنی ذات پات کا نظام۔ اس کے لئے ایک فلسفہ گھڑا گیا کہ جب برہما دیوتا نے انسان پیدا کرنے کا فیصلہ کیا تو اپنے جسم کے مختلف حصوں سے مختلف کاموں کے لئے مختلف قسم کے انسان پیدا کئے۔ چنانچہ ان کے سر سے جو انسان پیدا ہوا وہ برہمن یعنی اعلیٰ ترین انسانوں کی قسم ہے جس کا کام دین کی تشریح اور اس کی اشاعت ہے۔ بازوؤں سے جو انسان نکلا۔ وہ برہمن سے کم تر لیکن اعلیٰ نسل کا انسان ہے۔ اس کا نام کھتری یا چھتری رکھا گیا۔ وہ طاقتور اور دین کی حفاظت کرنے والا ہے۔ پیٹ سے ویش نکلا جس کا کام لوگوں کے پیٹ پالنے کیلئے غلہ اگانا ہے۔ یہ تینوں طبقات آرین قوم میں سے ہیں۔ چوتھا انسان جو برہما کے پیروں سے نکلا اس کا کام تینوں اونچی ذاتوں کی اس طرح خدمت کرنا ہے جس طرح پاؤں سارے بدن کی کرتے ہیں لیکن عزت کے قابل نہیں سمجھے جاتے۔ یہ طبقہ دراوڑوں۔ کول بھیل چنڈال کا ہے۔ جنہیں بھگوان نے ان کی ذات کا احساس آرین قوم کے سرخ سفید رنگ'

سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں کے مقابلے میں کالے رنگ، چھوٹی کرنجی آنکھوں اور سیاہ گھنگھریالے بال دے کر دلایا ہے۔ گویا آرین اپنے آپ کو حسین بھی سمجھتے تھے۔ اس پیروں سے نکلے ہوئے طبقے کو انہوں نے شودر یا اچھوت قرار دیا یعنی اتنا گندہ اور پلید کہ چھونے کے قابل بھی نہ ہو۔ ان کا درجہ جانوروں سے بھی بدتر قرار دیا گیا...... آرین چونکہ فاتح تھے اس لئے انہوں نے اس فلسفہ پر اس بے رحمی سے عمل کیا کہ کچھ ہی عرصہ میں شودر خود بھی اپنے آپ کو ناپاک سمجھنے لگے ......اور ان میں عزت نفس کی رمق تک باقی نہ رہی...... یہ صورت حال آج بھی ہندوستان کے کچھ حصوں میں ہے۔''

ٹائر بدلا جا چکا تھا۔ کیونکہ مسافر بس میں سوار ہو رہے تھے جس کی وجہ سے ہلکا ہلکا شور ہو رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''یہاں سے ویسٹ ہائیم کتنی دور ہے۔ اور بس کتنی دیر میں پہنچے گی......؟'' اس پر ان صاحب نے بتایا کہ ہم وکٹوریہ اسٹیشن سے دس میل آ چکے ہیں اور ویسٹ ہائیم لگ بھگ پندرہ میل دور ہے۔ بس کو وہاں پہنچنے میں شاید گھنٹہ لگے۔''

بس نے جب اسٹارٹ لیا تو رات کے پونے نو بج رہے تھے اور سڑکیں سنسان سی ہونے لگی تھیں...... میں نے مناسب سمجھا کہ اس علم کے خزانے سے مزید کچھ حاصل کیا جائے۔ میں نے پوچھا۔

''تو گویا آپ کو محض ذات پات کے نظام نے ہندومت سے برگشتہ کیا۔؟''

''نہیں تو......'' وہ ہنس پڑا۔ ''یہ تو محض ایک چھوٹی سی چیز تھی لیکن انسانیت کی سب سے بڑی تذلیل۔ اس سے بڑھ کر اور بھی چیزیں اس مت میں ہیں جن کو سن کر میں الرجک ہو گیا...... سب سے زیادہ الرجک تو میں زندگی گزارنے کا فلسفہ اور احکامات سن کر ہوا۔ بنارس شہر کے ایک بہت بڑے مندر کے پجاری نے اپنی کتاب میں سے پڑھ کر سنایا کہ دیوتاؤں نے حکم دیا ہے کہ ایک سچا ہندو اس طرح زندگی گزارے کہ اپنی ممکنہ زندگی کو چار حصوں میں تقسیم کرے مثلاً اگر وہ سمجھتا ہے کہ اس کی زندگی سو سال کی ہو گی تو پہلی چوتھائی وہ علم حاصل کرنے دھرم حاصل کرنے اور سچا ہندو بننے میں گزار دے۔ دوسری چوتھائی میں وہ زندگی سے لطف اندوز ہو یعنی شادی کر کے بچے پیدا کرے اور گھر بنا کے رہے۔ جب تیسری چوتھائی شروع ہو یعنی اکاون سال کی عمری میں تو گھر بار چھوڑ کر اکیلا جنگل میں جا کر جھونپڑی بنا کر رہے۔ اپنے بھگوان کی عبادت کرے اور بھیک مانگ کر کھائے اور اگر کوئی بھیک نہ دے تو بُرا نہ مانے۔ چوتھی چوتھائی شروع ہونے پر یعنی چھتر

سال کی عمر میں جھونپڑی بھی چھوڑ دے۔ایک لاٹھی اورایک پیالہ لے کردرخت کے نیچے گزربسر کرے اور بھیک مانگ کرگزارا کرے یہاں تک کہ اس کے سارے گناہ بخشے جائیں اوراسے مکتی یعنی نجات مل جائے۔اب آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ کون دل والا ہوگا جواس سائنسی دور میں اس جیسی زندگی بسر کر سکے؟''

میں ہنسنے لگا۔''کم ازکم میں تونہیں کرسکتا۔؟''

اس نے کہا۔''آپ تو آپ۔آج کل تو ایک فیصد ہندو بھی ایسی ہمت نہیں کر سکتے۔ تیسری چیز جس نے مجھے بہت ہی برگشتہ کیا......وہ ان کی نیوگ ڈاکٹرائن یعنی فلسفہ نیوگ ہے۔ آپ جانتے ہیں یہ کیا ہوتا ہے؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا تو وہ ہنسنے لگا......

''نیوگ کا فلسفہ ان دنوں کی یادگار ہے جب آرین تعداد میں کم تھے اور انہوں نے اپنی تعداد بڑھانے کے لئے بچے پیدا کرنے پر زور دیا تھا۔اس زمانے میں یہ فلسفہ گھڑا گیا۔کہ دیوتاؤں کا حکم ہے کہ جوعورت بغیر اولاد کے مرجائے اس کی نجات نہ ہوگی۔چنانچہ ایسی عورتوں کو جن کے خاوند مرچکے ہوں۔یاباہر گئے ہوں یا پھر اولاد پیدا کرنے کے قابل نہ ہوں......اجازت دی گئی کہ وہ کسی مندر میں جاکے کسی بھی برہمن یا پروہت یعنی پجاری سے بچہ حاصل کرسکتی ہیں۔ اگر پجاری یا برہمن نہ ملے تو کسی بھی شخص سے ہم بستر ہو کے بچہ حاصل کر سکتی ہیں۔یہی اجازت اس مرد کے لئے بھی ہے۔جس کی بیوی مرچکی ہو یا بانجھ ہو۔وہ کسی بھی عورت سے ہم بستر ہو کے بچہ حاصل کرسکتا ہے۔گویا زنا کاری کی کھلی اجازت دے دی گئی۔پھر مزے کی بات کہ مردعورت دونوں کے لئے صرف اورصرف دس بچے پیدا کرنے کی اجازت ہے۔گیارھواں بچہ گناہ میں شامل ہوگا۔اسی طرح بیوہ عورتوں کو دوسری شادی کی اجازت نہیں وہ نیوگ کے ذریعے نفسانی خواہش کو پورا کرسکتی ہیں۔''

''لاحول ولاقوۃ۔''میرے منہ سے نکلا......کیا کوئی صحیح الدماغ مرد اس قسم کی اولاد کو برداشت کرسکتا ہے جواس طریقہ سے حاصل کی گئی ہو۔یا اس کی بیوی لائی ہو۔؟''

''ہندوؤں کا فلسفہ ہے کہ''زمین میں بیج کوئی بھی ڈالے۔فصل زمین کے مالک کی ہوگی۔''

''بڑا عجیب وغریب فلسفہ ہے یہ۔غیرت کے خلاف۔نہ جانے فریقین اسے کیسے

برداشت کرتے ہونگے ؟۔میں نے کہا۔وہ صاحب بولے۔

''قصہ مختصر۔ ہندومت جب آریا قوم کے ساتھ ہندوستان میں داخل ہوا تو اپنے زمانے کے حالات۔عقل و دانش کے مطابق بہترین اور سیدھا سادا مذہب تھا۔خدا کا دھندلا سا تصور بھی رکھتا تھا اس کے پاس کچھ مذہبی کتابیں بھی تھیں جنہیں وید کہا جاتا تھا۔جن کی بنا پر اسے ویدک دھرم بھی کہا جاتا تھا۔اس کے بعد اس کے ساتھ بھی وہی کچھ ہوا جو دوسرے مذاہب کے ساتھ ہوتا آیا ہے۔جب ذات پات کا فلسفہ گھڑا گیا تو اس میں سے سب سے زیادہ طاقتور شخصیت برہمن کی نکلی جس کو دیوتاؤں کے بعد مقدس ترین ہستی کا مرتبہ دے دیا گیا لیکن یہ بھلا دیا گیا کہ برہمن بھی انسان ہے اور انسانی خواہشات رکھتا ہے برہمن نے دیکھتے ہی دیکھتے اس سیدھے سادے مذہب پر قبضہ کرلیا اور اس میں عجیب وغریب باتیں اور رسمیں داخل کر دیں جس کا سو فیصد فائدہ برہمن کو پہنچا۔سب سے پہلے تو تین طبقوں یعنی برہمن' کھتری اور ویش تک اس مت کو نسلی قرار دے دیا گیا۔جس کا مطلب یہ تھا کہ اگر کوئی ہندو ہونا چاہے تو ان طبقوں میں اس کا شمار نہیں ہوسکتا۔اسے شودر بننا پڑے گا۔برہمن نے ہی نیوگ کا فلسفہ گھڑا۔دیوتاؤں کو خوش کرنے کے نام پر دیوداسی نامی رسم کو شروع کیا گیا۔جس میں کنواری لڑکیاں مندروں کے لئے دان کر دی جاتی ہیں۔انہیں ناچ گانا سکھایا جاتا ہے تاکہ وہ ناچ گا کر دیوتاؤں کو خوش کر سکیں۔اس طرح ناچنا اور گانا مذہب میں شامل ہوگیا۔ان کی دیکھا دیکھی عام ہندو گھرانوں میں ناچ گانے کی تعلیم عام ہوگئی۔ستی کی رسم ایجاد ہوگئی جس کے مطابق شوہر کے مرجانے پر بیوی اس کے ساتھ ہی آگ میں جل مرتی تھی اور اسے وفا کا ایک بہت بڑا ثبوت سمجھا جاتا تھا۔اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ خاوند کے مرجانے پر بیوی کی زندگی اس قدر تلخ کر دی جاتی تھی کہ وہ زندہ جل مرنے کو ترجیح دیتی تھی۔شودروں اور اچھوتوں کی بابت تو بتا ہی چکا ہوں کہ ان کو جانوروں سے بھی بدتر سمجھا جاتا تھا اور معاشرہ میں ان کا کوئی مقام نہ تھا۔نئے نئے تہوار ایجاد کر لئے گئے جن کو زیادہ سے زیادہ رنگین بنایا جاتا۔ظاہر ہے اتنی ساری چیزوں کی شمولیت کے بعد مذہب خالص تو نہیں رہ جاتا۔چنانچہ اس دور کو ہندومت کا برہمنیت کا دور کہتے ہیں جب برہمن اس مت کا بلاشرکت غیرے مالک تھا۔

''بڑا ہولناک دور تھا یہ......!''میرے منہ سے نکلا۔

''ہولناک اور اس کے ساتھ رنگین بھی۔!''وہ بولے۔''لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا لوگوں میں شعور بیدار ہوتا گیا۔اس برہمنیت کے خلاف آوازیں اٹھنی شروع ہوگئیں جو اسلامی

تحریکوں میں بدلتی گئیں۔ اندازہ ہے کہ جتنی اصلاحی تحریکیں ہندومت میں اٹھیں اتنی کسی مذہب میں نہیں اٹھیں۔ لیکن ناچ گانے اور نیوگ کی وجہ سے جتنی رنگینی اس مت میں آ چکی تھی اس سے دستبردار ہونے کو کوئی تیار نہ تھا۔ برہمنوں نے لوگوں کو بہلانے کے لئے اتنے فحش اور رنگین قصے اس مت میں شامل کر لئے تھے کہ اصل مذہب اس میں غائب ہو گیا اور قصہ کہانیاں ہی رہ گئیں۔

اس برہمیت کے خلاف قریب قریب پچاس سال کے وقفے سے دو بڑی تحریکیں اٹھیں۔ پہلی جین مت جس کے بانی مہاویر جین تھے جو لگ بھگ دو ہزار چھ سو سال قبل مسیح پیدا ہوئے۔ دوسری بدھ مت جس کے بانی سدھارتھ تھے جو ان سے پچاس سال بعد دنیا میں آئے۔ دونوں ہی اپنی اپنی ریاستوں کے راجکمار تھے۔ دونوں نے ہی عیش عشرت سے زندگی کی ابتدا کی اور بعد میں شہزادگی کی زندگی ترک کر کے رہبانیت لے لی جو اس زمانے میں نجات کا سب سے معروف و مقبول طریقہ تھا۔ دونوں کے دلوں میں برہمنوں کے لئے کوئی ہمدردی اور عزت نہ تھی اس لئے دونوں نے برہمیت کے خلاف تحریک شروع کی لیکن دونوں کی بدقسمتی کہ خدا کا واضح تصور نہ ہونے کی وجہ سے وہ برہمیت کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اور جلد ہی ہار مان گئے۔ جس کے نتیجے میں ہندومت کے تصورات اور رسومات ان میں گھس آئیں۔ جین مت زیادہ صلح پسند تھا اس لئے ہندوستان میں ہی رہ گیا۔ بدھ مت نے ذرا زور دکھایا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے ہندوستان چھوڑنا پڑا اور اردگرد کے ممالک میں پناہ لینی پڑی۔ بدھ مت میں اتنی لچک ہے کہ وہ ہندومت کی طرح ہر قسم کی رسومات کو قبول کر لیتا ہے جس کی وجہ سے تمام ممالک میں بدھ مت مختلف شکلوں میں رائج ہے ویسے اپنی وسعت اور ماننے والوں کے لحاظ سے بدھ مت دنیا کے بڑے مذاہب میں شامل ہے اور اس نے ہندوستان سے لے کر جاپان تک کے تمام ممالک میں اپنے زبردست اثرات چھوڑے ہیں۔ ان دونوں مذاہب میں خدا کا تصور نہ ہونے کے برابر ہے سزا جزا کا کوئی تصور نہیں۔ دونوں ہی نجات کو انسانی کوششوں کا ثمرہ سمجھتے ہیں کہ انسان جتنی زیادہ نیکی کرے گا اتنی جلدی اس کی نجات ہوگی۔ سب سے بڑی خرابی جو دونوں مذاہب میں گھس آئی وہ بت پرستی ہے۔ خیال ہے کہ جتنے بت مہاتما بدھ کے اس دنیا میں بنے ہیں اتنے کسی اور کے نہیں بنے حتیٰ کہ حضرت عیسیٰؑ کے بھی نہیں۔''

''آپ کی معلومات حیرت انگیز ہیں۔ ظاہر ہے آپ نے بڑی گہری تحقیق کی ہے۔ مجھے مہاتما بدھ سے بہت دلچسپی ہے ذرا اس کے متعلق بتایئے۔'' میں نے کہا۔

''کوہ ہمالیہ کے دامن میں ایک چھوٹی سی سرسبز ریاست ہوا کرتی تھی جس کا نام اس

زمانے میں کپل وستو ہوا کرتا تھا۔اس کے راجہ کے گھر میں حضرت عیسیٰ سے لگ بھگ ساڑھے پانچ سو سال قبل ایک راجکمار پیدا ہوا اس کا نام سدھارتھ رکھا گیا۔یہ بہت خوبصورت سا شہزادہ تھا۔اس کی پرورش بڑے ناز ونعم سے ہوئی۔لڑکپن میں ہی اس کی شادی ایک خوبصورت شہزادی سے کر دی گئی جس سے ایک بیٹا بھی ہوا۔ایک دن بازار سے گزرتے ہوئے اس نے ایک اپاہج کو دیکھا جو حرکت سے بھی معذور تھا۔پھر ایک بوڑھے لاغر شخص کو دیکھا جو چلنے پھرنے سے بھی لاچار تھا اس کے بعد ایک جنازہ دیکھا تو اس پر اس دنیا کی بے ثباتی روشن ہو گئی اور اس کا دل اس دنیا سے اچاٹ ہو گیا۔چنانچہ ایک رات وہ بیوی بچے کو سوتا چھوڑ کر محل سے نکل گیا اور ایک بگھی میں سوار ہو کر جنگل کی راہ لی۔وہاں رک کر اپنی زرق برق پوشاک اتار کر کوچوان کو دے دی اور اس کا معمولی سا لباس خود پہن لیا۔اس کے بعد سائیس کو واپس بھیج دیا اور خود جنگل کی راہ لی۔صبح ہوتے ہی اپنا سر' داڑھی' مونچھ۔حتیٰ کے ابرو بھی منڈھوا دیئے۔گیروا لباس پہنا۔پھر مکمل رہبانیت اختیار کر کے جنگل میں جا بیٹھا۔کھانا پینا ترک کر دیا اور مسلسل روزے کی حالت میں دنیا کی بے ثباتی کی اصلیت معلوم کرنے اور نجات حاصل کرنے کے طریقے سوچنا شروع کر دیئے۔ایک دن اسی عالم میں ایک بڑ کے درخت کے نیچے بیٹھا تھا کہ اچانک ایک چمک دکھائی دی جسے اس نے گیان قرار دے دیا۔جس کا مطلب تھا کہ اسے خدا کی معرفت حاصل ہو گئی۔

گیان حاصل کرنے کے بعد جب وہ اپنا پیغام پھیلانے کے لئے اٹھا تو مسلسل فاقہ کشی کی وجہ سے اس قدر کمزور ہو چکا تھا کہ ایک وقت کا کھانا اور نہ کھاتا تو موت یقینی تھی۔اس موقع پر ایک جوان چرواھن نے انہیں دودھ پیش کیا جس سے انہوں نے اپنا روزہ توڑا۔اس دن انہوں نے اعلان کیا کہ فاقہ کشی کرنے یا اپنے آپ کو تکلیف دینے سے کوئی فائدہ نہیں۔یہ اس زمانے کا بہت مقبول رواج تھا کہ اچھے بھلے لوگوں کو بھی یہ خبط سوار ہو جاتا تھا کہ اپنی زندگی چھوڑ کر رہبانیت لے لیتے تھے۔جنگل میں جا بیٹھتے۔اپنے جسم کو زیادہ سے زیادہ تکلیف دیتے اور اسے نجات کا ایک ذریعہ سمجھتے۔

''بہت خوب نظریہ تھا۔یہ نظریہ تو آج بھی ہندوؤں۔بدھوں اور جینیوں میں رائج ہے۔!'' میں نے کہا۔

''ہاں......ان مذاہب کے راہب۔سر منڈھے اور ان سلے گیروے لباس پہنے نظر آتے ہیں۔بہر حال بدھ نے جو فلسفہ پیش کیا اسے سادہ الفاظ میں ''زندگی کے غم والم کی تشریح کہا جا سکتا

ہے۔اس نے انسان کی نجات کواس کی اپنی کوشش پر منحصر قرار دیا۔''

''بدھ بحیثیت مبلغ کیسے تھے۔؟''میں نے سوال کیا۔

''مہاتما بدھ نے کبھی بھی اپنے آپ کو پیغمبر یا نبی نہیں کہا اور نہ ہی اپنی تبلیغ کو مذہب قرار دیا۔وہ اپنے آپ کو محض ایک استاد قرار دیتے تھے اور اپنے ماننے والوں کو بھکشو یعنی شاگرد کہتے تھے۔بدھ تو ان کا نام بھی نہیں تھا۔یہ تو صفت ہے یعنی اس کا مطلب ''عقلمند'' ہے۔لوگوں نے عقیدت کے طور انہیں یہ نام دیا۔بدھ مت بھی کوئی مذہب نہیں تھا یہ تو جب برہمنوں سے ان لوگوں کی جنگ ہوئی تو انہوں نے اپنے آپ کو ہندوؤں سے علیحدہ اور ایک نئے مذہب کا ماننے والا قرار دیا۔وہ بھی مذہب نہیں بلکہ ''مت''یعنی عقیدہ رکھنے والا۔

''بدھ مت پیدا تو ہندوستان میں ہوا لیکن اس نے کامیابی پڑوسی ممالک یعنی برما سے جاپان میں حاصل کی۔

''یہ کیسے ممکن ہوا؟''وہ صاحب خاصے سنجیدہ ہو گئے۔

''یہ بھی محض برہمنوں کی وجہ سے ہوا۔جو بالا دستی کے حامی ہیں اور بقائے باہمی کے قائل نہیں انہوں نے کبھی بھی اپنے کسی دشمن کو معاف نہیں کیا۔پھر مہاتما بدھ کو برہمنوں سے کوئی عقیدت نہیں تھی بلکہ ان کی تعلیمات نے تو برہمنوں کا طلسم توڑا تھا جسے برہمنوں نے آج تک معاف نہیں کیا۔مہاتما بدھ کی مقبولیت کی وجہ سے ان کی زندگی میں تو برہمن کوئی کارروائی نہ کر سکے۔ان کے بعد بہت کچھ ہوا...... مہاتما بدھ نے اپنی زندگی میں اپنے مبلغوں کی بے شمار جماعتیں تبلیغ کے لئے ان ملکوں میں روانہ کیں جہاں انہوں نے بہت کچھ کام کیا۔سادہ اور دل پذیر تعلیمات کی وجہ سے یہ مذہب مقبول بھی بہت ہوا۔کیونکہ ان ممالک میں بھی جابرانہ جاگیرداری نظام رائج تھا اور بدھ مت اس کے خلاف ایک بہت بڑی ڈھال تھا۔

مہاتما بدھ کی وفات کے بعد ان کے ماننے والوں نے اپنے نئے مذہب کی تنظیم کی اور اس طرح قوت حاصل کی۔یہاں تک کہ یہ براہ راست ہندو مت کے مقابلے میں آ گیا اور یہیں سے اس کا ہندوستان میں زوال شروع ہو گیا۔بدھ کی وفات کے خاصے عرصہ کے بعد ان دونوں مذاہب کے درمیان بالآخر ایک معرکہ ہو ہی گیا۔ہندو اور بدھ عالموں کے درمیان ایک بہت بڑا مناظرہ ہوا جس کی شرائط میں یہ طے پایا کہ ہارنے والا یا تو جیتنے والے کے مذہب کو قبول کرے یا۔ملک چھوڑ جائے وگرنہ قتل ہونے کے لئے تیار ہو جائے۔اس مناظرہ میں بدھوں کو شکست ہوئی

چنانچہ شرط کے مطابق بہت سے بدھ ہندو ہو گئے۔ کافی قتل بھی ہوئے۔ باقی ملک چھوڑ کر چلے گئے۔ ان لوگوں نے لنکا۔ تبت۔ برما۔ چین وغیرہ میں پناہ لی جہاں پہلے سے ان کے ساتھی موجود تھے۔ ہندوستان میں ہندو ہو جانے والے بدھوں نے بدھ مت کی اشاعت کا کام چوری چھپے جاری رکھا جس کی وجہ سے تھوڑا بہت بدھ مت نظر آ جاتا ہے۔ بدھ مت بھی مخلص لوگوں کے بعد عام لوگوں کے ہتھے چڑھ گیا جنہوں نے اس میں خاصی تبدیلیاں کیں۔ مثلاً مہاتما بدھ نے بت پرستی سے منع کیا تھا لیکن بدھوں نے بت پرستی شروع کر دی۔ خدا کا مدھم سا تصور بھی ختم کر دیا گیا۔ سزا جزا کا تصور بالکل ہی ختم ہو گیا۔ بس دنیا تیاگ دینے کا درس رہ گیا۔ ہاں ایک بات ضرور ہوئی کہ ان تبدیلیوں کی وجہ سے بدھ مت میں اتنی لچک آ گئی کہ اس نے دوسرے ممالک کے مذاہب سے مفاہمت قبول کر لی اور ان کے عقائد اور رسموں کو اپنے اندر سمو لیا چنانچہ آج تبت کا بدھ مت لاماؤں کے زیر اثر ہے۔ ہندوستان کا بدھ مت چین کے بدھ مت سے یکسر مختلف ہے۔ پھر ایک عجیب وغریب عقیدہ بھی بدھوں میں رواج پا گیا کہ سدھارتھ اکیلے ہی مہاتما بدھ نہیں تھے۔ ان سے پہلے بھی کئی بدھ دنیا میں آ چکے ہیں اور ان کے بعد بھی آئیں گے چنانچہ سدھارتھ تو ایک عام سے بدھ ہیں۔ اس طرح مہاتما بدھ کی عظمت میں بھی کمی کر دی گئی۔

میری اس مذہب سے دلچسپی یک دم ختم ہو گئی۔

''جین مت اس سے بھی زیادہ عجیب وغریب مت ہے۔ سیدھا سادا کمزور سا مذہب' ہندو مت اور بدھ مت کا مکسچر۔ ان میں بھی عقیدہ ہے کہ ''مہاویر جین'' ایک عام سے جین ہیں ان سے پہلے چوبیس جین آ چکے ہیں بلکہ جب سے دنیا بنی ہے جین متواتر چلے آ رہے ہیں۔ بس ان کی عمروں اور قد میں کمی آ رہی ہے۔ پہلے جین دو دو میل لمبے قد کے تھے اور لاکھوں کروڑوں سال کی عمر رکھنے والے۔ اس بھاری پتھر کو تو میں نے دور سے دیکھ کر ہی چھوڑ دیا......''

''کوئی اور ہندوستانی مذہب جس نے آپ کی توجہ اپنی طرف کھینچی ہو۔؟'' میں نے دریافت کیا۔

''ہاں......ایک اور مذہب سے مجھے دلچسپی ہوئی۔ یہ پنجاب میں جنم لینے والا سکھ مت ہے۔ یہ پنجاب کے سیدھے سادے بھولے بھالے کسانوں کا مذہب ہے جسے ایک نہایت ہی نیک اور بے ضرر سے بابا نانک لائے تھے۔ بابا جی نے خدا کی وحدت کا پیغام دیا تھا۔ دنیا کی بے ثباتی کو اجاگر کیا اور انسانوں کو ایک دوسرے سے مل کر رہنے، بھائی چارہ اور محبت کا حکم دیا یہاں

تک کہ ایک دوسرے کو بھائی کہہ کر پکارنے کا حکم دیا۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ یہ مذہب 'امن' دوستی' محبت و پیار کے خمیر سے **اٹھا تھا**۔ اس کے پہلے چار گروؤں نے نہایت عاجزانہ' منکسرانہ درویشانہ بلکہ فقیرانہ زندگی گزاری۔ وہ امرت سر نامی شہر کے کنارے ایک تالاب بنا کے اور اس کے کنارے ایک جھونپڑی بنا کے رہتے رہے اور مسافروں کی خدمت کرتے رہے لیکن بعد میں آنے والے گروؤں نے یہ عجز و انکساری اور درویشانہ زندگی ترک کر کے شاہانہ زندگی اختیار کر لی۔ پھر مسلمانوں سے اختلاف کی بنا پر پیار محبت کا درس چھوڑ کر چھریاں کلہاڑے سنبھال لئے اور اس طرح ایک...... منتقم مزاج جنگجو قوم بن گئے۔ ہزاروں مسلمانوں کو مارا اور ہزاروں کی تعداد میں خود بھی ختم ہوئے۔ اس طرح یہ فرقہ جو پیار محبت کے نام پر وجود میں آیا تھا۔ اپنا مقصد کھو بیٹھا۔ مزید یہ کہ مسلمانوں سے مخاصمت کی بنا پر یہ ہندوؤں کے زیادہ قریب ہو گیا جس کی وجہ سے ہندو اثرات اس فرقہ میں بھی داخل ہو گئے۔ اور اس کے کچھ فرقے بت پرستی بھی کرنے لگے حالانکہ یہ مت تو بت پرستی کے خاتمے کے لئے آیا تھا۔''

''اس مت سے بھی میری دلچسپی ختم ہو گئی۔''

''انسانوں کے بنائے ہوئے ان ہندوستانی مذاہب سے مایوس ہو کر میں نے ایران کا رُخ کیا تا کہ وہاں نازل ہونے والے واحد الہامی مذہب ''زرتشت مذہب'' جسے فارس یعنی ایران میں نازل ہونے کی وجہ سے پارس مذہب بھی کہا جاتا ہے۔ کا مطالعہ کر سکوں۔ وہاں اس مذہب کے عالموں سے ملا اور ان کی الہامی کتاب ''اژدستا'' کا مطالعہ بھی کیا۔ تو معلوم ہوا کہ یہ مذہب یہودیت سے بھی زیادہ قدیم اور اس کی طرح نسلی ہے یعنی ایک خاص نسل کے لوگوں کے لئے ہے۔ دوسرے اس میں شامل نہیں ہو سکتے۔ اس کے پیغمبر اور بانی ''زرتشت'' کی شخصیت عقیدت و احترام کے اتنے مبالغہ آمیز قصوں اور افسانوں میں دب کے رہ گئی ہے کہ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس نام کے پیغمبر یا کوئی شخصیت اس دنیا میں آئی بھی تھی کہ نہیں۔ زرتشت کی تعلیمات بھی ہندوؤں کی اغراض کا شکار ہو چکی ہیں۔ انہوں نے سختی سے ایک خدا کی عبادت کا حکم دیا تھا۔ لیکن ان کی قوم نے خدا کے ساتھ آتش پرستی بھی شروع کر دی۔ اس لئے یہ آتش پرستوں کی قوم کہلاتی ہے۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ قوم اپنے مردوں کو دفن کرنے یا نذرِ آتش کرنے کی بجائے ان کے ہاتھ پاؤں توڑ کے خاص طور پر پلے ہوئے گدھوں اور چیلوں کوؤں کے سامنے ڈال دیتی ہے تا کہ وہ انہیں نوچ نوچ کے کھا جائیں تو میرے اوسان خطا ہو گئے اور میں نے رخصت ہونے میں ہی

عافیت سمجھی''۔

میں ہنسنے لگا تو وہ بھی ہنس پڑا۔ میں نے باہر کی طرف دیکھا۔ بس بجائے دوڑنے کے رینگ رہی تھی۔ شائد ٹائر کمزور لگایا گیا تھا۔ بس کے اندر سواریاں اونگھ رہی تھیں۔ پچھلی نشست پر دو لڑکیاں ہماری طرف دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں۔ غالباً ہماری باتیں سن رہی تھیں ...... جب وہ خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔

''آپ کی معلومات نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ ظاہر ہے آپ نے سچائی کی تلاش اور مذاہب کی چھان بین میں اتنا لمبا عرصہ صرف کیا ہے اور اس عرصہ میں کچھ حاصل ہی کیا ہے۔ ایک سوال میرے ذہن میں گھوم رہا ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ کیا تلاش حق و سچائی میں آپ اکیلے ہی ہیں یا آپ کی قوم میں کسی اور کو بھی دلچسپی ہے۔؟

وہ بڑی سنجیدگی سے بولے۔

''برطانیہ ہی نہیں بلکہ پوری مغربی دنیا میں...... جس میں آپ امریکہ اور کینیڈا کو بھی شامل کر سکتے ہیں آپ کو ہزاروں ہی نہیں بلکہ لاکھوں متلاشی حق ملیں گے۔ ان میں اور مجھ میں صرف اتنا فرق ہے کہ میرے پاس وسائل تھے اور جذبہ جنون کچھ زیادہ تھا۔ اس لئے میں باہر نکل گیا۔ دوسروں کے پاس نہ اتنے وسائل ہیں نہ وقت۔ وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے ہی کچھ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تم ان کے اندر جھانک کر دیکھو۔ ان کی روحیں تک پیاسی ہیں۔ مذہب کی گرفت کم ہونے سے ان لوگوں میں جو اخلاقی کجروی گھس آئی ہے اس سے بوڑھے اور مذہبی لوگ سخت پریشان ہیں۔ نئی نسل کو مذہبی اور روحانی اطمینان کہیں سے نہیں مل رہا۔ اس لئے کبھی یہاں ہپی جیسی گندی اور غلیظ تحریک جنم لیتی ہے تو ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں لوگ ہپی ہو جاتے ہیں جس میں انسان اپنے آپ کو ہر قسم کی اخلاقی پابندی سے آزاد محسوس کرتا ہے۔ یا پھر معاشرے کے نچلے طبقے ''ہرے کرشنا ہرے راما'' جیسی تحریک کو قبول کرتے ہیں جس میں جنسی بے راہ روی پر کوئی قدغن نہیں۔ ہندو سنیاسی بھی ان لوگوں کے لئے خاص کشش کا باعث ہوتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ انسان جب غیر مطمئن اور مایوس ہو تو ہر نئی نظر آنے والی چیز اسے اپنی طرف کھینچتی ہے کہ شاید اس میں سے اسے کچھ مل جائے۔ عیسائیت ان تحاریک کا مقابلہ کرنے سے قاصر ہے۔ اس لئے کہ عیسائیت سے بے گانگی اپنے عروج پر ہے۔ آپ یہاں کسی ایک شخص سے کسی بھی مذہب کے بارے میں بات کر کے دیکھیں یا بتانا شروع کریں بے شمار لوگ آپ کی بات

سننے کے لئے آناً فاناً آپ کے گرد جمع ہو جائیں گے اور طرح طرح کے سوالات پوچھنا شروع کر دیں گے لیکن اب وہ زمانے نہیں رہے جب لوگوں کو غیر مرئی چیزوں کے قصے سنا کر ان کے عقائد قائم کئے جاتے تھے۔ یہ پڑھے لکھے لوگ ہیں اور سائنسی ایجادات کے زمانے میں رہتے ہیں جب چاند ستاروں پر کمندیں ڈالی جارہی ہیں اور سمندروں کی تہوں کو کھنگالا جا رہا ہے' اس لئے یہ لوگ خوامخواہ کی ہوائی باتوں پر یقین نہیں کرتے۔ وہ تو اس بات کا یقین کریں گے جو ان کی طبع کو مطمئن کر سکے اور ان کے سوالات کا جواب دے سکے۔ آج اس پورے علاقے میں ایک ایسے مذہب کی سخت ضرورت ہے جو ان کی پیاسی روحوں کو سیراب کر سکے عیسائیت اس کو پورا کرنے سے معذور ہے۔! اگر کچھ امید ہو سکتی ہے تو مذہب اسلام سے ہو سکتی ہے جو یورپ اور امریکہ میں بڑی تیزی سے مقبول ہو رہا ہے۔"

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ کیا ایک انگریز اور وہ بھی عیسائی ایسی بات کہہ سکتا ہے۔؟

"مغربی دنیا کی مذہب سے بے گانگی اور تشنگی کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا۔ آج آپ سے بھی تصدیق سن لی۔ اب آپ بتائیے آپ کی تحقیق اور کتنی آگے بڑھی۔؟" میں نے اس طویل تقریر کے جواب میں پوچھا۔

"اتنی تحقیق کے بعد بڑے الہامی مذاہب میں سے ایک ہی باقی رہ جاتا ہے۔ یعنی صحرائے عرب میں جنم لینے والا واحد مذہب اسلام...... اور یہ وہ مذہب ہے جس کے خلاف غلط فہمیاں پھیلانے میں یورپ امریکہ بلکہ پوری مغربی دنیا کی قوتیں شامل ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ خصوصاً صلیبی جنگوں میں شکست کے داغ بھی اس پر الزام لگا کر دھونے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ جب میں نے اسلام اور اس کے پیغمبر ﷺ پر تحقیق شروع کی تو میرے دماغ میں یہ تمام الزامات بڑے شد و مد سے موجود تھے جو اسلام' مسلمانوں اور خصوصاً عربوں پر لگائے جاتے ہیں کہ اسلام ایک جنگجو مذہب ہے۔ تلوار کے زور سے پھیلا ہے اور تلوار کی زبان میں بات کرتا ہے۔ اس کے اصول بڑے وحشیانہ ہیں۔ یہ عیاشی اور بدمعاشی کی دعوت دیتا ہے۔ چار چار شادیوں کا حکم دیتا ہے۔ عورت کو کوئی حق نہیں دیتا۔ انہیں گھر میں قید رکھنے کی ترغیب دیتا ہے۔ جاہلوں کا مذہب ہے علم کی کوئی قدر نہیں کرتا اسی لئے سائنسی علوم میں مغربی دنیا سے پیچھے ہے۔ اس کے ماننے والے ظالم' عیاش اور بدمعاش ہوتے ہیں۔ مذہبی معاملات میں متشدد ہوتے ہیں دیگر مذاہب کی عزت نہیں کرتے۔ وغیرہ وغیرہ...... اور یہ کہ ان کی کتاب قرآن دراصل ایک عیسائی

راہب ''بحیرہ'' کی لکھی ہوئی ہے جو اس نے محمدؐ کو اس وقت دی تھی جب وہ بہت کم سن تھے۔ بڑے ہو کر محمدؐ نے اس میں اپنی طرف سے بہت اضافہ کیا۔ پھر محمدؐ ایک جادوگر تھے اس لئے ان کا کلام بھی جادو کا اثر رکھتا تھا وغیرہ وغیرہ...... (نعوذ باللہ)''

''میرے اس مضبوط عقیدے کی دیوار میں پہلی دراڑ اس وقت پڑی جب میں صحرائے عرب کے ایک دور دراز نخلستانی گاؤں میں شام کے وقت بیٹھا اپنے نیم تعلیم یافتہ میزبان سے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق باتیں کرر ہا تھا۔ تو اس نے مجھے بتایا:۔

''ہر مسلمان حضرت عیسیٰؑ کے متعلق عقیدہ ہی نہیں ایمان رکھتا ہے کہ وہ اللہ کے سچے۔ برگزیدہ اور عالی شان نبی تھے۔ ان پر اور ان کی کتاب انجیل پر ایمان لانا خود مسلمان کے ایمان کا جزو ہے۔ اسلام۔ حضرت عیسیٰؑ کو ایک نیک پاک اور معصوم نبی قرار دیتا ہے اور قرآن شریف میں باقاعدہ اس کا اعلان کرتا ہے جبکہ ان کی اپنی قوم یہودیوں کے پروپیگنڈے کے تحت ان کی اہانت کرتی ہے۔ میری حیرانگی اور استفسار پر اس بوڑھے دیہاتی کسان نے سادہ سے الفاظ میں بتایا کہ موسوی شریعت کہتی ہے کہ ''جو شخص خدا کا گناہگار ہو اسے ہلاک کر کے درخت پر ٹانگ دیا جائے۔'' یہ موت ''لعنتی موت'' کہلاتی ہے یعنی مرنے والے پر لعنت بھیج کر اسے ہلاک کیا گیا۔ چنانچہ اس شرع کو پورا کرنے کے لئے۔ اس زمانے کے لوگ صلیب پر چڑھنے کا باقاعدہ تماشا دیکھتے۔ اس پر پتھر۔ لکڑیاں اور غلیظ اشیا پھینکتے اور لعنت بھیجتے۔ اور عرصہ دراز تک چرچا رہتا کہ فلاں شخص لعنتی موت مرا ہے اس کی مغفرت کی دعا بھی کوئی نہیں کرتا تھا۔ پھر یہ سزا چوروں' ڈاکوؤں اور رہزنوں کے لئے مخصوص کر دی گئی تھی۔ چنانچہ یہودیوں کی سازش کے تحت رومیوں نے حضرت عیسیٰؑ کو اس حشر سے دوچار کرنا چاہا تا کہ جب بھی حضرت عیسیٰؑ کا ذکر ہو یہی کہا جائے کہ وہ لعنتی موت مرے (نعوذ باللہ) جو چوروں' ڈاکوؤں کے لئے مخصوص ہے۔ اب یہ شان نبوت کے خلاف ہے کہ اتنا جلیل القدر پیغمبر اس غلیظ الزام کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو اور یہ انتہائی افسوس کی بات ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے چھ سو سال بعد تک عیسائی دنیا اپنے ہی نبی پر یہ الزام لگاتی رہی اور مختلف واقعات اور دلائل سے اسے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ یہ تو خدا کا شکر ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے مقام رحلت سے سینکڑوں میل دور دنیا میں پھر چھ سو سال بعد حضرت عیسیٰؑ کے حق میں ایک آواز بلند ہوئی کہ خدا کا نیک اور معصوم نبی اس بھیانک انجام سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ کیا عیسائی دنیا پر اسلام کا یہ احسان نہیں......؟''

''سچی بات ہے کہ یہ سن کر مجھے اپنے سینے کے اندر کوئی چیز تڑق سے ٹوٹتی سنائی دی۔اور میرے ذہن میں دھماکے سے سنائی دیئے پھر اطمینان کی سانس میرے منہ سے نکل گئی۔''

''اس نیم تعلیم یافتہ دیہاتی بدو عرب کے منہ سے اس عالمانہ نقطہ کو اس سادہ اور دلچسپ انداز سے سن کر میں حیران رہ گیا۔پھر حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں استعمال ہونے والے کلمات کو سن کر واقعی خوشی ہوئی کہ کس قدر ادب واحترام سے مسلمان ان کا نام لیتے ہیں جبکہ ہم نے ہمیشہ ہی محمدؐ کا نام سن کر گستاخانہ اور قابل اعتراض الفاظ استعمال کئے۔پھر یہ کہ اسلام حضرت عیسیٰؑ کو معصوم اور پاک نبی قرار دیتا ہے۔بہت کچھ تسلی کا باعث ہوا۔''

''دوسری دراڑ اس وقت پڑی جب میں نے دھڑکتے دل سے اس شخص سے سوال کیا کہ حضرت آدم اور حضرت حوا نے شیطان کے بہکاوے میں آ کے جو گناہ کیا اور اس طرح خدا تعالیٰ کی جو نافرمانی کی اور جس کی پاداش میں خدا نے تمام بنی آدم کو گناہگار قرار دے دیا اور بالآخر حضرت عیسیٰ نے صلیب پر چڑھ کر انتہائی اذیت کے عالم میں جان دے کر تمام بنی نوع کا کفارہ دیا اس کے متعلق اسلام کیا کہتا ہے۔تو اس شخص نے بتایا کہ اس گناہ کے بعد حضرت آدم اور حوا نے خدا سے معافی مانگی تو حق تعالیٰ نے انہیں معاف کر دیا تھا۔مزید یہ کہ یہ حضرت آدم اور حوا کا انفرادی گناہ تھا جن کی انہوں نے معافی بھی مانگی اور دنیا میں بھیجے جانے کی سزا بھی پائی۔بنی نوع کے گنہگار ہونے کا اس میں کیا سوال ہے؟۔خدا کا کہنا ہے کہ ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔ ایک کے قصور کی سزا دوسرے کو دینا شان خداوندی اور اس کے عدل کے خلاف ہے۔ہر شخص اپنا بوجھ خود اٹھائے گا اور اپنے کئے کی سزا خود بھگتے گا۔چنانچہ حضرت آدم اور حوا نے اپنی سزا بھگت لی اور رحمت خداوندی سے پاک صاف ہو گئے۔خدا منتقم مزاج نہیں وہ تو بہت بڑا عادل۔مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔''

''میری نظروں کے سامنے وہ چار ماہ کا معصوم بچہ گھوم گیا جو ہمک ہمک کر میری گود میں آنے کی کوشش کر رہا تھا اور مسکراتے ہوئے فرشتوں سے بھی زیادہ معصوم لگ رہا تھا۔جس کو گناہگار ماننے پر میرا دل کبھی بھی آمادہ نہ تھا۔میں نے زور سے اطمینان کی سانس لی۔''

''اس دن کے بعد میں نے دل اور ذہن کی کھڑکیوں کو کھلا رکھ کر اسلام کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔حیات محمدیؐ پر کتابیں پڑھنی شروع کر دیں۔ایک دن میرے ہاتھ وہ خطبہ لگا جو محمدؐ نے اپنی وفات سے سال بھر پہلے دیا تھا۔اسے پڑھ کر میری آنکھیں چکا چوند ہو گئیں اور مجھے ایسا

محسوس ہوا کہ مدتوں اندھیروں میں بھٹکنے کے بعد میں یکدم تیز روشنی میں نکل آیا ہوں۔"

"ایسی کیا بات تھی اس میں۔؟" میں نے پوچھا۔ میری روح آسمان کی بلندیوں پر پرواز کررہی تھی۔

وہ بولے...... "محمدؐ نے اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھ کر لاکھوں لوگوں کے سامنے صاف اور غیر مبہم الفاظ میں اعلان کیا کہ تمام انسان برابر ہیں۔ گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر۔ ایک قوم والے کو دوسری قوم والوں پر کوئی ترجیح یا فضیلت نہیں سوائے اس کے جو اللہ کے ڈر سے نیک کام کرے یعنی نیکی کرے۔" اس کو پڑھ کر مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے میں اسی چیز کی تلاش میں تو ملکوں ملکوں بلکہ دربدر مارا مارا پھر رہا ہوں اور یہ اچانک ہی میرے ہاتھ لگ گئی۔ یہی تو معراج انسانیت ہے اور یہی منشور انسانیت ہے کیونکہ خدا کا مدعا اور خدا کا مذہب یہی تو ہے۔ پھر ایک ایسے معاشرے میں جو زندہ ہی انسانی اونچ نیچ پر تھا۔ یہ ایسا انقلابی اعلان تھا جو اس زمانے کے انسانی تصور سے بھی بالا تھا۔ میں ششدر رہ گیا......"

"پھر میں نے ایک واقعہ پڑھا۔ کہ محمدؐ کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد ایک بادشاہ مسلمان ہو کے مکہ آیا...... وہاں وہ مسلمانوں کی عبادت گاہ کا چکر لگا رہا تھا کہ کسی حبشی غلام۔ جو اس زمانے میں کمترین سمجھے جاتے تھے۔ کا پیر اس کی لمبی قمیض پر پڑ گیا۔ یہ ایک ایسی جسارت تھی جس کا جاگیردارانہ نظام میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بادشاہ صاحب نے غصہ میں سرخ ہو کر غلام کو زوردار تھپڑ دے مارا جبکہ کسی اور جگہ تو اس غلام کی گردن ہی ماردی جاتی۔ اس غلام نے اپنے سردار سے شکایت کی۔ سردار نے دونوں کو بلا کر بات سنی اور جب ثابت ہو گیا کہ بادشاہ نے واقعی غلام کو تھپڑ مارا تھا تو بادشاہ کو مخاطب کر کے سردار نے وہ الفاظ کہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں سنے گئے تھے اور سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ انہوں نے کہا...... کہ "جن کی ماؤں نے انہیں آزاد پیدا کیا تھا۔ تم نے انہیں غلام کیسے بنالیا۔؟" یہ کہہ کر غلام کو حکم دیا کہ وہ بادشاہ کو بھی اتنا ہی زوردار تھپڑ مارے جتنا اس نے مارا تھا۔"

"میں نے جاپان، چین، ہندوستان کا خاصا تفصیلی دورہ کیا تھا۔ وہاں کے جاگیردارانہ معاشرہ اور خصوصاً ہندوستان کا ذات پات والا معاشرہ دیکھا تھا اور میں جانتا تھا کہ انسان دوسرے انسان کا کس حد تک محکوم و غلام تھا۔ خصوصاً اچھوت و شودر کا کیا مقام تھا۔ اس کو دیکھتے ہوئے یہ واقعہ ناقابل قیاس معلوم ہوتا تھا۔ میری تو روح بھی خوش ہو گئی یہ واقعہ پڑھ کر۔"

''ایک اور چیز جس سے میں بہت متاثر ہوا تھا وہ غلامی کا انسداد تھا۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ رومن اور عیسائی دور میں آبادی کا نوے فیصد غلاموں پر مشتمل تھا اور صرف دس فیصد آزاد اور اشراف تھے۔ یہ غلام قابل رحم زندگی بسر کرتے تھے۔ حسب ضرورت بیچے اور خریدے جاسکتے تھے اور ان سے جانوروں سے بھی بدتر سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ اسلام اور اس کے بانیؐ نے سب سے پہلے غلامی کے خلاف آواز اٹھائی اور ہر گناہ پر ایک غلام آزاد کرنے کا حکم دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے آخری زمانہ میں پورے عرب میں غلاموں کی تعداد پانچ فیصد بھی نہ تھی اور یہ ایک عظیم کارنامہ تھا۔''

میں نے انہیں ٹوکا...... ''آپ کا کیا خیال ہے جب محمدؐ کے ہاتھ میں حکومت آ گئی تو وہ غلامی کے انسداد کا حکم نہ دے سکتے تھے اور اس مقصد کے لئے اپنی فوج نہ استعمال کر سکتے تھے۔ وہ تو آخر پورے عرب کے حکمران بن چکے تھے۔''

وہ بولے۔ ''اگر غلامی کے انسداد کے لئے طاقت استعمال کی جاتی تو وہی حشر ہوتا جو امریکہ میں ہوا تھا یعنی امریکی طرز کی ایک سول وار عرب میں بھی شروع ہو جاتی اور وہ نفرت مختلف قبیلوں میں پیدا ہو جاتی جو آج بھی امریکہ کی شمالی اور جنوبی ریاستوں میں ہے۔ یہ انتہائی دانشمندانہ اقدام تھا کہ لوگوں کو اس عملی اقدام کی ترغیب دی جائے۔''

''اس کے علاوہ آپ کو اور کس چیز نے متاثر کیا۔؟'' میں خوشی کے مارے دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔

''محمدؐ نے جو سب سے عظیم کام کیا وہ انسان کی عظمت کو بحال کرنا تھا اور اسے وہ درجہ دلانا تھا جو خدا نے اسے اپنے نائب کے طور پر دیا تھا۔ ان سے قبل تو انسانیت انسانوں کے ہاتھوں ہی سسک رہی تھی۔ اب عورتوں کو ہی دیکھ لیں۔ یہ انسانوں کا حقیر ترین طبقہ سمجھی جاتی تھیں۔ خود عیسائیت میں صدیوں یہ بحث رہی کہ آیا عورت انسان بھی ہے کہ نہیں۔؟ عورتوں کو جانوروں کی طرح کھلے عام منڈیوں میں بیچا جاتا تھا۔ اس کی قدر بھی جانوروں سے زائد نہ تھی۔ اسلام نے مرد وعورت کی مساوات کا حکم ایک دوسرے کا لباس کہہ کر دیا...... خود سوچیں کہ لباس انسان کے کس کام آتا ہے۔؟ ہاں ذمہ داریوں کے لحاظ سے مرد کو قوی قرار دیا۔ یہ ایسی باتیں تھیں جو اس زمانے اور معاشرے میں خواب وخیال کی حیثیت رکھتی تھیں۔''

''مسلمانوں کی کتاب کے متعلق کیا خیال ہے آپ کا......؟''

''میں نے کتاب کا ترجمہ پڑھا ہے اور اس کے عالموں سے اس کے معانی اور مفہوم

پوچھے۔ مطالب کے اعتبار سے یہ بہت گہری کتاب ہے۔ آسانی سے سمجھ میں نہیں آتی لیکن غور وفکر کرنے سے معانی تہہ در تہہ کھلنے لگ جاتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ محمدؐ کا کلام نہیں جیسا کہ عیسائی پادری اور یہودی راہب کہا کرتے ہیں۔ کیونکہ اس میں رشد وہدایت کی جو باتیں بیان کی گئی ہیں وہ کسی انسان کے بس کی نہیں۔ ایسی باتیں انسانی ذہن سے بالا کوئی غیر معمولی طاقت ہی کر سکتی ہے جسے خدا کہتے ہیں۔ لیکن ایک بات میں جانتا ہوں کہ یہ کتاب صرف ان لوگوں کے لئے باعث رشد وہدایت ہے جو اسے سوچ سمجھ کر پڑھیں۔ خالی خولی پڑھنے والوں کے لئے اس میں کچھ بھی نہیں......!''

میں نے ٹوکا......''میں نے تھوڑی دیر پہلے سوال کیا تھا۔ کہ اگر آپ اسلام سے اتنے ہی متاثر ہیں تو مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے؟''اس نے میری طرف غور سے دیکھا اور کہنا شروع کیا:۔

''اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو وہ جسے جارج برنارڈ شا نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ اسلام بہترین مذہب ہے لیکن مسلمان بدترین قوم ہے۔'' مجھے یہ دیکھ کے دکھ ہوتا ہے کہ اسلام جیسا عظیم وفطری مذہب جن برائیوں کے خاتمے کے لئے آیا تھا۔ مسلمانوں نے انہی برائیوں کو زندہ رکھا ہوا ہے۔ زندگی کے ہر پہلو میں کون سی برائی ہے جس سے اسلام واضح طور پر منع نہیں کرتا اور مسلمان اسے روا نہیں رکھتا۔ غلامی ساری دنیا میں ختم ہو چکی لیکن سنا ہے کہ عرب ریاستوں میں اب بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ چوری' مکاری' شراب نوشی' دھوکہ دہی۔ کون سی اخلاقی بیماری ہے جس میں مسلمان پیچھے ہیں۔ تو کیا میں ان میں سے ایک بن جاؤں۔؟ میرے خیال میں اسلام اور مسلمان دو علیحدہ چیزیں بن چکے ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ مذہب دو شعبوں میں انسان کی تربیت کرتا ہے۔ ایک اخلاقی' دوسری روحانی...... اخلاقی تربیت یعنی رہن سہن' ملنے جلنے' ادب آداب میں یورپ اسلامی دنیا سے کہیں آگے ہے۔ آپ بازاروں میں چلے جائیں۔ آپ سے کوئی ہیرا پھیری نہیں کرے گا ایک دام مقرر ہیں۔ عام لوگ بات چیت کرتے وقت ادب آداب و عزت سے پیش آتے ہیں۔ ٹریفک کے اصول مقرر ہیں اور ان پر سختی سے عمل بھی ہوتا ہے۔ ہر شخص ایمانداری سے کام کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کوئی کسی کو بلاوجہ تنگ نہیں کرتا۔ ہر کام وقت پر ہوتا ہے اور میرٹ پر بھی۔ اور مسلمان...... وہ ان چیزوں سے عاری ہیں۔ رہی روحانی ترقی کی بات تو کوئی مذہب کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو۔ اگر اس کی تعلیمات پر عمل کرنا تو ایک طرف۔ ان پر نگاہ بھی نہ ڈالی جائے تو روحانی شعبہ کیا ترقی کر سکے گا۔؟ کیا مسلمانوں نے قرآن کو لپیٹ کر طاق میں نہیں

رکھ دیا...... کتنے فیصد مسلمانوں نے قرآن شریف پڑھ رکھا ہے اور کتنے اس پر عمل کرتے ہیں۔؟''

میری ساری خوشی کافور ہو گئی۔ واقعی اس ظالم کی باتوں میں خاصا وزن تھا۔ میں شرمندہ سا ہو گیا۔ اس نے بات جاری رکھی۔

''اب خود سوچیں۔ عیسائی اور مسلمان دونوں ہی روحانی شعبہ میں کم و بیش خالی اور تہی دست ہیں۔ اس لحاظ سے عیسائی مسلمانوں سے تو بہتر ہوئے کہ کم از کم اخلاقی شعبہ میں تو آگے ہیں۔ تو پھر میں مسلمان کیوں ہو جاؤں۔؟ دوسری بات اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ ابتدائی کامیابیوں کے بعد جس میں ایشیا اور افریقہ کا کچھ حصہ اور ساتھ ہی یورپ کا کچھ حصہ یعنی اسپین وغیرہ کی فتح کے بعد مسلمانوں نے بھی وہی غلطی دہرائی تھی جو یہودیوں نے کی تھی یعنی اپنے آپ کو خدا کی چنی ہوئی قوم سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ خدا نے موزز (حضرت موسیٰؑ) کو دشمنوں کے مقابلے میں ہمت دلانے کے لئے ایک لاڈ فرمایا تھا کہ تجھے دنیا کی بادشاہت دے دونگا۔ مال و دولت دے دونگا تیرے اور تیری قوم کے لئے جنت کے دروازے کھول دوں گا۔ یہ سننا تھا کہ حضرت موسیٰؑ کی قوم اپنے آپے سے باہر ہو گئی۔ اس نے اپنے آپ کو ''چنے ہوئے لوگ'' **Chosen People** قرار دے دیا اور یہ سمجھ لیا کہ اللہ بھی اپنے وعدہ کی وجہ سے ان کی ہر ناز برداری پر مجبور ہو گیا ہے اس لئے جو جی چاہے وہ کریں انہیں پوچھنے والا کوئی نہیں۔ اس حساب سے اس قوم نے دنیا کے لوگوں۔ اپنے پیغمبروں کے ساتھ جو کچھ کیا وہ تاریخ کا قابل شرم باب ہے۔ خدا نے اس قوم یعنی بنی اسرائیل کی اصلاح کے لئے بلاشبہ سینکڑوں کی تعداد میں نبی پیغمبر اور نیک بندے بھیجے۔ اور اس قوم نے سب کا برا ہی حشر کیا۔ بلاوجہ ہی ان کو قتل کیا اور دنیا کی کون سی بُرائی نہ تھی جو ''چنے ہوئے لوگ'' ہونے کے زعم میں اختیار نہ کی۔ خدا نے بھی دو ہزار سال تک اپنے وعدہ کا بھرم رکھا اور ان کو اس اُمید پر ڈھیل دیئے رکھی کہ کبھی تو یہ بد بخت قوم راہ راست پر آئے گی......!

اب خدا کا اصول ہے کہ اسے وہ قوم یا لوگ پیارے ہوتے ہیں جو اس کے احکامات پر چلیں اور ان کے اعمال اچھے ہوں۔ محض خاندان، قرابت، نسل یا کسی اور نسبت کی وجہ سے اسے کوئی پیارا نہیں ہوتا۔ خدا کا طریقہ یہ ہے کہ جو قوم اس کی ہدایات پر عمل کرتی رہتی ہے۔ وہ اس کی لاڈلی اور مرغوب قوم ہوتی ہے اور اس کی رحمتوں اور برکتوں کے سائے میں رہتی ہے اسے دنیا میں عظمت، سر بلندی، حکومت، مال دولت سب کچھ ملتا ہے۔ جوں ہی وہ سرگردانی شروع کرتی ہے۔ تو

اس سے سب کچھ چھننا شروع ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصہ تک تو خدا اس قوم کو برداشت کرتا ہے۔ پھر اسے ہٹا کر دوسری لے آتا ہے۔ اور اس کو نوازنا شروع کر دیتا ہے۔ ابتدا سے آج تک خدا کا اصول یہی رہا ہے۔

اب خود ہی دیکھ لو۔ اسرائیلی قوم خدا کی لاڈلی قوم تھی۔ جب منحرف ہوئی تو خدا اس کی بجائے عیسائیوں کو لے آیا جو تھے تو ان ہی میں سے لیکن الگ فرقہ بن گئے تھے۔ جب تک عیسائی خدا کو پوجتے رہے۔ دنیا میں عروج پر رہے۔ جب وہ منحرف ہوئے تو خدا انہیں ہٹا کر مسلمانوں کو لے آیا۔ مسلمانوں نے پچاس سال کے اندر دنیا کی لیڈری حاصل کر لی۔ خدا نے ان کو زمین کے وسیع حصے کی حکومت، دولت، عزت وقار سے نوازا بعد میں یہ حیثیت اس وقت تک رہی جب تک وہ خدا کے تابع رہے۔ آج کل یہ قوم بھی زوال پذیر ہے۔ پھر میں کیوں اس ڈوبتی قوم کا فرد بنوں۔؟ اس کا کیوں نہ رہوں جنہوں نے سوائے عبادت کے اسلام کی تمام خوبیاں اپنے اندر سمو لیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اسلام جتنی اخلاقی تعلیمات دیتا ہے وہ یورپ والے لے چکے مسلمان اس سے تہی دست ہیں۔

میری ایک بات یاد رکھو۔ مسلمانوں جیسی بدقسمت قوم دنیا میں نہیں۔ اس کے پاس قرآن جیسی رشد و ہدایت سے بھری کتاب ہے۔ جس کو پڑھ کر عام انسان بھی اپنی زندگی بدل سکتا ہے لیکن مسلمانوں نے اسے کپڑوں کی تہہ میں لپیٹ کر طاق پر رکھ دیا ہے۔ اسی فیصد مسلمان اسے پڑھ بھی نہیں سکتے اس پر عمل کیا کرینگے۔ جب عمل نہیں کر سکیں گے تو فائدہ کیا اٹھائیں گے۔؟ ماضی میں عیسائیوں نے انجیل کو طاق پر رکھ دیا تھا۔ خدا نے انہیں بھی طاق پر رکھ دیا تھا۔ یہی حال یہودیوں کا تھا......"

اتنی دیر میں کنڈیکٹر نے ویسٹ ہائیم کی آواز لگائی تو وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنی کتاب بغل میں دبائی ہیلمٹ ہاتھ میں لیا۔ پھر بائیں ہاتھ میں منتقل کیا۔ مجھ سے رخصتی کا ہاتھ ملایا۔ میں نے چلتے چلتے اس سے پوچھا:۔ "آپ کس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔؟"

وہ بولا...... "میں آپ کو جواب دے چکا ہوں۔ میں ایک ایسا ا-تھسٹ (منکر مذہب) ہوں۔ جسے خدا اور اس کی عظمت پر تو مکمل یقین ہے۔ بلکہ اس کے بھیجے ہوئے تمام پیغمبروں، نبیوں کی سچائی پر یقین ہے لیکن وہ خود کسی مذہب پر یقین نہیں رکھتا کیونکہ یہ سب مذاہب انسانوں نے اپنے لئے بنا لئے ہیں۔ خدا کے نہیں رہے۔ خدا کا بس نام ہی رہ گیا ہے۔"

جب وہ جانے لگا تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

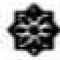
''آپ کام کیا کرتے ہیں۔؟۔''

وہ بولا.... ''میں نے ساری عمر حق اور سچائی کی تلاش' مختلف مذاہب کا مطالعہ اور مقابلہ کرنے میں گزار دی ہے۔اس کے ساتھ ہی تاریخ سے بھی شغف رہا ہے۔اسی لحاظ سے میں لندن یونیورسٹی میں تاریخ کا پروفیسر ہوں۔''

''آپ کا اسم شریف؟''میں نے بڑی عقیدت سے دریافت کیا۔

وہ مسکرایا...... ''کبھی کبھی کسی چیز کو پوشیدہ بھی رہنے دیتے ہیں۔فور گیٹ اٹ Forget it'' ہاتھ چھڑا کر وہ گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔بس ویسٹ ہائیم پر رک چکی تھی۔وہ اتر کر آگے کی طرف چل پڑا۔میرے قریب سے گزرتے ہوئے بولا۔''اس پونے دو گھنٹہ کی ملاقات کو ایک ڈراؤنا خواب Night Mare سمجھ کر بھول جاؤ......اور یہ بھی بھول جاؤ کہ کبھی تمہیں کوئی بس میں ملا تھا۔گڈ بائے۔''

بس آگے چل پڑی......اور میں سوچتا ہی رہ گیا کہ میں پونے دو گھنٹہ ایک منکر مذہب سے بات کرتا رہا یا مبلغ اسلام سے۔



# واپسی

اگلے دن اپنا سوٹ کیس تھامے کنگس کراس اسٹیشن پر میں اُداس اور دل گرفتہ کھڑا ہوا تھا۔ سامنے ہی ملک کے شمالی حصوں کو جانے والی ٹرین تیار کھڑی تھی۔ یہی ٹرین مجھے شیفیلڈ بلکہ رادھرم تک پہنچانے والی تھی۔

ٹرین کے آخری ڈبے کا وہ کونا میرے سامنے تھا جس کی سیدھ میں سارے ڈبے جڑے کھڑے تھے۔ انسانی تمناؤں اور حسرتوں کی طرح یہ ٹرین بھی اتنی طویل نظر آ رہی تھی کہ اس کا آخری سرا جہاں انجن ٹرین سے جڑا ہوا میں ہلکا ہلکا شور بکھیر رہا تھا۔ نظر ہی نہ آتا تھا۔

ٹرین کے سامنے کھڑا میں سوچ رہا تھا کہ کیا میرا لندن کا قیام محض ایک خواب ہی تھا۔ ابھی پانچ دن پہلے ہی تو میں اس کنگس کراس اسٹیشن پر اترا تھا تو کتنا پر جوش تھا اور کس قدر خوش کہ لندن کی اس سرزمین پر قدم رکھ رہا ہوں جسے دیکھنا میری زندگی کی ایک بہت بڑی تمنا تھی۔ اور آج ۔یعنی کُل پانچ دن بعد قدرت کے اس رنگین اور دلفریب نگار خانے سے کس قدر مایوس اور کتنا تہی دست ہو کے جا رہا ہوں۔ کسے پتہ کہ اس شہر نے مجھ سے کیا کچھ چھین لیا اور میں کیا کچھ کھو کے یہاں سے رخصت ہو رہا ہوں۔

پچھلی رات گھر پہنچتے ہی میں نے رادھرم ٹیلی فون کر دیا کہ میں کل واپس پہنچ رہا ہوں۔ طارق اور ایڈنا یہ سن کے خاصے حیران ہوئے تھے۔ ایڈنا نہ رہ سکی' کہنے لگی۔ ''لندن جیسے رنگین و دلفریب شہر میں جو ایک دفعہ پہنچ جاتا ہے وہ واپسی کا نام نہیں لیتا ہے' ایک تم ہو کہ اتنی جلدی واپس آ رہے ہو۔! کیا وجہ ہے؟'' اب ظاہر ہے کہ میں اسے کیا بتاتا۔ طارق نے البتہ کہا کہ اگر میں اس ٹرین سے آؤں جو صبح دس بجے کے قریب لندن سے چلتی ہے تو ایڈنا مجھے لینے رادھرم کے اسٹیشن پر پہنچ جائے گی۔ اس ٹیلی فون کے بعد میں نے اقبال صاحب سے درخواست کی کہ وہ مجھے صبح کے نو بجے تک ایسٹ ہائیم کے ٹیوب اسٹیشن تک پہنچا دیں تاکہ میں ٹیوب پکڑ کر وقت پر کنگس کراس

اسٹیشن پر پہنچ سکوں۔

بس ۔اسی مقام یعنی اقبال صاحب کے گھر پر میرے سفر کی انتہا ہوئی اور میں اپنے چھوڑے ہوئے قدموں کے نشانوں پر چلتا ہوا واپس جارہا تھا۔اس مقام کی طرف جہاں سے میں نے اس مختصر سے سفر کا آغاز کیا تھا۔

اقبال صاحب نے آج صبح نو بجے سے پہلے ہی مجھے ایسٹ ہائیم کے گیٹ پر اتار دیا۔یہ وہی گیٹ تھا جو مین بازار میں بھری پڑی سڑک کے کنارے بنا ہوا تھا اور جس سے نیچے دور تک سیڑھیاں اترتی ہوئی جارہی تھیں اور ان ہی سیڑھیوں پر چڑھ کر پانچ دن قبل میں ایسٹ ہائیم کے گیٹ تک پہنچا تھا۔سیڑھیاں اترنے سے پہلے میں نے دائیں طرف دیکھا۔رینٹ اے کار کی دکان بدستور کھلی ہوئی تھی جہاں سے میں نے پانچ دن قبل اقبال صاحب کے یہاں ٹیلی فون کیا تھا اور اس غل میں مجھے دنیا کے کمینے ترین انگریز سے واسطہ پڑا تھا۔کالا سوٹ اور ڈھیلی ٹائی کے ساتھ دونوں کہنیاں شوکیس پر ٹیکے وہی انگریز اسی جگہ کھڑا بازار کی رونق دیکھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر یا تو پہچان گیا یا پھر عادتاً ہی ''بائے بائے'' کے انداز میں دایاں ہاتھ بلند کیا۔جواب میں' میں نے بھی ''بائے بائے'' کیا اور مڑ کر تیزی سے سیڑھیاں اترتا ہوا ٹیوب اسٹیشن کی طرف چلا گیا۔

ایسٹ ہائیم کا اسٹیشن خاصی گہرائی میں ہے۔ابھی اتر کر کھڑا ہی ہوا تھا کہ ٹیوب آ گئی۔ آرام سے رکی' آرام ہی سے اس کے دروازے کھلے۔بغیر کسی عجلت کے میں سوار ہوا۔آرام سے ہی دروازے بند ہوئے اور پھر آرام سے ہی ٹرین چل پڑی اور تھوڑی دیر میں ہی رفتار پکڑ گئی۔پھر وہی سرنگیں آئیں۔بھرے بازاروں میں بسوں' ٹیکسیوں اور موٹر کاروں سے ٹرین کی ریس ہوئی۔ ٹرین کبھی زمین کی گہرائیوں سے گزری اور کبھی بلندیوں سے۔آتی دفعہ یعنی پانچ دن پہلے مجھے ٹیوب ٹرین کے ایک ایک لمحے سے دلچسپی تھی لیکن واپسی پر یہ سب کچھ فضول سا لگ رہا تھا۔لگ بھگ آدھ گھنٹہ کے سفر کے بعد کنگس کراس اسٹیشن آ گیا جہاں ٹیوب ختم ہوئی تھی۔میں نے نیم دلی سے اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور ٹرین سے اتر آیا۔

سامنے ہی سیڑھیاں اوپر چڑھ رہی تھیں۔ جہاں اصلی اور بڑا کنگس کراس اسٹیشن واقع تھا۔جہاں سے شمالی انگلستان کے لئے ٹرینیں چلتی ہیں۔ان ہی جانے پہچانے راستوں سے' جن پر سے پانچ دن پہلے بڑے جوش وخرش سے اترا تھا' میں نے بے دلی سے اوپر چڑھنا شروع کیا اور تھوڑی ہی دیر میں اسٹیشن پر پہنچ گیا۔جہاں ایک طویل ٹرین شمالی انگلستان جانے کے لئے تیار

کھڑی تھی۔

وسیع وعریض پلیٹ فارم پر حسب معمول بے پناہ خلقت جمع تھی لیکن مجھے یہ پلیٹ فارم خالی خالی اور سنسان دکھائی دے رہا تھا ٹرین کی روانگی میں خاصی دیر تھی کیونکہ اس کی روانگی کا وقت دس بجے تھا۔ اور ابھی نو بج کر پینتیس منٹ ہی ہوئے تھے۔

معاً مجھے خیال آیا کہ شاید میں لندن کو آخری دفعہ دیکھ رہا ہوں کیونکہ اس بات کی توقع ہی نہیں کر سکتا تھا کہ کبھی دوبارہ لندن آ ؤنگا یا آ سکوں گا۔ اس لئے اور کچھ نہیں تو اس شہر کی اس آخری منزل کو ہی جی بھر کے دیکھ لوں جہاں سے اسے الوداع کہہ رہا ہوں۔ پھر سوچا کہ جن قدموں پر چل کے آیا تھا اگر ان ہی قدموں کے نشانوں پر چل کے انہیں الوداع کہوں تو اچھا لگے گا۔! چنانچہ سوٹ کیس اٹھا کے بھاری بھاری قدموں سے چلتا اسٹیشن کے قریباً وسط میں اس مقام پر پہنچا جہاں ٹرین سے اترتے ہی مجھے سمینتھا اور اس کی سہیلیوں کے گروپ نے گھیر لیا تھا اور وعدے وعید لئے تھے۔ وہاں پہنچ کر چپ چاپ ساکت کھڑے ہو کر میں نے آنکھیں بند کر لیں تا کہ پانچ دن قبل بیتے لمحوں کی یاد تازہ کر لوں۔ آنکھیں بند ہوتے ہی سمینتھا مع اپنی سہیلیوں کے تصور میں ابھر آئی جو پہلے تو ملامت بھرے انداز میں دیکھتی رہی۔ پھر کہنے لگی......

"آپ تو میرے اندازہ سے کہیں زیادہ بزدل نکلے! کہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ محض چند خواہشوں کے اظہار پر دوستیاں ہی ختم کر کے راہ فرار اختیار کر لی جائے۔ اسے تو شاید دھوکا دینا کہتے ہیں۔! پھر آپ نے تو اس وقت پکاڈلی سرکس پر ملنے کا وعدہ کر رکھا ہے' میں آپ کو وہاں ڈھونڈ رہی ہوں اور آپ ہیں کہ اس وقت لندن ہی چھوڑے جا رہے ہیں۔ اس دھوکا دہی کی سزا بس اتنی ہی ہو سکتی ہے کہ آپ بھی مجھے ایک بھولا بسرا خواب سمجھ کر بھول جائیں کیونکہ اب ہم دونوں اس طرح اچانک ایک دوسرے کی زندگی سے خارج ہو گئے جیسے داخل ہوئے تھے۔ اب آپ کوشش بھی کرینگے تو بھی مجھے مل نہ پائیں گے۔ کیوں کہ آپ کے پاس میرا پتہ نہیں۔ جب بھی آپ میرے گھر آئے میں ہی آپ کو لے کر آئی تھی۔ ایسٹ ہائیم کا پتہ آپ نے نہیں دیا۔ پاکستان کا پتہ آپ نے نہیں دیا ورنہ شاید کبھی خط کے ذریعے ہی ملاقات ہو سکتی۔ ہم دونوں پکاڈلی میں ملا کرتے تھے اور وہ بھی وقت مقرر کر کے۔ وہاں تو اب ملاقات بھی اتفاق سے ہی ہو سکے گی کیونکہ ضروری نہیں کہ دونوں ایک ہی وقت وہاں پہنچیں۔ اس لئے نہ آپ مجھے ڈھونڈ سکیں گے اور نہ ہی کوشش کے باوجود میں آپ کو تلاش کر سکونگی۔ ہاں کبھی پاکستان میں ابتدائی سردیوں کی ہلکی

ٹھنڈی ہوا آپ کو میری یاد دلا دے تو شاید یاد آ جاؤں۔ ویسے آپ تو میری زندگی سے ایسے گئے کہ نشان تک نہ چھوڑا۔ کیا کبھی کوئی ایسا بھی کرتا ہے۔؟

آئے میری زندگی تجھے ڈنڈھوں کہاں
نہ تو مل کے گئے نہ ہی نشاں چھوڑا

مین نے سر کو جھٹکا دیا تو سمینتھا اور اس کا گروپ غائب ہو گیا اس کی بجائے سامنے ٹرین کا تقریباً خالی ڈبہ کھڑا ہوا تھا۔ ''واقعی''۔ میں نے سوچا ''اب تو سمینتھا سے ملاقات ناممکنات میں سے ہے۔ میں بھی تو چوروں اور بزدلوں کی طرح میدان سے اس طرح غائب ہوا ہوں کہ نشان تک نہ چھوڑا۔ میرے پاس اس کا پتہ تک نہیں۔ نہ اسے خط لکھ سکتا ہوں نہ پیغام بھجوا سکتا ہوں۔ نہ ہی کسی قسم کا رابطہ کر سکتا ہوں۔ اس طرح تو واقعی سمینتھا ہمیشہ کے لئے میری زندگی سے نکل گئی''۔ اس خیال نے مجھے لرزا کے رکھ دیا۔ بے اختیار جی چاہا کہ واپس چلا جاؤں۔ ابھی دس بجنے میں دس منٹ باقی ہیں۔ سمینتھا تو شاید ابھی پکاڈلی پہنچی بھی نہ ہو گی۔ اگر کوشش کروں اور ٹیکسی پکڑ کر پکاڈلی پہنچ جاؤں تو ملاقات ہو سکتی ہے۔ ابھی تو پکاڈلی کا راستہ مختصر ہے لیکن چند منٹوں کے بعد اتنا طویل ہو جائے گا کہ عمر بھر کے سفر کے بعد بھی نہ کٹے گا۔ پھر خیال آیا کہ نہیں جو فیصلہ کر چکا ہوں وہ ٹھیک ہے۔ سمینتھا اور اس کی ماں کو ایک بھولا بسرا خواب سمجھ کر بھول جانا ہی بہتر ہے بلکہ یوں سمجھ لینا چاہئے جیسے وہ کبھی میری زندگی میں آئی ہی نہ تھیں۔ آخر پانچ دن کی رفاقت اس طویل زندگی میں کیا اہمیت رکھتی ہے؟ اتنی مختصر مدت کے ساتھی تو ہوتے ہی بھول جانے کے لئے ہیں۔

میں نے پھرتی سے سوٹ کیس اٹھایا اور مزید ذہنی کشمکش سے بچنے کے لئے سامنے والے ڈبے میں جا گھسا۔ ڈبے میں گنتی کے مسافر تھے۔ میں نے ڈبے کی کھڑکی کے قریب وہی جگہ پسند کی جس پر سفر کر کے لندن آیا تھا۔ ٹرین ٹھیک دس منٹ کے بعد روانہ ہوئی لیکن یہ آخری دس منٹ بہت ہی اذیت ناک ثابت ہوئے۔ بار بار خیال آتا تھا کہ سمینتھا پکاڈلی پہنچ چکی ہو گی اور حسب وعدہ میرا انتظار کر رہی ہو گی کہ ابھی آیا اور ابھی آیا۔ ممکن ہے کہ پکاڈلی کے فوارے کے نیچے اور ارد گرد جو تماشے ہو رہے ہونگے ان کو دیکھنے میں مشغول ہو گی۔ کیا پتہ کسی کبوتر کو ہاتھ پر بٹھا کر چوگا کھلا رہی ہو۔ ممکن ہے۔ ممکن ہے۔ بہت کچھ ممکن ہے کیا کچھ نہ ہو رہا ہو۔ یہاں تو بس یہ احساس جرم تھا کہ میں نے سمینتھا کے ساتھ دھوکا کیا اور یہ احساس مجھے پیسے ڈال رہا تھا۔ اس احساس جرم کے تحت میں نے دوبارہ ٹرین سے اترنے کی کوشش کی لیکن ان دیکھی قوتوں نے

میرے پیر جکڑ لئے۔

اس کشمکش میں تھا کہ اسٹیشن پر لگے لاؤڈ اسپیکر پر اعلان ہوا کہ گاڑی چلنے والی ہے۔تمام مسافر سوار ہو جائیں اس کے ساتھ ہی چند مسافر جو تفریحاً نیچے کھڑے ہوئے تھے یا اپنے وداع کرنے والوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ٹرین پر سوار ہو گئے۔عین ایک منٹ بعد ٹرین نے ہلکا سا جھٹکا لیا اور رینگنے لگی۔اتنے میں ایک بھاری بھرکم سی خاتون دوسری طرف سے دوڑ کے آئیں اور میرے برابر والی کھڑکی میں سے گردن باہر نکال کر زور سے آواز لگائی...... ''اینڈریو جونز...... جلدی کرو...... گاڑی روانہ ہو رہی ہے...... دوڑو......!''

سامنے اسٹال سے دو بچے جن کی عمریں آٹھ اور دس سال کے درمیان ہونگی۔کچھ خرید رہے تھے۔انہوں نے آواز سن کر دوڑ لگا دی اور تیز ہوتی ہوئی گاڑی میں سوار ہو گئے۔بچوں کی ماں کی جان میں جان آئی اور وہ دونوں کو بازوؤں سے پکڑ کر اپنی سیٹ پر لے گئی اور پیار بھرے انداز میں ڈانٹ ڈپٹ کرنے لگی۔''بچے تو ساری دنیا میں یکساں ہوتے ہی ہیں۔مائیں بھی ایک جیسی ہوتی ہیں۔کم از کم بچوں کے معاملے میں......!''میں نے سوچا۔

ٹرین آہستہ آہستہ رفتار پکڑ رہی تھی۔پلیٹ فارم۔اس پر رکھی ہوئی بینچیں۔ان پر بیٹھے لوگ پلیٹ فارم پر کھڑے لوگ۔ٹھیلے۔اسٹال۔سب آہستہ آہستہ لندن کی سمت کھسک رہے تھے۔میری واپسی کا سفر شروع ہو چکا تھا۔

میں نے گھڑی دیکھی تو دس بج کر دو منٹ ہوئے تھے۔دل میں ایک دفعہ پھر ہوک اٹھی کہ سمینتھا اس وقت تک تو ضرور ہی پکاڈلی سرکس پہنچ چکی ہو گی لیکن اب ہو بھی کیا سکتا تھا۔اب تو چلتی ٹرین سے اترا بھی نہیں جا سکتا تھا۔چلو۔جو قسمت میں تھا وہی ہوا۔میں نے دل کو تسلی دی۔پھر دل بہلانے کے لئے باہر دیکھنے لگا۔لندن میں ہر سو صبح کا تیز اجالا پھیلا ہوا تھا۔زندگی بھرپور طریقے سے رواں دواں تھی۔سڑک پر گاڑیوں کا سیلاب رواں دواں تھا چھوٹی بڑی عمارتیں اپنے طور پر گھومتی ہوئی آہستہ آہستہ گزر رہی تھیں۔باہر کھڑے کچھ زندہ دل ٹرین کو گزرتے دیکھ کر خوامخواہ ہی ہاتھ ہلا ہلا کر الوداع کہہ رہے تھے۔جواب میں ٹرین کے اندر سے بھی ہاتھ ہل رہے تھے۔پل پل ٹرین کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔میں اس پل کے انتظار میں تھا جسے میں نے لندن آتے ہوئے نوٹ کیا تھا۔تھوڑی ہی دیر بعد ٹرین اس پل پر سے بھی زناٹے سے گزر گئی۔گہرائی کی وجہ سے بس اتنا محسوس ہوا کہ ٹرین کی رفتار کم ہو گئی ہو لیکن دوبارہ زمین پر پہنچتے ہی ٹرین اسی رفتار

سے رواں دواں تھی۔ اس کے بعد میں نے اس ایک منزلہ مکان کا انتظار شروع کر دیا جس کے گرد زرد لائنوں کا حصار سا بنا ہوا تھا۔ جلد ہی وہ بھی آیا اور پلک جھپکتے میں گزر بھی گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ انتظار وغیرہ میں محض اپنے آپ کو بہلانے بلکہ جذباتی کشمکش سے نکالنے کے لئے کر رہا ہوں اور اب ان بچگانہ حرکتوں کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ مجھے مردانگی سے کام لینا ہوگا۔

باہر سے توجہ ہٹا کر میں نے ٹرین کا اندرونی جائزہ لیا۔ جس بینچ پر میں بیٹھا تھا اس پر میرے سوا کوئی اور نہ تھا۔ سامنے والی بینچ بھی خالی تھی۔ دوسری طرف اینڈریو اور جون کی ماں مصنوعی بلکہ پیار بھری ڈانٹ کے ساتھ اپنے بچوں کو چوگا کھلا رہی تھی۔ اس سے پچھلی سیٹ پر ایک بوڑھا جوڑا سب سے بے نیاز بیٹھا ہوا تھا بڑے میاں کتاب پڑھ رہے تھے اور بڑی بی باہر کے مناظر سے لطف اندوز ہو رہی تھیں ان سے پیچھے تین چار قطاریں خالی تھیں۔ اس کے بعد ایک دو خاندان گپیں ہانک رہے تھے۔ اس سے پرے یعنی سب سے آخر میں ایک مختصر سا چائے کا اسٹال تھا جس کے ٹول پر ایک بڑی بی دنیا جہاں سے بے زار بیٹھی دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنائے اس پر چہرہ سجائے پورے ڈبے کا ''تماشہ اہل کرم'' دیکھ رہی تھیں۔

عین میری پشت پر چھ لڑکے بیٹھے گرما گرم گفتگو میں مصروف تھے۔ دو خاصے طیش کے عالم میں تھے۔ دو انہیں دھیمی آواز میں سمجھانے کی فکر میں تھے اور باقی دو سامعین کی صف میں شامل تھے۔ موضوع خاصا کڑوا کسیلا تھا لیکن ٹرین کے شور کی وجہ سے اچھی طرح سنائی نہیں دے رہا تھا۔ ویسے آوازیں تھیں کہ بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھیں۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ نوجوان کچھ لڑنے جھگڑنے کے موڈ میں ہوں......!

پورے ڈبے میں بس اتنے ہی لوگ تھے۔

بوریت سے بچنے کے لئے میں نے سوچا کہ چلو ایک کپ چائے ہی پی لی جائے۔ چنانچہ چائے لینے کے لئے اسٹال تک پہنچا تو پتہ چلا کہ بڑی بی بیکاری کے ہاتھوں تنگ آ کر اونگھ رہی تھیں بلکہ شاید سو ہی چکی تھیں۔ اپنے اکلوتے گاہک کو دیکھ کر خوش ہوئیں۔ جھٹ گتے کے کپ میں سیاہ چائے بھر کر میرے حوالے کی۔ میں نے چینی کے متعلق پوچھا تو بڑی بی نے بڑی بے نیازی سے ایک کونے کی طرف اشارہ کر دیا جہاں چینی سے لبالب بھرا چینی دان اور چمچوں سے بھری ایک بڑی سی سینی رکھی تھی گویا مطلب یہ تھا کہ جاؤ جتنی چاہے چینی چائے میں ڈال لو۔ ساتھ ہی ایک پلیٹ اور بھی پڑی تھی جس میں تین اور استعمال شدہ چمچ پڑے ہوئے تھے تا کہ استعمال کے بعد چمچ علیحدہ

رکھ دیئے جائیں۔

برطانوی ریلوے کی فیاضی کا میں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور بڑی بی کی نظر بچا کر ایک کی بجائے دو چمچ چینی چائے میں ڈال دی حالانکہ میں شوگر کا مریض بھی ہوں۔ پھر چمچوں کا جائزہ لیا۔ نہایت صاف ستھرے چمکتے ہوئے بھاری بھر کم تین چار درجن خوبصورت چمچ بڑے سلیقے سے سینی میں پڑے ہوئے تھے۔ بڑی بی ان سے خاصی بے پرواہ سی معلوم ہوتی تھیں۔ ایک لمحہ کے لئے میں نے سوچا کہ اگر ان ڈھیر سارے چمچوں میں سے تین چار چمچ اٹھا کر کوٹ کی جیب میں ڈال لئے جائیں تو بڑی بی یا کسی اور کو کیا پتہ چل سکتا ہے؟ لیکن پھر اس خیال کی کمینگی پر ہی شرم سی محسوس ہوئی چنانچہ جس چمچ سے میں نے چائے میں چینی ہلائی تھی۔ اسے قدرے زور سے استعمال شدہ چمچوں کی تھالی میں پھینکا تاکہ بڑی بی بھی سن لیں کہ چمچ واپس رکھ دیا گیا ہے۔!

بڑی بی کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے ویسے ہی پوچھ لیا...... ''آپ نے اتنے ڈھیر سارے چمچ بغیر نگرانی کے رکھ دیئے ہیں۔ کیا لوگ ان میں سے کچھ چرا کر نہیں لے جاتے۔؟''

بڑی بی نے ایک لمحہ کے لئے اس عجیب و غریب سوال پر مجھے گھورا اور یہ کہتے ہوئے کام میں مصروف ہو گئیں۔

''انگریز قوم کبھی ایسی اوچھی اور گھٹیا حرکت نہیں کرتی۔ ہاں البتہ کبھی کبھار کوئی جمیکن۔ ہندوستانی، پاکستانی، سری لنکن یا بنگلہ دیشی ایسی حرکت کر جاتا ہے۔ تو ہم دیکھ لینے کے باوجود اس کی طرف سے توجہ ہٹا لیتے ہیں۔ آخر کو بے چارے بھوکے ممالک سے آتے ہیں اور یہی کام کر سکتے ہیں۔ لیکن ان کے دو چار چمچ چرا لینے سے برطانوی ریلوے کو کچھ فرق نہیں پڑتا۔''

پھر ہنس کر بولیں...... ''کیوں کیا ارادہ ہے۔ کوئی چمچ چرا تو نہیں لیا؟''

میں بھی ہنسنے لگا۔ ''اٹھایا تو کوئی نہیں۔ ہاں آپ کی تقریر کے بعد تو مجھے واقعی ایک آدھ درجن چمچ اٹھا لینے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے میرے کام آئیں گے اور برطانوی ریل کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

بڑی بی کچھ کہنے ہی والی تھیں کہ ایک بڑے میاں بھی خریداری کے لئے تشریف لے آئے۔ گو خاصے سن رسیدہ تھے لیکن چھوٹی چھوٹی بھوری داڑھی نے انہیں خاصا دیدہ زیب بنا رکھا تھا۔ بے داغ سوٹ پہنے۔ ہاتھ میں چھوٹی سی چھڑی لئے نخوت کے ساتھ آن کر کھڑے ہو گئے۔ پہلے مجھ کالے پر نفرت بھری نظر ڈالی۔ پھر بڑی بی کی طرف متوجہ ہو کر بسکٹ کا ایک ڈبہ طلب فرمایا۔

بڑی بی چونکہ تفریحی موڈ میں مجھ سے بات کر رہی تھیں اس لئے انہوں نے بے نیازی سے بسکٹ کا ایک ڈبہ اٹھا کر بڑے میاں کے حوالے کیا اور جب وہ بسکٹ کے پیسے کاٹ کر بقایا رقم بڑے میاں کو واپس کر رہی تھیں تو مجھ سے جھک کر کہنے لگیں۔

''ہمیں کسی اور سے تو نہیں بس کالوں سے ڈر لگتا ہے۔ یہ لوگ چوریاں بہت کرتے ہیں اور وہ بھی معمولی معمولی چیز کی۔ شاید ان کے اپنے ممالک میں بھوک زیادہ ہے اس لئے ایسی حرکتیں کرتے ہیں۔!''

میں کچھ کہنے کو ہی تھا کہ بڑے میاں نے بڑی تلخی سے فرمایا۔

''صرف کالے ہی نہیں ...... بلکہ یہ تمام رنگدار نسلیں ہوتی ہی چور ہیں۔ پتہ نہیں حکومت نے اس معزز شریف انگریز معاشرے میں انہیں آنے اور اسے داغ دار کرنے کی اجازت کیوں دے رکھی ہے۔ میرا بس چلے تو میں تو ایک ایک گندے رنگ دار Coloured نسل کے انسان کو اس پاک اور شریف ملک سے نکال کر پھینک دوں اور اس معاشرے کو پھر سے صاف ستھرا کر دوں۔''

بڑے میاں نے خود ساختہ جوش کے عالم میں کانپتے ہاتھوں سے بسکٹ کا ڈبہ کھولنا شروع کیا۔ ان کی کانپتی' انگلیاں بسکٹ کھولنے میں مشغول تھیں لیکن چمکدار مہین مہین آنکھیں سے جو چشمے کے پیچھے چھپی ہوئی تھیں۔ نفرت سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ ان کے لہجہ اور حرکات سے ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ حضرت انگریز شرفاء کے اس نام نہاد طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں جو اپنے سوا کسی کو انسان سمجھنے کا روادار ہی نہ تھا۔ کالے اور رنگ دار نسل کے لوگ ان کے نزدیک جانوروں سے بھی بدتر تھے۔ یہ طبقہ محض ماضی کی یادوں پر زندہ ہے۔ اور اندر سے اتنا کھوکھلا ہو چکا ہے۔ کہ کسی ردعمل اور دلیل کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔ دوسری جنگ عظیم سے قبل برطانیہ میں ایسے لوگوں کی اکثریت تھی لیکن بدلے ہوئے حالات میں یہ طبقہ ختم ہوتا چلا گیا اور اب ایسے ''شرفا'' خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ چونکہ ایسے لوگ اپنے خیالات میں بودے ہوتے ہیں اس لئے بزدل بھی ہوتے ہیں۔

اب یہ تو ظاہر ہے کہ رنگ دار نسل کا ایک ہی نمائندہ وہاں کھڑا تھا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ایسی بات اسے بری لگنی بھی چاہئے تھی لیکن بجائے غصہ کرنے کے میں ہنس پڑا۔

''میرا خیال ہے''۔ میں نے بڑے میاں کو مخاطب کیا۔ ''چوری اور ڈاکہ زنی پر سیاہ اور رنگ دار نسلوں کی اجارہ داری نہیں۔ ان سے بھی بڑھ کر چور اور ڈاکو بلکہ سینہ زور نسلیں اس دنیا میں

موجود ہیں۔اس لندن کو ہی لے لیجئے۔اس میں پچیس ہزار سے زائد عجائبات اور یادگاریں موجود ہیں۔جن میں سے بیشتر کا تعلق لندن یا برطانیہ سے نہیں۔ظاہر ہے کہ یہ مختلف ممالک سے لائی گئی ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ان ممالک نے ہنسی خوشی تو اپنے خزانے برطانیہ کے حوالے نہیں کئے۔یہ زبردستی لوٹ کھسوٹ کے لائے گئے ہیں۔یہاں کے میوزیم نیشنل لائبریریاں سب ہی غیر ملکی لوٹ کے مال سے بھری پڑی ہیں۔ہندوستان سے لوٹا ہوا کوہ نور ہیرا آج بھی تاج برطانیہ میں جڑا ہوا ہے۔تخت طاؤس بھی اسی کی ملکیت تھا جو آج برطانیہ کی آبرو بنا ہوا ہے۔یہ بھی لوٹ کے لائے گئے ہیں۔ظاہر ہے کہ یہ لوٹ برطانیہ اور یورپ کی سفید فام قوموں نے ہی مچائی تھی اور وہ بھی ان گندے سیاہ فام لوگوں کے ممالک میں جا کر......اب آپ بتائیے کہ آپ نے کبھی سنا ہے کہ کسی سیاہ فام یا رنگدار قوم نے برطانیہ یا یورپ میں گھس کر اس طرح کی لوٹ مچائی ہو۔تو پھر کون سی قوم چور وڈاکو ہوئی۔رنگدار یا سفید فام......؟"

بڑے میاں نے نفرت سے منہ پھیر لیا گویا کہہ رہے ہوں کہ ہمارے ملک میں آ کر ہمیں ہی بُرا بھلا کہہ رہے ہو لیکن حقائق اتنے تلخ تھے کہ انہیں جھٹلا نہ سکتے تھے۔بڑی بی کچھ دلچسپی اور کچھ حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔

اس دفعہ میں نے بڑی بی کو مخاطب کیا۔

"آج سے تین سو سال پہلے برطانیہ کی معاشی حالت کیسی تھی۔؟ آپ کو معلوم ہے۔"

بڑی بی نے نفی میں سر ہلایا۔غالباً تاریخ میں کوری تھیں۔حالانکہ برطانیہ کے لوگوں کے متعلق مشہور ہے کہ وہ دنیا کے دوسرے ممالک اور قوموں کے متعلق کچھ نہیں جانتے لیکن اپنے ملک کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔

"تین سو سال پہلے برطانیہ یورپ کا وہ پسماندہ اور غریب ترین ملک تھا جس کا نوٹس اس کے ہمسایہ ممالک بھی نہ لیتے تھے۔اب یہ ایک امیر ملک ہے۔یہ ساری دولت پتہ ہے کہاں سے آئی۔؟

پچاس فیصد سے زائد ہندوستان سے اور باقی دوسرے برطانوی مقبوضات مثلاً شمالی امریکہ اور کینیڈا' جنوبی افریقہ اور آسٹریلیا سے۔اس کی ابتدا آج سے تین سو سال قبل ہوئی تھی جب غربت اور افلاس کے ہاتھوں تنگ آ کر چند انگریز خاندان اپنا وطن چھوڑ کر ہندوستان پہنچے جو ان دنوں اپنی دولت کی وجہ سے سونے کی چڑیا مشہور تھا۔اور دنیا کے انتہائی دولت مند ممالک میں

سے ایک تھا۔ ان مفلس انگریزوں نے جب ہندوستان کی دولت دیکھی تو ان کی آنکھیں کھل گئیں اور انہوں نے اپنے ہم وطنوں کو ہندوستان آنے کی دعوت دی۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستانی دولت کے چرچے یورپ بھر میں پہنچے تو یورپ بھر کی اقوام ہندوستان کی طرف دوڑ پڑیں چنانچہ فرانسیسی، پرتگیزی ہسپانوی، ولندیزی جب ہی وہاں پہنچے اور دولت سے جھولیاں بھر بھر کے واپس آئے اور تو اور کولمبس نے ہندوستان جانے کے شوق میں نیا راستہ دریافت کرنے کی کوشش میں امریکہ دریافت کر ڈالا۔ آپ کو پتہ ہے وہ نکلا تو ہندوستان جانے کے لئے ہی تھا اور اتفاق سے امریکہ پہنچ گیا۔ قسمت کی ستم ظریفی کہ مرتے دم تک وہ یہی سمجھتا رہا کہ وہ ہندوستان پہنچ گیا ہے۔

یورپ کی یہ گوری قومیں جب اپنے گھروں سے نکلیں تو اخلاق اور انسانیت کو گھر پر ہی چھوڑ گئیں۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ چوروں، ڈاکوؤں، رہزنوں اور طالع آزماؤں کے گروہ کے گروہ اپنے اپنے ممالک سے نکلے۔ پہلے ہندوستان پہنچے۔ وہاں آپس میں لڑے جھگڑے۔ ان جنگوں میں انگریز فتح یاب ہوئے جس کے نتیجے میں باقی یورپی قوموں کو ہندوستان چھوڑنا پڑا اور اس طرح وہ دنیا بھر میں پھیل گئیں اور ہر جگہ لوٹ مار شروع کر دی۔ اس تمام عمل میں ان گوری اقوام نے چوری اور سینہ زوری کے ریکارڈ قائم کئے۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں نے شمالی امریکہ پر قبضہ جمایا اور اس عمل میں وہاں کے اصل اور قدیم باشندوں یعنی ریڈ انڈینز کو بے دردی سے ختم کر ڈالا۔ پرتگیزیوں اور ہسپانویوں نے جنوبی امریکہ کا رخ کیا۔ یہ نصف براعظم اپنے ہیرے جواہرات اور زمرد کے لئے مشہور تھا۔ جو وہاں کے قدیم باشندوں نے اپنی عبادت گاہوں میں محفوظ رکھے ہوئے تھے۔ ان قوموں نے نہ صرف ان قیمتی پتھروں کو لوٹا اور اپنے ملک لے گئے بلکہ اس ملک کے اصل باشندوں یعنی انکا اور مایا قبائل۔ جو اپنی شاندار تہذیبوں کے وارث تھے۔ کا بے دردی سے قتل عام کیا۔ ان کی بربریت اس حد تک بڑھی کہ انکا قبیلے کا آخری بادشاہ اپنی باقی ماندہ پوری قوم کو لے کر پہاڑوں میں اس طرح غائب ہوا کہ پورے ایک سو سال تک ان کا کوئی سراغ نہ ملا۔ پھر ان سفید فام قوموں کو ان براعظموں میں کھیتی باڑی کرنے کے لئے نوکروں اور غلاموں کی ضرورت محسوس ہوئی تو انہوں نے مغربی افریقہ کا رخ کیا اور وہاں سے لوگوں کو پکڑ پکڑ کر امریکہ لا کر انہیں غلام بنا کر بیچنا شروع کر دیا۔ خیال ہے کہ دو سے ڈھائی کروڑ لوگ ان کے مظالم کا شکار ہوئے ان مظلوموں کی اولادیں آج بھی امریکہ میں سوالوں کے روپ میں دکھائی دیتی ہیں۔ ان کا طریقہ واردات یہ تھا کہ سمندر اور دریاؤں کے قریب اپنے جہاز کھڑے کرتے۔ اپنے ہاتھوں میں بڑے

بڑے جال لے کر انسانوں کے شکار کیلئے نکلتے اکیلے دکیلے کو پکڑ کر لے جا کر جہاز کے تہہ خانے میں بند کر دیتے۔ جب جہاز بھر جاتا تو پھر انہیں امریکہ لے جا کر بیچ ڈالتے بعد میں ان کی ہمت یہاں تک بڑھی کہ پوری پوری آبادیوں پر چھاپے مارتے اور ہر کام کرنے کے قابل نوجوان کو پکڑ کر لے جاتے۔ کیا کبھی آپ نے سنا ہے کہ کسی سیاہ فام یا رنگ دار نسل کے کسی شخص نے کسی سفید فام باشندے کو پکڑ کر غلام بنایا ہو۔ یا اسے اغوا کر کے بیچ ڈالا ہو۔؟''

بڑے میاں بڑی نفرت سے مجھے چشمے کے شیشوں میں سے گھور رہے تھے اور بڑی بی چوکنی کھڑی تھیں۔

میں نے کہنا شروع کیا۔

''تمام یورپی اقوام نے دنیا بھر میں جو کیا سو کیا۔ انگریز قوم بھی کسی سے کم نہ رہی۔ انفرادی اور اجتماعی دونوں طرز پر......!''

''وہ کیسے؟''۔ بڑی بی بولیں۔ کالی اور رنگ دار نسلیں تو روزی کمانے یہاں آتی ہیں۔!''

''میں نے عرض کیا تھا نا کہ آج سے تین سو سال قبل غربت اور افلاس کے ہاتھوں تنگ آ کر چند خاندان اس وقت کے جاندار ترین ملک ہندوستان چلے گئے۔ وہاں انہوں نے بنگال میں ڈیرے ڈالے اور بنگالیوں کی طرح تہمدیں پہن ریڑھیوں پر سامان رکھ کر آوازیں لگا لگا کر بیچنا شروع کیا۔ بنگالی ان لوگوں کو حیرت سے دیکھا کرتے تھے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں جب ان کی مالی حالت بہتر ہوئی تو ان کے بلاوے پر ان کے عزیز اقارب اور پھر دوست بھی آن پہنچے۔ ان لوگوں کی رپورٹ پر ہندوستان کی دولت کا اندازہ کیا گیا اور اس کی بنیاد پر ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' قائم کی گئی۔ جس کا واحد مقصد ہندوستان سے تجارت کرنا تھا۔ اس کمپنی نے اپنے مال گودام تعمیر کیے ان کی حفاظت کے لئے مسلح ملازم رکھے۔ پھر رفتہ رفتہ ان مسلح ملازمین کی تعداد بڑھتی گئی' یہاں تک کہ ایک فوج وجود میں آ گئی جس نے مقامی سیاست میں دخل اندازی شروع کر دی اور مقامی حکمرانوں کی نااتفاقیوں سے فائدہ اٹھایا اور ان کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ پھر اپنے مقبوضہ علاقوں سے جو کچھ ملا اسے لوٹ لوٹ کے انگلستان بھیجنا شروع کر دیا۔ اس زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہر ملازم چاہے وہ کلرک ہو یا چوکیدار یا پھر کوئی افسر کسی پیشہ ور چور سے کم نہ تھا۔ یہ لوگ اپنے مقبوضہ علاقوں میں عام گھروں میں دن دیہاڑے گھس جاتے۔ زیور کپڑا اور جو بھی قیمتی چیز ہاتھ لگتی لے کر بھاگ جاتے۔ مشہور تھا کہ لندن کا کوئی فاقہ زدہ جوان چاہے کلرک ہی بھرتی ہو کر دو سال بھی

ہندوستان میں رہ آتا۔لکھ پتی بن کے لوٹتا تھا۔

''واقعی۔؟'' بڑی بی بولیں۔ان کی آنکھیں حیرت سے پھٹی جا رہی تھیں۔

''اس زمانے کے لوگوں کی سب سے بڑی آرزو کسی بھی طرح ہندوستان جانا تھی۔جیسے آج کل کے نوجوانوں کی آرزو امریکہ یا کینیڈا جانے کی ہے۔!''

''ہاں۔'' بڑی بی بولیں۔''انگلینڈ میں بھی دولت کم ہوتی جا رہی ہے۔اس لئے یہاں کے رہنے والے بھی کینیڈا' امریکہ' آسٹریلیا یا پھر جنوبی افریقہ جانے کی کوشش کرتے ہیں۔وہاں ابھی روزگار کے مواقع وافر ہیں۔میرا بیٹا بھی کینیڈا گیا ہوا ہے۔وہ وہاں کاریں صاف کرتا ہے اور کافی کما لیتا ہے۔'' بڑی بی نے اپنی رام کہانی شروع کر دی۔

''آپ کو دو مشہور چوروں کی کہانی سناتا ہوں''۔میں نے اپنی بات جاری رکھی۔چوروں کے نام پر بڑے میاں بھی چونکے' بڑی بی نے بھی دلچسپی دکھائی۔''ان میں سے ایک کا نام'' رابرٹ کلائیو'' تھا۔بچپن انتہائی غربت و افلاس میں گزرا۔جوان ہوا تو ایسٹ انڈیا کمپنی میں کلرک بھرتی ہو کر ہندوستان چلا گیا۔جہاں اسے فوج میں لے لیا گیا۔نواب ارکاٹ سے چند معرکوں میں اس کا نام چمکا۔اس کے بعد اس نے چوری' ڈاکے اور رشوت ستانی کے وہ اعلیٰ کارنامے انجام دیئے کہ کمپنی کا پہلا گورنر جنرل بن گیا۔لیکن اس کی بدقسمتی کہ اس کے کارناموں پر داد دینے کی بجائے اسے واپس انگلستان بلا لیا گیا اور اس پر مقدمہ چلایا گیا کہ ایک بھوکوں مرتا کلرک چند ہی سالوں میں کس طرح کروڑ پتی بن گیا۔وہ اتنا اعلیٰ درجہ کا فنکار نکلا کہ مقدمات کا سامنا کرنے کی بجائے اس نے خودکشی کر لی''۔

بڑے میاں کا منہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔انہوں نے جلدی سے ڈبے میں سے ایک بسکٹ نکال کے منہ میں رکھا اور جس تیزی سے اسے پیسا وہ یاد رہے گا۔اور تیزی سے واپس اپنی سیٹ پر چلے گئے۔میں ہنس پڑا۔بڑی بی بھی اسے جاتا دیکھ کر مسکراتی رہیں۔پھر میری طرف متوجہ ہو گئیں۔

''دوسرے بڑے چور کا نام وارن ہیسٹنگز تھا یہ بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل تھے۔اتنے بڑے فنکار تھے کہ ساری عمر سوائے دولت جمع کرنے کے کوئی کام نہ کیا۔کمینگی کی انتہا یہ تھی کہ بیگمات اودھ کی کلائیوں سے چوڑیاں' کپڑے اور جسم سے زیورات تک اتروا لئے اور یہ بھی خیال نہ کیا کہ ایک معزز ملکہ سے یہ سلوک کر رہے ہیں حالانکہ اس کے اس فعل پر برطانیہ تک میں نفرت کا

اظہار کیا گیا۔ ان کے بعد بھی دوسرے فنکار آئے اور ایک سے بڑھ کے ایک۔ انہوں نے ہندوستان کی ہر قیمتی چیز ہتھیانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں کسی اخلاقی ضابطہ کا خیال نہ رکھا گیا۔ دنیا کا قیمتی ترین ہیرہ کوہ نور اور اس کا جڑواں ہیرہ کوہ طور دونوں ہی دھونس اور دھاندلی سے انگلستان لے جائے گئے۔ اس طرح دنیا کا قیمتی ترین تخت ''تخت طاؤس'' بھی ہندوستان سے لے جایا گیا۔ ہندوستان کو اس بُری طرح سے تباہ کیا گیا کہ تمام سونا' چاندی' ہیرے جواہرات۔ جو بھی ہتھے چڑھا۔ چھین لیا گیا۔ اس طرح وہ ملک جس کے ہر باشندے کے متعلق خیال کیا جاتا تھا کہ وہ دولت مند ہے۔ مفلس اور غریب ہو کر رہ گیا۔ چنانچہ جب انگریزوں نے ہندوستان چھوڑا تو یہ دنیا کا غریب ترین ملک تھا۔

اب آپ خود ہی بتائیں۔ کہ وہ قوم بڑی چور ہے جو محض دو چار چمچ چراتی ہے یا وہ جو چوری بلکہ سینہ زوری کر کے ہیرے جواہرات چُراتی ہے بلکہ انسانوں کو بھی اور وہ بھی کروڑوں انسانوں کو ان کے گھر سے چرا کے لے جاتی ہے اور غلام بنا کے بیچتی ہے۔؟

بڑی بی مسکرانے کے سوا کچھ نہ کرسکیں۔ اتنے میں ایک دوگاہک آ گئے اور بڑی بی ان کے ساتھ مشغول ہو گئیں اور میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنی سیٹ پر آ گیا۔ بیچ میں بڑے میاں کی سیٹ تھی جو مجھے بری طرح سے گھور رہے تھے لیکن میری نظر پڑتے ہی منہ دوسری طرف کر کے باہر دیکھنے لگے۔

میں سیٹ پر بیٹھ کر قریب قریب ٹھنڈی چائے کی چسکیاں لینے لگا۔ جہاں مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ میں نے ایک انگریز کو دندان شکن جواب دیا۔ وہاں یہ حیرت بھی ہو رہی تھی کہ یہ قوم بھی عجیب ہے کہ اپنے متعلق اتنی تند و تیز باتیں بھی برداشت کر جاتی ہے۔

ٹرین بدستور دوڑی چلی جا رہی تھی۔ لندن کے مضافات گزر رہے تھے۔ بلند و بالا' چمکتی دمکتی عمارات اور ان کے درمیان چھوٹے بڑے مکانات سب گزر رہے تھے۔ چمکتی ہوئی سیاہ سڑکیں ان کے درمیان رنگین لکیریں۔ اور پھر ان کے درمیان دوڑتی بھاگتی۔ اپنی منزل کے لئے بے تاب اور رواں دواں گاڑیاں سب ہی گزرے چلے جا رہے تھے۔ ٹرین کو روانہ ہوئے آدھ گھنٹہ سے زائد ہو رہا تھا لیکن لندن ختم ہی ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ میں نے چائے کا خالی کپ باہر پھینکا اور سیٹ پر سر ٹیک کر آنکھیں بند کر لیں اور سوچنے لگا......

''دن کے ساڑھے دس بج رہے ہیں۔ سورج خاصی بلندی پر جا چکا ہے۔ فضا میں حرارت

گو کم ہے لیکن پھر بھی خوشگوار ہے۔ٹرین کنگس کراس سے کم و بیش بیس پچیس میل دور تو آ ہی چکی ہو گی۔رفتار بھی تو اس کم بخت کی خاصی تیز ہے۔ پچھتر میل فی گھنٹہ سے کیا کم ہو گی۔لندن شہر ہے کہ ساتھ ہی لپٹا چلا آ رہا ہے۔پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہا۔ختم ہی ہونے میں نہیں آ تا۔گو سڑکوں پر رش کم ہوتا جا رہا ہے۔کاریں اور مکانات بھی پہلے کی نسبت کم نظر آنے لگے ہیں۔معلوم ہوتا ہے کہ برمنگھم تک تو ساتھ ہی چلتے رہیں گے......اور ہاں...... سمیلتھا اس وقت کیا کر رہی ہو گی۔؟ اس غریب کو کیا پتہ کہ میں ہر آن ہر لمحہ اس سے دور اور دور تر ہوتا جا رہا ہوں۔ٹرین ہر سیکنڈ ہمارے درمیان فاصلہ زیادہ سے زیادہ کر رہی ہے۔خدا معلوم اس معصوم سے اب دوبارہ کبھی ملنا نصیب ہو گا بھی کہ نہیں۔کبھی اس کی بھولی صورت دیکھ بھی پاؤں گا یا نہیں۔ظاہر ہے کہ نہیں کیوں کہ میں نے اپنا کوئی نشان و پتہ اس کے پاس چھوڑا نہیں اور نہ ہی میرے پاس اس کے نام کے سوا کچھ ہے۔!

اب کوشش بھی کروں تو اس سے رابطہ نہیں کر سکتا۔ہاں۔اگر قسمت ہی مہربان ہو کر اس بھری پری دنیا میں کہیں پر۔کسی جگہ کسی وقت ٹکرا دے اس سے تو دوسری بات ہے۔واقعی میں نے اس طرح فرار ہو کر سخت حماقت کا ثبوت دیا۔اس غریب کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی۔وہ غریب معصوم میرے متعلق کیا سوچے گی۔؟ شاید مردوں پر اعتبار کرنا ہی چھوڑ دے۔وہ پہلے بھی تو ارشد کی ڈسی ہوئی ہے۔واقعی سمیلتھا اتنی تیزی سے میری زندگی میں آئی اور گئی کہ پتہ نہیں چلا۔یہ میری زندگی کا مختصر ترین افسانہ تھا کہ آغاز سے قبل ہی ان جانے انجام کو پہنچ گیا۔

ان ہی خیالوں میں گم تھا کہ اچانک ہی شور سا مچ گیا...... معلوم ہوا کہ وہ چھ عدد نوجوان لڑکے جو لندن سے ہمارے ساتھ ہی روانہ ہوئے تھے۔اپنی سیٹوں سے اٹھ کر میری اور میرے سامنے والی سیٹوں پر آ بیٹھے تھے۔اور ان میں گرما گرم بحث ہو رہی تھی۔ان میں سے چار نے کمر پر رک سیک یعنی بھاری بھرکم سفری تھیلے باندھ رکھے تھے جبکہ دو نے خاصے بڑے سوٹ کیس اٹھا رکھے تھے۔سب ہی نے کھلی قمیصیں اور چست جین پہن رکھی تھیں اور پاؤں میں لمبے لمبے چمڑے کے بوٹ چڑھا رکھے تھے۔سب ہی زور زور سے بول رہے تھے۔سن کوئی بھی نہیں رہا تھا۔

ان میں سے ایک نے گھڑی دیکھی۔باہر نظر کی اور بولا۔

''پندرہ بیس منٹ اور......اور پھر ہماری ساری تفریحی چھٹیاں ختم......غضب خدا کا یارو......سارا سال محنت کی' جان لڑا کر کام کیا۔سو حیلے بہانے کر کر کے۔کنجوسیاں کر کر کے دو ہزار پونڈ بچائے کہ یونان میں سالانہ چھٹیوں کا لطف اٹھائیں گے۔دو ہزار پونڈ بھی ختم ہوئے۔پندرہ

چھٹیاں بھی پلک جھپکتے میں گزر گئیں۔ اور اب پھر وہی ہم اور پھر وہی منحوس برمنگھم...... کل سے مجھے پھر اپنی منحوس نوکری پر جت جانا پڑے گا۔ وہی صبح محنت وہی شام محنت۔ وہی فورمین کی سختیاں اور جھڑکیاں۔ پھر پورا سال اسی طرح گزرے گا۔ پھر پورا سال چھٹیوں کا انتظار رہے گا۔ پھر وہی سال بعد پندرہ چھٹیاں ملیں گی اور وہ بھی اسی طرح گزر جائینگی جس طرح یہ گزر رہی ہیں۔ ہماری بھی کوئی زندگی ہے ہم تو واقعی کولہو کے بیل ہیں......؟"

اس کا نوحہ ابھی جاری تھا کہ دوسرا بولا۔

"پھر یہ بھی تو دیکھو کہ اس کم بخت ٹریول ایجنٹ نے بھی تو ہمارے ساتھ کتنا بڑا فراڈ کیا ہے؟ کیا کیا سبز باغ دکھائے تھے اس نے ہمارا ٹور مرتب کرتے وقت۔ کہ اس دفعہ ہم وہ سرزمین دیکھیں جہاں جمہوریت نے جنم لیا تھا۔ پھر سمندر کے کنارے وہ جگہ دیکھیں جو دنیا کی حسین ترین جگہ کہلانے کے قابل ہے۔ یعنی وہ مقام جہاں سے حسن کی یونانی دیوی۔ کیا نام بتایا تھا اس کا۔ سمندر میں سے برآمد ہوئی تھی۔ پھر وہ غار دیکھیں جہاں دنیا کے اولین ترین انسانوں نے بسیرا کیا تھا۔ اور تمدن کی راہ کے سفر کا آغاز کیا تھا۔ یہ بھی کہا تھا۔ کہ ہم خود ان غاروں میں چند دن بسر کر کے دیکھیں کہ قدرت کتنی حسین ہے اور کس قدر حسن پرور ہے۔ اس طرح ہم نیچر سے قریب ترین رہ کر اس کا لطف اٹھا سکیں۔ بلکہ تصور میں اپنے آپ کو اولین ترین انسان کے روپ میں دیکھ کر وہی کبھی نہ مٹنے والا لطف اٹھا سکیں جو ان انسانوں نے اٹھایا تھا۔ اس کے علاوہ بھی کیا کیا سحر انگیز باتیں کی تھیں کہ ہم سب ہی اس کے فریب میں آ گئے۔! اور پھر یاد ہے جب وہاں ارضی جنت یونان پہنچے تھے تو ہمیں ایک عام سے سمندری ساحل سے واسطہ پڑا تھا۔ یونانی دیوی کا تو کہیں نام و نشان نہ تھا۔ نہ جانے کب اور کس طرح پانی سے برآمد ہوئی ہوگی۔ اس کی بجائے وہاں چند بدمست ہپی سیاح ملے تھے۔ وہ بھی شاید کسی ٹریول ایجنٹ کا شکار ہوئے ہونگے لیکن جن کی بے تکی اور بے ہودہ حرکتوں نے سارا مزا ہی کرکرا کر دیا تھا۔ یہ ہپی۔ حسن کی یونانی دیوی کی یاد میں سارے ہی کپڑے اتار کر نیچر کے بالکل ہی قریب ہو جایا کرتے تھے۔ اور سارا سارا دن ریت پر لیٹے رہا کرتے تھے کہ یونانی دیوی بھی سمندر سے نکل آنے کے بعد تھک کر ریت پر لیٹ گئی تھی۔"

ایک صاحب جو قنوطی شکل پر گول چشمہ لگائے کچھ زیادہ ہی بے تکے لگ رہے تھے اور ٹرین کے جھٹکوں سے کچھ زیادہ ہی جھٹکے لے رہے تھے بولے:۔

"تم اب کیا گلہ کر رہے ہو۔؟ یہ تمہارا ہی تو آئیڈیا تھا کہ اس دفعہ یونان دیکھا جائے۔

دراصل تم نے بھی تو ان دنوں تازہ تازہ یونانی دیو مالا کا مطالعہ کیا تھا' اور اس میں سے تمہیں سمندر میں سے برہنہ حالت میں برآمد ہوتی ہوئی یونانی دیوی ''ایفروڈیٹ'' سب سے زیادہ پسند آئی تھی۔ اور تمہارا خیال تھا کہ شاید اب بھی وہ اس برہنہ حالت میں کھڑی تمہارا انتظار کر رہی ہوگی۔ اسی لئے تو تم نے یونان کی سیر پر زیادہ زور دیا تھا۔ اس سیر میں ہم کو دیوی تو کہیں نظر نہ آئی۔ چند بد تہذیب و بدمست ہی ضرور دکھائی دیئے جو ننگ دھڑنگ پھرنے میں کوئی عار نہ سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ عام سا سمندری ساحل ملا جو ہر جگہ مل جاتا ہے۔ ہاں چند قدیم غار ضرور ملے جن میں ہمارے ٹھہرنے کا بندوبست کیا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ ساحل تو ننگوں کے کلب کا حصہ تھا۔ پھر ہمیں لے جانے والے ایجنٹ کی خواہش بھی تو تھی۔ کہ ہم بھی نیچر کی قربت حاصل کرنے کے لئے۔ ساحل سمندر پر ننگے پھریں۔ خود ہی مچھلیاں پکڑیں۔ ان سے پیٹ بھریں۔ رات ہونے پر غاروں میں جا کر سو جائیں۔ اس طرح فطرت سے زیادہ سے زیادہ قریب ہو جائیں۔ جیسے قدیم انسان ہوا کرتا تھا۔ یہ کوئی ٹور تو نہ تھا۔ بس انسانوں کو سیر سپاٹے کے نام پر ٹھگنے کا ذریعہ تھا......لو ......اب ہمارے پیارے منحوس شہر برمنگھم کے آثار تو شروع ہو گئے۔ اترنے کی تیاری کرو۔''

ٹرین سے باہر بڑی بڑی عمارتیں زناٹے سے گزر رہی تھیں۔ واقعی برمنگھم شروع ہو چکا تھا۔ ان سیاح لڑکوں نے اپنا اپنا سامان اٹھالیا' اور ایک قطار میں دروازے کی طرف چلنے لگے۔ ایک قدرے بلند آواز میں بولا۔

''الوداع میری چھٹیوں الوداع میری تفریح۔ کتنی جلدی گزر گئے تم۔ اب ایک سال کے لئے الوداع۔!''

تھوڑی دیر بعد گاڑی برمنگھم کے اسٹیشن پر کھڑی تھی اور نوجوان سیاح ایک دوسرے سے بے نیاز ایک دوسرے کے پیچھے ایک قطار میں دروازے کی طرف جا رہے تھے۔ مجھے ان پر ترس سا آنے لگا۔ یہ غریب سارا سال محنت مزدوری کر کے کماتے رہے اور پھر اپنی کمائی میں سے کچھ پس انداز کرتے رہے تاکہ سال بعد چند دنوں کے لئے اپنی جامد و ساکت۔ بور اور سخت زندگی سے نجات حاصل کریں اور کسی دور دراز علاقے میں سیاحت کر کے کچھ تفریح حاصل کر سکیں اور چند خوشگوار لمحات حاصل کر لیں۔ اسی حرص اور آس میں کسی چرب زبان اور عیار ٹور ایجنٹ کے ہتھے چڑھ گئے اور نہ صرف اپنی رقم گنوا بیٹھے بلکہ چھٹیاں بھی غارت گئیں۔ تفریح بھی نہ ملی۔

یہ سیر و تفریح کا حصول ان نوجوان سیاحوں کا ہی مسئلہ نہ تھا بلکہ یورپ و امریکہ میں بسنے

والے قریباً ہر شخص کا مسئلہ ہے۔ دراصل یورپ اور امریکہ میں زندگی اس قدر سخت‘ بور اور یکسانیت سے بھری ہوئی ہے کہ بعض اوقات تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہاں انسان نہیں بلکہ روبوٹ یعنی جذبات اور احساسات سے عاری مشینی انسان کام کرتے ہیں۔ خصوصاً فیکٹریوں‘ ملوں اور کارخانوں میں کام کرنے والے تو اس یکسانیت کا حد سے زیادہ شکار ہیں۔ ان کے کام کے اوقات صبح آٹھ بجے سے شام پانچ بجے تک ہوتے ہیں۔ درمیان میں فقط ایک گھنٹہ کا وقفہ ہوتا جس میں وہ کچھ ستا بھی لیتے ہیں۔ ہر روز وہ صبح ہی صبح کام پر جانے کیلئے نکلتے ہیں اور نکلتے وقت تمام احساسات گھر پر ہی چھوڑ جاتے ہیں کیونکہ کام پر پہنچنے کے بعد کام کی زیادتی کے سبب انہیں کسی بھی بات کا ہوش نہیں رہتا۔ دراصل ان کا ایک ٹارگٹ مقرر ہوتا ہے جو انہیں ہر حال میں پورا کرنا ہوتا ہے۔ اور یہ ٹارگٹ کچھ آسان بھی نہیں ہوتا۔ پھر کام بھی سخت نگرانی میں ہوتا ہے۔ اس لئے کوئی بھی ورکر کام چوری یا گپ شپ کے متعلق سوچ نہیں سکتا۔ اسے جان توڑ محنت سے کام کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ ٹارگٹ پورا نہ ہونے کی صورت میں تنخواہ میں سے پیسے کٹ بھی سکتے ہیں۔ ٹارگٹ سے زیادہ کام کرنے کی صورت میں انعام بھی ملتا ہے۔ اوور ٹائم کی صورت میں کچھ رقم زائد بھی ملتی ہے۔ چنانچہ ٹارگٹ پورا کرنے کے بعد مزید رقم کے حصول کی جدوجہد جاری رہتی ہے۔ اس لئے شام ہوتے ہوتے وہ تھک کر چور ہو جاتا ہے۔ بعضوں کو تو بات کرنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس میں مرد و عورت کی تخصیص نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ ”بہتر زندگی“ کے حصول کی خاطر میاں بیوی اور بچے سب ہی کام کرتے ہیں اور کماتے ہیں۔ مجھے ایسے گھرانے بھی دیکھنے نصیب ہوئے جن کا ہر فرد مختلف شفٹوں میں کام کرتا تھا اور سوائے ہفتہ وار چھٹی جسے ویک اینڈ کہتے ہیں یعنی ہفتہ اتوار کی چھٹی کے ان کی ایک دوسرے سے ملاقات بھی ممکن نہیں ہوتی۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ جب میاں گھر آتا تو بیوی کام پر گئی ہوتی تھی اور بیوی کی واپسی پر میاں کام پر گیا ہوتا۔ آپس میں رابطے کا ذریعہ وہ کاغذ کی چٹھیاں ہوتیں جن پر پیغام لکھ کر مقناطیس کے ذریعے ریفریجریٹر پر چپکا دیا جاتا۔ ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزارنا ایک بہت بڑی عیاشی سے کم نہ ہوتا تھا۔ اسی لئے تو کہا جاتا ہے کہ مغرب یعنی یورپ اور امریکہ میں زندگی آسان نہیں۔

اس جان توڑ مسلسل محنت کے بعد ان غریبوں کے لئے تفریح کے چند لمحات بھی خاصی اہمیت اختیار کر جاتے ہیں۔ چنانچہ ہر ورکر چاہے مرد ہو یا عورت‘ تفریح کے مواقع ڈھونڈتا ہے۔ انہیں پانچ دن کے کام کے بعد دو دن کی چھٹی ملتی ہے اس میں سے ایک دن سودا سلف کی خریداری

اور دوسرے کاموں کے لئے وقف ہوتا ہے۔ اگلا دن مکمل آرام یا تفریح کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔ اس دن ہر انگریز یا تو مکمل طور پر آرام کرتا ہے یا تفریحی مقامات یعنی لب سمندر یا پارکوں وغیرہ میں نکل جاتا ہے تاکہ کام کو بھول کر تھوڑی سیر تفریح یا خوشی حاصل کر سکے۔

اسی ہفتہ وار چھٹی کے علاوہ انہیں سال میں دس یا پندرہ چھٹیاں ملتی ہیں اور یہ چھٹیاں ہی ان کے لئے تفریح اور خوشی کے حصول کا سب سے بڑا موقع فراہم کرتی ہیں۔ ہر شخص ان کی فکر میں رہتا ہے اور چھٹی ملنے سے دو چار ماہ قبل ہی پروگرام بنانا شروع کر دیتا ہے کہ وہ یہ چھٹیاں کس طرح اور کس جگہ گزارے گا۔ چنانچہ چھٹیوں سے قبل ان غریبوں کے پاس ایک ہی موضوع ہوتا ہے۔ جہاں بھی دو چار ور کر مل کر بیٹھتے ہیں یہ موضوع شروع ہو جاتا ہے کہ ''اس دفعہ چھٹیاں گزارنے کون کہاں جا رہا ہے۔؟'' تفریح کے اس حصول کے لئے ہر شخص تھوڑی تھوڑی بچت کر کے سال بھر میں ایک معقول سی رقم جمع کر لیتا ہے۔ جس کے بل بوتے پر چھٹیاں گزاری جاسکتی ہیں۔ اب یہ ہر شخص کے بجٹ پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ کہاں جاسکتا ہے؟۔ چنانچہ لوگ باگ اس بچت کے بل بوتے پر لمبے لمبے پروگرام بناتے ہیں۔ کوئی آسٹریلیا جاتا ہے تو کوئی نیوزی لینڈ کا سفر کرتا ہے۔ کوئی جنوبی افریقہ کے کسی ملک کا رخ کرتا ہے تو کسی کو کوئی اور افریقی ملک پسند آتا ہے۔ وہاں پہنچ کر وہ اپنے ملک۔ گھربار اور خصوصاً کام کاج کو بھول کر مکمل طور پر تفریح کرتے ہیں۔ ویسے یہ اور بات ہے کہ تفریح کے ان لمحات کے بعد واپسی اور پھر کام پر جانے کا پہلا دن خاصے اذیت ناک ہوتے ہیں جیسے کسی قیدی کو چند دن کی رہائی کے بعد دوبارہ جیل کی کال کوٹھری میں بھیج دیا جائے۔

ان تھکے ماندے لوگوں کو تفریح کے مواقع فراہم کرنا یورپ اور امریکہ میں بہت بڑا کاروبار بن چکا ہے بلکہ مبالغہ نہ ہوگا اگر کہا جائے کہ یہ سب سے بڑا کاروبار ہے۔ روایت ہے کہ یہ کام سب سے پہلے۔ تھامس کک نامی شخص نے شروع کیا تھا۔ اس کام سے قبل یہ شخص بحری جہازوں کے ٹکٹ بیچا کرتا تھا۔ اس نے سب سے پہلے برطانوی ریلوے سے بات کر کے اپنے گاہکوں کے لئے رعائتی ٹکٹوں کا انتظام کیا۔ پھر یورپ کے چند شہروں میں ہوٹلوں سے رابطہ قائم کر کے گاہکوں کے ٹھہرنے کا بندوبست کیا۔ اس کے بعد ان ہوٹلوں میں کھانے پینے کے ساتھ رقص و موسیقی کا اہتمام کیا۔ اس کے ساتھ ہی ان شہروں کی قابل دید جگہوں کو دکھانے کیلئے ٹیکسیوں کا بندوبست بھی کیا۔ اس کے یہ پروگرام اتنے مقبول ہوئے کہ اس نے ان کا دائرہ دوسرے ممالک ہی نہیں بلکہ دوسرے براعظموں تک بڑھا دیا۔ اس سلسلے میں اس نے پیکج ٹور (سب کچھ شامل) کا

سسٹم رائج کیا۔ جس میں گاہک کو اس کے گھر سے لینا۔ ٹیکسی' ٹرین یا ہوائی جہاز یا بحری جہاز جیسا بھی سفر ہو۔ کا کرایہ۔ ہوٹل میں قیام کے اخراجات' کھانے پینے کے اخراجات' سیر و تفریح کے اخراجات سب ہی کچھ شامل ہوتا تھا۔ کک کو اتنی کامیابی نصیب ہوئی کہ دوسرے لوگ بھی اس راہ پر چل پڑے۔ یہ لوگ ٹور ایجنٹ۔ ٹور آپریٹر یا ٹریول ایجنٹ کہلائے۔ آج یورپ و امریکہ میں یہ عالم ہے کہ کم و بیش ہر دوسری دکان میں کسی نہ کسی ٹور آپریٹر کا آفس ہے۔ جس میں خوبصورت لڑکے لڑکیاں چست وردیاں زیب تن کئے چاک و چوبند ملتے ہیں۔ اور گاہک کی مرضی کے مطابق دنیا کے قریباً تمام ملکوں کے ٹور کا انتظام کرتے ہیں۔ ان کمپنیوں کے درمیان سخت مقابلہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اخبارات ان کے اشتہارات سے بھرے ہوتے ہیں جن میں زیادہ سے زیادہ تفریح کم سے کم داموں میں پہنچانے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ انتہائی چرب زبانی استعمال کی جاتی ہے لیکن حال یہ ہے کہ ایک دفعہ گاہک پھنس جائے تو پھر وہ جانے اور اس کا خدا جانے۔

یہ غریب چھ طالب علم نما مزدور نوجوان بھی ان ہی حالات کا شکار ہوئے تھے۔ ان غریبوں نے سال بھر محنت کر کے دو ہزار پونڈ فی کس بچائے۔ اس کے بعد ایک چرب زبان ٹور ایجنٹ کے ہتھے چڑھ گئے جس نے انہیں یونان کی سیر کا مشورہ دیا۔ یونان کے سمندری ساحل سیاحوں میں خاصے مقبول ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں ننگوں کے بے شمار کلب موجود ہیں جہاں کسی قسم کا کپڑا پہننا ممنوع ہے۔ ٹور آپریٹر نے انہیں یہ بھی لالچ دیا تھا کہ یونان پہنچ کر وہ اس سرزمین کو دیکھیں گے جہاں جمہوریت نے جنم لیا تھا۔ اس سلسلہ میں کچھ بڑے بڑے نام بھی لئے۔ جن سے یہ نیم خواندہ مزدور بہت مرعوب ہوئے۔ اس کے علاوہ انہیں یہ بھی بتایا گیا کہ اس ساحل پر یونانی حسن کی دیوی برہنہ حالت میں سمندر سے برآمد ہوئی تھی۔ اور اس کے آنے سے ہی دنیا میں حسن پھیلا تھا۔ اس نے کچھ ایسا نقشہ کھینچا کہ گویا ''ایفروڈیٹ'' نامی یونانی ملکہ حسن آج بھی ان کے انتظار میں ساحل سمندر پر کھڑی ہے۔

یہ بھولے بھالے سیاح جب یونان پہنچے تو خاصے مایوس ہوئے۔ یورپ کے عام ساحل کی طرح یونان کا ساحل بھی عام سا نکلا۔ ہاں البتہ چند غار ضرور موجود تھے جن کے متعلق دعویٰ تھا کہ دنیا میں آنے والے ابتدائی انسان ان میں بسیرہ کرتے رہے۔ ٹور آپریٹر نے ان میں چند چارپائیاں سی ڈال رکھی تھیں جو انہیں سونے کے لئے دے دیں۔ انہیں کہا گیا کہ ابتدائی انسان کی طرح حقیقی قدرتی زندگی کا لطف اٹھائیں۔ جو برہنہ رہتا تھا۔ سمندر سے مچھلیاں پکڑ کر اپنی غذائی

ضروریات پورا کرتا تھا۔اب ظاہر ہے کہ ماڈرن سہولتوں میں رہنے والے کسی بھی شخص کو ایسی زندگی کیسے پسند آ سکتی تھی۔ دو چار دن تو ٹھیک گزر گئے۔اس کے بعد کے دن خاصے مشکل گزرے اور خدا خدا کر کے ختم ہوئے سیر وتفریح کی بجائے کوفت اٹھا کے یہ ماڈرن سیاح واپس ہوئے اور آج اپنے آپ کو کوس رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد برمنگھم کا اسٹیشن آ گیا۔سیاحوں نے اپنا اپنا سامان اٹھایا اور دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ٹرین رکنے کے بعد......ایک قطار میں نیچے اترے اور خاموشی سے سر جھکائے اسی قطار میں گیٹ کی طرف بڑھ گئے۔شاید آنے والے کل سے خوفزدہ تھے۔

ڈبے میں خاصا سکون سا ہو گیا۔ویسے بھی مسافر کم تھے۔معاً مجھے خیال آیا کہ برمنگھم اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر سامنے وہی بینچ پڑا ہے جہاں دو اسکاٹ ایک دوسرے کو ٹھونگیں مار مار کر لڑ رہے تھے۔اب اس بینچ پر ایک خاتون بیٹھی ہوئی تھی۔اس کی گود میں ایک بچہ تھا اور دوسرا بچہ بینچ پر لیٹا ہوا تھا۔اردگرد خاصے لوگ پھر رہے تھے کیونکہ چائے کا اسٹال بھی سامنے ہی تھا۔

آج سے پونے پانچ دن پہلے میں لندن جا رہا تھا تو ٹرین اسی مقام پر رکی تھی۔اور اس میں سمینتھا مع اپنی سہیلیوں کے داخل ہوئی تھی یہیں میری اس کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔اور اب میں لندن سے واپس بھی جا رہا ہوں۔یہ پانچ دن کس قدر جلدی گزر گئے گویا ابھی ابھی کی بات ہے کہ میں لندن جا رہا تھا اور اب میں لندن سے جا رہا ہوں۔واہ ری قسمت اور یہ سمینتھا تو یاد آنے کا کوئی موقع جانے ہی نہیں دیتی۔

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ ایک دم ڈبے میں رونق سی آ گئی اور دو جوان جوڑے اندر داخل ہوئے۔اپنے اپنے بریف کیس اُٹھائے......ایک نوجوان جو شکل وصورت اور رنگ سے پاکستانی دکھائی دیتا تھا۔آیا۔اس کے پیچھے پیچھے چست جین اور کھلی قمیض پہنے ایک لڑکی آئی۔جس کا لمبا قد۔لچکیلا جسم۔سانولا رنگ۔بڑی بڑی روشن بادامی آنکھیں۔کولہے تک پہنچتے لمبے لمبے بالوں کی دو چوٹیاں اور ماتھے پر لگی چمکتی دمکتی بندیا ظاہر کر رہی تھی کہ وہ ہندو ہے۔لڑکی کی گود میں چھ آٹھ ماہ کی گول مٹول۔گدگدی سی، بڑی بے چین روح والی بچی تھی جو ہمک ہمک کر ماں کی گود سے نکلی پڑ رہی تھی۔نوجوان نے اندر داخل ہونے کے بعد دائیں طرف کا رخ کیا اور میرے قریب آ کے بریف کیس رکھ کر سیٹ پر بیٹھ گیا۔لڑکی سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ان دونوں کے عقب میں ایک اور لڑکی نمودار ہوئی جس نے ریشمی شلوار قمیض پہن رکھی تھی اور سر پر دوپٹہ اوڑھ کر بڑے

اہتمام سے اس کی بکل مار رکھی تھی۔لڑکی بہت خوبصورت تھی اور وضع قطع سے پاکستان کے کسی دیہات کی رہنے والی معلوم ہوتی تھی۔اس کے پیچھے پیچھے ایک گورا نوجوان داخل ہوا۔جس نے نیلا سوٹ پہن رکھا تھا۔ان دونوں نے ہمارے مخالف سمت والی بنچوں کا انتخاب کیا۔لڑکی آگے بڑھ کر کھڑکی کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی گورے نوجوان نے ایک انتہائی قابل اعتراض حرکت کی اور تقریباً لڑکی کی گود میں بیٹھنے کی کوشش کی لیکن لڑکی نے سمٹ کر اسے دونوں ہاتھوں سے دھکیل دیا اور غصہ سے بولی۔ "Behave yourself" یعنی تمیز سے رہو۔لڑکا کھسیانہ سا ہو کر اس کے بالمقابل سیٹ پر بیٹھ گیا۔کچھ ہی دیر بعد اٹھا اور لڑکی سے قریب قریب جڑ کر بیٹھ گیا۔لڑکی نے اسے قہر آلود نظروں سے دیکھا لیکن اس پر اثر نہ ہوا۔اس پر لڑکی نے چلاّ کر اردو میں کہا۔

''بھائی جان اسے سنبھالئے۔!''

میرے قریب بیٹھا ہوا نوجوان چونک کر اٹھا لیکن سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔لڑکے نے وہیں سے چلاّ کر کہا۔'' ہگ......تمیز سے رہو......تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم عائشہ کے ساتھ ٹرین میں کوئی حرکت نہیں کرو گے۔!''......ہگ فوراً ہی لڑکی سے الگ ہو گیا پھر کھسیانہ سا ہو کر بولا۔ "But Aysha is my wife" ''لیکن عائشہ تو میری بیوی ہے''۔پاکستانی لڑکے کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔اس نے کہا۔

''مجھے معلوم ہے عائشہ تمہاری بیوی ہے لیکن تمہیں بھی معلوم ہونا چاہئے کہ تم ایک ٹرین میں بیٹھے ہوئے ہو جہاں کچھ اور لوگ بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔تمہیں لوگوں کے سامنے ایسی حرکتیں کرتے ہوئے شرم آنی چاہئے۔''نوجوان ابھی کچھ اور بھی کہنے والا تھا کہ سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی بٹھا دیا اور بولی۔

''اب بس بھی کرو۔لوگ تمہیں بھی دیکھ رہے ہیں۔ہگ اور تم دونوں ہی لوگوں کو تماشا دکھا رہے ہو۔!''......لوگ واقعی حیران ہو کر یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔

میرے لئے یہ واقعہ حیرانگی سے کچھ زیادہ ہی تھا۔میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ رنگ برنگے لوگ کون ہیں اور یہ معاملہ کیا ہے؟ یہ مسئلہ تھوڑی دیر میں حل ہو گیا جب سامنے بیٹھی ہندو لڑکی نے میری طرف دیکھا اور پھر آنکھ کے اشارے سے نوجوان کو میری طرف متوجہ کیا۔برطانیہ میں رنگ بہت اہمیت رکھتا ہے۔اور ایک ملک کے رہنے والے ایک دوسرے کو بڑے اہتمام اور چاؤ سے ملتے ہیں چاہے قطعی اجنبی ہوں۔نوجوان میری طرف متوجہ ہوا تو اس کے چہرے پر ایک گھمبیر

مسکراہٹ پھیل گئی۔

''بشیر احمد فرام پاکستان'' نوجوان نے پنجابی لہجے میں اپنا تعارف کرایا۔ پھر سامنے بیٹھی لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ میری بیوی شکنتلا ہے۔ میں اسے شکن کہتا ہوں اور یہ میری ننھی منی ٹمی ہے۔ اس کا نام بس ٹمی ہی ہے۔''

میں نے اٹھ کے بڑی گرم جوشی سے نوجوان سے ہاتھ ملایا۔ لڑکی بھی مسکرا مسکرا کر سر ہلاتی رہی اور خوشی کا اظہار کرتی رہی۔ ایک ہندو لڑکی اور مسلمان لڑکے کو میاں بیوی کی حیثیت میں دیکھ کر میری حیرانی اور دلچسپی اور بڑھ گئی کہ یہ کیسے ممکن ہوا کیونکہ اسلام تو غیر کتابی مذاہب کے لوگوں سے شادی کی اس وقت تک اجازت ہی نہیں دیتا جب تک وہ اسلام نہ قبول کرلیں۔

میں ابھی حیران ہو ہی رہا تھا کہ دائیں طرف کی سیٹوں سے پھر شور سا اٹھا۔ غالباً گورے لڑکے نے پھر کچھ بدتمیزی کی جسارت کی تھی اور لڑکی نے پھر بھائی جان کو مدد کے لئے پکارا تھا۔

جب معاملہ ذرا ٹھنڈا ہوا تو میں نے نوجوان سے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ ''تعجب ہے کہ یہ گورا نوجوان آپ کی موجودگی میں آپ کی بہن کو تنگ کر رہا ہے۔ آپ اپنی بہن کی مدد کیوں نہیں کرتے؟''

نوجوان قدرے بے بسی اور اداسی سے کہنے لگا۔

''کیا کروں۔ یہ دونوں میاں بیوی ہیں۔ کچھ ہی عرصہ پہلے ان کی شادی ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ میں ان کے معاملے میں ایک حد سے زیادہ دخل نہیں دے سکتا۔''

معاملہ پھر میری سمجھ سے باہر ہو گیا۔ مسلمان لڑکا اور ہندو لڑکی۔ گورا لڑکا اور پاکستانی مسلمان لڑکی یہ سب بے تال میل شادیاں۔ یہ سب کیسے ہو گیا۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

لڑکا کچھ دیر تک مجھے دیکھتا رہا جیسے میری ذہنی کیفیت کا اندازہ کر رہا ہو۔ پھر سیٹ پر بیٹھ کر بولا۔

''آپ غالباً پاکستانی بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ اسی لئے اتنے جذباتی اور حیران ہو رہے ہیں۔''

''جی ہاں۔ الحمد للہ میں پاکستانی بھی ہوں اور مسلمان بھی''

اتنے میں گاڑی کو ہلکا سا جھٹکا لگا اور وہ رینگنے لگی۔ اسٹیشن آہستہ آہستہ پیچھے کی طرف کھسکنے

لگا۔ میں نے باہر نگاہ ڈالی۔ وہ بینچ جس پر میں نے دو اسکاٹ لڑتے دیکھے تھے۔ اب خالی پڑی تھی اور پیچھے کی طرف کھسک رہی تھی۔

ہندو لڑکی نے بچی لڑکے کو پکڑا دی اور خود اپنے سامان کو ٹھکانے سے رکھنے میں مشغول ہو گئی۔ بچی بہت پیاری۔ خوبصورت اور ضرورت سے زیادہ چنچل تھی۔ اس کے سفید سفید سے ماتھے پر لگی چھوٹی سی بندیا بہت پیاری لگ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر باپ کی گود میں سے ہمک ہمک کر میری گود میں آنے کے لئے جدوجہد کرنے لگی۔ یہ دیکھ کر میں نے بھی اس کی طرف باہیں پھیلا دیں۔

اس کا باپ ہنس پڑا۔ ''یہ آپ سے زیادہ آپ کے چشمہ اور کوٹ کی جیب میں رنگین پین میں دلچسپی لے رہی ہے۔ بہت شریر ہے ایک دم جھپٹا مارتی ہے اور چشمہ نوچ کر لے جاتی ہے محتاط رہیۓ گا۔''

میں نے بچی کو گود میں لیا ہی تھا کہ وہ زور سے اچھلی۔ میرے چشمے پر ہاتھ مارا جو نیچے جا گرا۔ میں نے جیب سے پین نکال کر اسے دے دیا اور کھسیانہ سا ہو کر چشمہ اٹھایا۔ بچی کے پیٹ میں ہلکی سی گدگدی کی تو وہ ہنسی کے مارے دوہری ہو گئی اس کی ماں بھی اپنی بچی کو ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوتے دیکھ کر خود بھی زور سے ہنسی اور بولی......

''یہ ناٹی ناٹی (شریر) لڑکی۔ انکل کی گود میں جاکے لافیاں لافیاں کرتی ہے۔!''

میں تو خیر الفاظ کے اس عجیب وغریب آمیزے کا مطلب سمجھ گیا اور سچی بات ہے کہ ایسی عجیب وغریب اردو سن کے لطف بھی بہت آیا۔ لیکن وہ لڑکا ہنسنے لگا۔

''دیکھیں جی جہاں دو مختلف تہذیبیں ٹکرائیں گی بلکہ ایک دوسرے میں جذب ہونے کی کوشش کریں گی وہاں ایسی ہی زبان اور تہذیب جنم لے گی جو دونوں کے بیچوں بیچ ہو گی اور خاصی مضحکہ خیز ہو گی۔ اب مجھے دیکھیۓ میں پاکستان کے صوبے پنجاب کے ضلع سرگودھا کا رہنے والا ہوں۔ پنجابی میری مادری زبان ہے۔ اردو میری قومی زبان ہے۔ دس سال پہلے جب برطانیہ آیا تھا تو میری انگریزی کی استعداد ایک عام میٹرک پاس لڑکے جتنی تھی۔ جو کچھ انگریزی سیکھی وہ یہاں سیکھی ...... میری بیوی شکنتلا یو پی، ہندوستان میں پیدا ہوئی۔ جب یہ محض چار پانچ سال کی تھی تو اس کے والدین ہندوستان چھوڑ کر برطانیہ چلے آئے۔ یہاں وہ گلاسکو کے ایک نواحی قصبہ میں رہتے ہیں۔ اس کی پرورش ٹھیٹھ اسکاٹش ماحول میں ہوئی جب یہ اسکاٹش لہجے میں انگریزی بولتی ہے تو خود اسکاٹ کو بھی یقین نہیں آتا کہ اتنی عمدہ انگریزی اسکاٹش لہجے میں کوئی غیر انگریز لڑکی بول

رہی ہے۔ دوسری طرف اس کے ماتا پتا اور بڑے بہن بھائی گھر میں ہمیشہ ہی آپس میں نستعلیق قسم کی اردو بولتے رہے ہیں۔ اس لئے یہ اردو بھی اچھی طرح جانتی ہے۔ اس لئے جہاں اسے ایک زبان کا لفظ میسر نہیں آتا یہ فٹ دوسری زبان کا متبادل استعمال کر کے مطلب واضح کر دیتی ہے۔ اس طرح کبھی کبھی بڑی مضحکہ خیز صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک کا مظاہرہ تو آپ دیکھ ہی چکے ہیں۔ اب آپ خود دیکھ لیں کہ برطانیہ میں تارکین وطن کے مستقبل کی زبان یہی ہو گی بشرطیکہ وہ دونوں زبانوں یعنی مادری اور انگریزی سے چمٹے رہنے کی کوشش کریں۔ تہذیبی اعتبار سے بھی وہ نہ انگریز ہوں گے نہ پاکستانی یا ہندوستانی۔ اس کے بیچ بیچ کچھ ہونگے۔ جسے شاید دونوں قومیں یعنی انگریز اور پاکستانی ہندوستانی قبول نہ کریں۔ لیکن یہ "آدھا تیتر آدھا بٹیر" نسل ایسے ہی کام چلائے گی۔"

لڑکے کی اس تقریر نے یکایک فضا سے اجنبیت دور کر دی۔ میں نے پوچھا......

"آپ کی یہ بات تو بالکل صحیح ہے کہ دو مختلف تہذیبوں کے ٹکراؤ سے ہمیشہ تیسری ملی جلی تہذیب جنم لیتی ہے لیکن یہ ہندو مسلم اور مسلم کرسچین شادیاں...... یہ کس تہذیب کا حصہ ہیں۔ آپ تو غالباً مسلمان ہیں کیونکہ آپ کا نام بشیر احمد ہے۔ آپ کی بیوی شکنتلا ہندو۔ سامنے آپ کی بہن عائشہ مسلمان اور اسکا خاوند بگ کرسچین۔ یہ سب آخر کیسے ممکن ہوا۔؟

لڑکا بہت سنجیدگی سے بولا۔

"سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ بشیر احمد ہونے کے باوجود نہ تو میں مسلمان ہوں نہ ہی میری بہن عائشہ مسلمان ہے۔ یہ شکنتلا ہندو ہے نہ بگ کرسچین۔ ہم سب بہائی ہیں اور بین الاقوامی بہائی برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ پیغمبر بہاء اللہ کے ماننے والے اور یہ سب کچھ جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ ان کے احکامات پر عمل کا نتیجہ ہیں"۔

اس پر میرے کان کھڑے ہوئے۔ بہائی مت کا نام ضرور سنا تھا لیکن اس کے متعلق معلومات صرف سطحی تھیں۔ میں اس کے معاملات۔ تعلیمات کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا۔ البتہ یہ سن کے ہلکا سا دکھ ضرور ہوا کہ جس کو مسلمان سمجھتا رہا وہ غیر مسلم نکلا لیکن اس دکھ پر تجسس غالب آیا کہ معلوم کیا جائے کہ بہائی ہوتے کیا چیز ہیں۔؟

اتنے میں گاڑی چل پڑی۔ عائشہ اور بگ خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ بشیر اور شکنتلا آمنے سامنے بیٹھ کر کچھ باتیں کرنے' کچھ کام کاج کرنے اور چنچل روح ٹمی کو سنبھالنے میں مشغول ہو

گئے ۔جب کچھ تھما تھمی ہوئی تو میں نے بشیر احمد سے پوچھا۔

''یہ تمام نام ۔یعنی بشیر احمد' عائشہ' شکنتلا اور رگ تو مختلف مذاہب سے وابستگی ظاہر کرتے ہیں ۔ان سے تو بہائی ہونا ظاہر نہیں ہوتا۔کیا بہائی ہو جانے پر کوئی نیا نام نہیں رکھا جاتا۔''

بشیر بولا۔''نہیں بہائیوں میں ایسا کوئی رواج نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بہائی ایک جدید اور ماڈرن مذہب ہے اور اس کے ماننے والے ساری دنیا میں موجود ہیں ۔اگر ان لوگوں کے نام ایرانی ناموں پر رکھے جائیں تو یہ نام ان کے اپنے ملک اور معاشرے میں اجنبی ہونگے اور اس کی وجہ سے وہ اپنے معاشرے سے کٹ کر رہ جائینگے۔ جب کہ بہائی مذہب اپنے ماننے والوں کو اپنے ملک اور معاشرہ کا زیادہ سے زیادہ وفادار رہنے کی تاکید کرتا ہے۔ بہائی مت انسانیت کی خدمت اور عالمی بھائی چارہ پر بہت زور دیتا ہے۔انسانی ناموں کا قائل نہیں ۔اس میں داخل ہونے والے اپنا پرانا نام برقرار رکھ سکتے ہیں ۔اس لئے کوئی بھی بہائی نام سے نہیں پہچانا جاسکتا۔''

''اچھا یہ بتائیں'' میں نے پوچھا۔''آپ پیدائشی بہائی ہیں یا بعد میں بہائیت اختیار کی۔''

بشیر احمد کہنے لگا۔''نہیں جی۔ہم تو شروع میں مسلمان تھے اور پکے مسلمان۔''

''پھر بہائی کیسے ہوگئے۔'' میں نے پوچھا۔

بشیر احمد نے کہا۔'' دراصل ہم لوگ پاکستان کے علاقے سرگودھا کے ایک نواحی گاؤں کے رہنے والے تھے اور وہاں کے چھوٹے موٹے کسان نما زمیندار۔ ہمارا خاندان والدین اور آٹھ بہن بھائیوں پر مشتمل ہے۔ یہ ان پرانے زمانوں کی بات ہے کہ گاؤں تو گاؤں شہروں میں بھی تعلیم عام نہیں ہوئی تھی ۔گاؤں بھر میں بس ایک مولوی صاحب ہوا کرتے تھے جو گاؤں کے بچوں کو فقط ایک ایک دو دو لفظ کر کے قرآن شریف بس پڑھا ہی دیا کرتے تھے ۔اور کبھی کبھار اگر ضرورت پڑ جاتی تو کچھ مسئلے مسائل بھی سمجھا دیا کرتے تھے ۔باقاعدہ دینی تعلیم کا کوئی تصور تک نہ تھا ۔قرآن کریم ہمارے لئے مقدس کتاب تو تھی لیکن قطعی بے معنی کیونکہ اس کے معنی تو دور رہے کبھی کسی نے ان کا ترجمہ بھی بتانے کی کوشش نہ کی مزید بدقسمتی کہ اس زمانے میں ایک مختلف مسلک کے مولوی صاحب گاؤں میں آ کر آباد ہو گئے اور انہوں نے اپنی علیحدہ مسجد بنا کر اپنے مسلک کی تبلیغ شروع کر دی چونکہ دونوں مسالک علیحدہ علیحدہ بلکہ ایک دوسرے کے مخالف تھے اس لئے دونوں مولویوں نے ایک دوسرے کے خلاف باقاعدہ محاذ بنا لیا اور ان میں اچھی خاصی ٹھن گئی

نوبت یہاں تک پہنچی کہ دونوں نے اپنی اپنی مسجد کے منبر پر چڑھ کر ایک دوسرے کو کافر کہنا شروع کر دیا۔ غریب اور جاہل عوام حیران ہو ہو کر دونوں کی طرف دیکھتے اور فیصلہ نہ کر پاتے کہ کون حق پر ہے اور کون کافر...... کس کو مانیں اور کس کو نہ مانیں۔ جلد ہی گاؤں میں دو پارٹیاں بن گئیں اور ان میں سیاست شروع ہوگئی۔''

''ان ہی دنوں کچھ عالمی کساد بازاری شروع ہوگئی جس کا اثر ہندوستان پر بھی پڑا اور بڑے پیمانے پر بے روزگاری کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ ہمارا گھرانا بھی اس سے متاثر ہوا۔ پھر کچھ خاندانی جھگڑے بھی پیدا ہوئے جیسا کہ مشترکہ خاندان میں عام طور پر ہوا کرتا ہے۔ جھگڑے اتنے بڑھے کہ آج سے پندرہ سال پہلے میرے والد صاحب کو وطن چھوڑنا پڑا اور وہ برطانیہ آ گئے۔ یہاں آ کر انہوں نے محنت مزدوری شروع کی اور اچھا خاصا کمانے لگے۔ اسی دوران انہیں کچھ بہائی مبلغ مل گئے جس سے متاثر ہو کر وہ بہائی ہو گئے۔ پانچ سال بعد جب وہ گاؤں لوٹے تو وہ ایک بھولے بھالے دیہاتی کی بجائے ایک جہاں دیدہ اور بالکل ہی مختلف انسان تھے۔ جہاں ان کے پاس کافی روپیہ پیسہ تھا وہاں نئے خیالات بھی تھے۔ گاؤں میں جب انہوں نے اعلان کیا کہ وہ بہائی ہو گئے ہیں تو اور تو اور دونوں مولوی صاحبان کی سمجھ میں بھی کچھ نہ آیا کہ یہ کیا ہو گئے ہیں کیونکہ انہوں نے کبھی اس کا نام بھی نہ سنا تھا۔ چنانچہ جہاں مولوی صاحبان نے بہاء اللہ اور بہائی مت کی تعلیمات کے متعلق والد صاحب سے دریافت کیا وہاں گاؤں کے لوگوں نے بھی اس نئے مذہب کے بارے میں اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔ جب والد صاحب نے انہیں بہائی مبلغین کی سکھائی تعلیمات کی روشنی میں بتایا کہ آج سے پونے دو سو سال قبل ایران میں خدا نے اپنا خاص نبی بہاء اللہ بھیجا تھا (نعوذ باللہ)۔ جس نے بتایا تھا کہ ہر پیغمبر یا رسول کی شریعت کی حکمرانی کا زمانہ ایک ہزار سال کا ہوتا ہے اور چونکہ محمدؐ رسول اللہ کو آئے ایک ہزار سال سے زائد ہو چکے تھے اس لئے آسمانی قوانین کے حساب سے نیا پیغمبر آنا ضروری تھا اس لئے خدا نے بہاء اللہ کو نیا نبی بنا کر بھیجا ہے (نعوذ باللہ)۔ جس کے لئے ضروری ہے کہ وہ پچھلی تمام شریعتوں کو منسوخ کر کے نئی شریعت لائے اور اسے نافذ کرے۔ چنانچہ بہاء اللہ نے ایک جلسہ میں اسلامی شریعت کو منسوخ کر دیا اور اعلان کیا کہ نیا نبی وہ ہے اور اگلا ایک ہزار سال کا عرصہ اس کی شریعت کی حکمرانی کا ہے۔ اور یہ کہ جو شخص اس پر ایمان نہ لائے گا اس کا مرتبہ ان کفار مکہ کا سا ہو گا جو رسول اکرمؐ پر ایمان نہ لائے تھے (نعوذ باللہ)۔ ان کی اس بات پر مولوی صاحبان بہت بد کے لیکن عام مسلمانوں میں بہت دہشت پھیلی۔''

''سب سے زیادہ مزے دار اور فائدہ مند بات جو انہوں نے بتائی اور تن آسان مسلمانوں کو بھی سب سے زیادہ پسند آئی وہ یہ کہ بہااللہ نے دن بھر کی پانچ نمازیں منسوخ کر دی ہیں اور ان کی بجائے فقط ایک نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ پھر اس نماز کی بھی تین قسمیں ہیں۔ ایک بڑی۔ ایک درمیانی اور ایک بالکل چھوٹی۔ جو محض چند الفاظ پر مشتمل ہے۔ اور پھر یہ آزادی دی کہ جس کا جو جی چاہے پڑھے۔ وضو صرف ہاتھ اور منہ دھونے تک محدود کر دیا گیا اور وہ بھی فقط بڑی نماز کے لئے...... کسی نماز کے لئے نہ تو کوئی وقت مقرر ہے اور نہ کسی جماعت کی ضرورت۔ اگر آپ کسی میز کرسی پر بیٹھے کام کر رہے ہیں اور آپ کو نماز یاد آ گئی تو فقط دو منٹ کے لئے قلم چھوڑ دیجئے۔ سر جھکا کے مودب ہو کے دل ہی دل میں چار چھ الفاظ پڑھ لیجئے۔ چلئے نماز ہو گئی۔ اس مذہب میں مسجد یا اجتماعی عبادت کا کوئی تصور نہیں اور نہ ہی کسی پیش امام یا رہنما کی ضرورت ہے نا گنجائش' فقط خلوص نیت کی ضرورت ہے۔ ذرا خود سمجھئے کہ نماز میں کتنی سہولت ہو گئی۔ اسلام میں دن بھر میں پانچ نمازیں پڑھنے کا حکم ہے۔ ہر نماز کے لئے علیحدہ وضو کرنا پڑتا ہے۔ پھر ہر نماز وقت مقررہ پر پڑھنی ہوتی ہے۔ چاہے مسجد میں جا کر پڑھیں چاہے گھر پر پڑھیں۔ وقت ضرور خرچ ہوتا ہے۔ کتنی پابندیاں ہیں۔ پھر جاہل مولوی ملا کے بے معنی وعظ اور کفر کے فتوے سننے پڑتے تھے۔ اتنی ڈھیر ساری نمازوں کو پڑھ پڑھ کر لوگ تنگ آ جاتے تھے اور انہیں ٹرخانے کی کوشش کرتے تھے۔ بہااللہ نے نماز کو ان پابندیوں سے آزاد کر کے اسے خالصتاً خدا اور بندے کا معاملہ بنا دیا اور اس میں سے مولوی کے فتنے کو قطعی طور پر نکال دیا۔ خود سوچئے مذہب کتنا آسان بنا دیا گیا''۔

''روزہ رکھنے کا بھی تصور ہے بہائی مذہب میں۔؟'' میں نے بشیر کی بہائی مت کے بارے میں طویل تقریر میں مداخلت کی۔

''جی ہاں۔ بہائی مذہب میں روزے اسی طرح فرض ہیں اور رکھے جاتے ہیں جیسے مسلمانوں میں۔ وہی سحری ہوتی ہے۔ وہی افطار اور وہی عبادات۔ لیکن بہائی روزے مختصر ہیں یعنی کل انیس اور یہ قمری نہیں شمسی ہیں۔ ہر سال دو مارچ سے شروع ہوتے ہیں اور 20 مارچ کو آخری روزہ ہوتا ہے۔ 21 مارچ کو نوروز کی عید منائی جاتی ہے۔'' بشیر احمد نے جواب دیا۔

''یہ انیس روزوں کا کیا چکر ہے؟۔ پورا مہینہ کیوں نہیں۔؟'' میں نے پوچھا۔

''بہائی مذہب بہت ماڈرن ہے۔ اس نے بہت ساری پرانی چیزوں کو رد کر دیا ہے۔ مثلاً پرانا گریگوری کیلنڈر جو 365 دنوں اور بارہ ماہ پر مشتمل ہے۔ جسے آج بھی ساری دنیا میں استعمال

کیا جاتا ہے۔اسے رد کر کے بہائی مذہب نے اپنا نیا کیلنڈر ترتیب دیا ہے۔اس میں 19 مہینے مقرر ہیں اور ہر مہینہ کے 19 دن۔اس طرح سال کے کل 361 دن بنتے ہیں۔شمسی کیلنڈر کے جو چار دن بچتے ہیں انہیں بڑھاوے یا ضیافت کے دن کہتے ہیں۔ان چار دنوں میں بہائی خوب عیش کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی دعوتیں کرتے ہیں۔''

''یہ انیس کا عدد کیوں اتنا اہم ہے کہ دن اور مہینہ کی تعداد بھی ان پر مقرر کی گئی ہے۔''

''بہائی مذہب میں انیس اور نو کے اعداد بہت اہم اور مقدس ہیں۔انیس اس لئے کہ جب علی محمد باب جو بہائی مت کے پیشرو اور بانی تھے نے جب اپنی نبوت کا اعلان کیا تو اسے ایران بھر کے انیس شعیہ علماء نے تسلیم کر لیا اور اس پر ایمان لے آئے۔ان علما کو حیّ یعنی زندہ جاوید کا خطاب دیا گیا۔اور اس عدد کو تقدس دیا گیا......رہا نو کا عدد تو بہااللہ کے ابتدائی جان نثار ساتھیوں کی تعداد نو تھی۔اس لئے آج بھی اس کونسل کے ممبران کی تعداد 9 ہے جو دنیا بھر کے بہائیوں اور ان کے معاملات کو کنٹرول کرتی ہے۔''

''اچھا۔تو پھر گاؤں میں کیا ہوا۔؟''

بشیر بولا......

''اب آپ خود سوچیں۔اتنا آسان اور بے محنت عبادت کا مذہب کسے پسند نہ آتا۔والد صاحب نے جب گاؤں والوں کے سامنے بغیر وضو کئے۔کرسی پر بیٹھے بیٹھے سر جھکا کر آدھے منٹ میں نماز پڑھ ڈالی تو گاؤں والوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔لیکن غضب یہ ہوا کہ دوسرے دن ہی گاؤں کے دونوں مولوی صاحبان اس نئے فتنے کے خلاف متحد ہو گئے اور والد صاحب پر کفر کا فتویٰ داغ دیا۔والد صاحب نے جواب میں کہا کہ جب میں مسلمان ہی نہیں ہوں تو پھر کفر کا فتویٰ کیسا۔یہ فتویٰ بے معنی ہے۔سوچ سوچ کر ایک مولوی صاحب نے رائے دی کہ والد صاحب کو مرتد قرار دیا جائے کیونکہ یہ پہلے مسلمان تھے۔اگر مولوی صاحب کی رائے مان لی جاتی تو لوگوں پر والد صاحب کا قتل واجب ہو جاتا لیکن نہ تو گاؤں میں کوئی اتنا پڑھا لکھا تھا جو اس مسئلہ کو سمجھ سکتا نہ ہی مولوی صاحب نے اس مسئلہ پر زور دینا مناسب سمجھا کہ اس طرح ایک قتل ہو سکتا تھا اور قتل کی واردات اگر ہو جاتی تو پولیس مولوی صاحب کو ہی دھر لیتی اب مولوی صاحب نہ تو اتنے بہادر تھے نہ ہی دین اسلام کے اتنے جان نثار کہ فتویٰ دے کر حوالات جانا اور پھانسی پر چڑھنا پسند کرتے۔انہوں نے بس یہ بہادری دکھائی کہ مسلمانوں کو والد صاحب کے خلاف کر دیا۔والد صاحب

حالات بگڑتے دیکھ کر برطانیہ واپس آ گئے۔ کچھ دنوں بعد والدہ محترمہ کا انتقال ہو گیا تو والد صاحب نے کہلا بھیجا کہ اب تم اکیلے بچوں کا سرگودھا رہنا مناسب نہیں۔ اس لئے برطانیہ آ جاؤ اور اپنے بہائی مت کی تبلیغ میں لگ جاؤ!

اس زمانے میں ولائت کا بڑا چرچا تھا۔ بلکہ ولائت جانے اور اسے دیکھنے کا ارمان ہر دل میں تھا۔ پھر پانچ بھرپور نمازوں کی جگہ ایک اور وہ بھی اتنی آسان نماز والا مذہب بھی بڑی کشش رکھتا تھا۔ چنانچہ ہم لوگوں نے جلدی جلدی زمینیں بیچیں۔ سامان فروخت کیا۔ اپنے طویل ماضی کا سودا کیا۔ اس کے دام کھرے کئے اور پھر سب مل کے برطانیہ آ گئے۔ یہاں گلاسکو کے نواح میں چند بہائی رہتے تھے ان میں والد صاحب کا گھر بھی تھا۔ ان بہائیوں میں دو تین سرکردہ قسم کے ایرانی تھے باقی یورپی یا انگریز۔ فقط والد صاحب اکیلے ہندوستانی تھے۔ یہ ایرانی وہ لوگ تھے جن کی بدولت بہائیت انگلینڈ میں متعارف ہوئی تھی۔

جب ہم آٹھوں بہن بھائی والد صاحب کے گھر میں داخل ہوئے تو ایک یورپین خاتون نے ہمارا استقبال کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ ہماری والدہ صاحبہ تھیں۔ والد صاحب نے لگ بھگ دس سال قبل چیکوسلواکیہ کی ایک خاتون سے شادی کر لی تھی۔ اب اس خاتون سے والد صاحب کے دو چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے جو ہمیں حیران ہو ہو کر دیکھ رہے تھے۔ ہماری سوتیلی والدہ نے ہم سے بہت اچھا سلوک کیا۔ ہماری آمد کے دوسرے دن ہی ایک بہائی مبلغ نے گھر آ کے ہمیں بہائیت کے متعلق لیکچر دینا شروع کر دیا۔ ہم گو مسلمان تھے لیکن ایک تو اسلام کے متعلق ہمارا علم بہت محدود تھا اور جو تھا بھی وہ ہندوؤں کے میل جول سے کمزور ہو گیا تھا۔ اس پر جب ہمیں اسلام سے ملتے جلتے اصول بتلائے جانے لگے تو ہم نے ان پر دھیان دینا شروع کر دیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اسلام اور بہائیت میں فرق محسوس ہونا بند ہو گیا۔ ویسے بھی بہائیت اسلام سے ہی تو نکلی تھی۔ رفتہ رفتہ ہم پکے بہائی ہوتے چلے گئے۔''

''یہ بہائی ہو جانا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن یہ رنگ برنگی اور غیر مذاہب میں شادی کا چکر۔؟ یہ سمجھ میں نہیں آیا۔؟'' میں نے کہا۔

بشیر بولا۔

''بہا اللہ (میں نے بشیر یا کسی بھی بہائی سے اپنے پیغمبر کے لئے کوئی احترامی لفظ یعنی حضرت۔ جناب وغیرہ نہیں سنا۔) نے سب سے زیادہ زور عالمی انسانی بھائی چارے **Global**

**Brother Hood** پر دیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ دنیا میں بسنے والا ہر شخص خدا نے پیدا کیا ہے۔ اس لئے مختلف علاقوں میں پیدا ہونے والے۔مختلف رنگ ونسل کے انسانوں میں کوئی فرق نہیں۔ سب ایک ہیں۔مختلف مذاہب کے ماننے والے بھی سب انسان ہیں اور اللہ کی مخلوق۔اس لئے ان میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں اور یہ جو ہم نے انسانوں کو علیحدہ علیحدہ خانوں میں بانٹ رکھا ہے یہ خدا کی منشا کے سخت خلاف ہے۔علیحدہ علیحدہ خانوں میں بٹ جانے سے آپس میں نفرت پیدا ہوتی ہے اور بڑھتی ہے۔اس کو ختم کرنے کے لئے مختلف رنگ ونسل و مذاہب کے لوگوں کو آپس میں شادیاں کرنی چاہئیں تا کہ آپس کی منافرت ختم ہو۔مسلمان کی ہندو سے۔کرسچین کی یہودی سے۔بدھ کی مسلمان سے شادی کرنی چاہیے۔گوروں' کالوں' سانولوں' زرد رنگت والوں سب کو آپس میں شادیاں کرنی چاہئیں تا کہ اگلی نسل میں منافرت ختم ہو۔میرے والد صاحب نے اس کا عملی مظاہرہ کیا۔ان کے اردگرد کچھ ایسے خاندان بھی تھے جو غیر مذاہب سے بہائی ہو گئے تھے۔ والد صاحب نے ان خاندانوں میں رشتہ ناطہ جوڑنے کی کوشش کی۔نتیجتاً اپنے ہندو بہائی دوست کی بیٹی سے میری شادی کر دی۔چیک نسل کے ایک کرسچین بہائی لڑکے سے اپنی بیٹی بیاہ دی۔ایک بیٹی یہودی بہائی کو۔دوسری بدھ بہائی اور چوتھی ایک عیسائی بہائی کو دے دی۔اس طرح اپنے بیٹوں کے لئے بھی مختلف نسل و مذاہب کی بہوئیں لائے۔غرض ہمارا گھر ایک بین الاقوامی کنبہ بن کر رہ گیا۔"

رنگ برنگی شادیوں کا مسئلہ کچھ کچھ حل ہو گیا تھا۔لیکن یہ جو کچھ بگ کر رہا تھا وہ کیا تھا۔؟ میں نے پہلی بار احتیاط سے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"بہا اللہ کی تعلیمات کا یہ حصہ تو بہت ہی قابل قدر ہے کہ رنگ ونسل کی بنیاد پر انسانوں میں تفریق نہیں ہونی چاہئے اور اس سے تو کوئی اختلاف ہو ہی نہیں سکتا۔خود اسلام کہتا ہے کہ تمام انسان آدم اور حوا کی اولاد ہیں۔کالے کو گورے پر اور گورے کو کالے پر کوئی برتری نہیں سوائے تقویٰ کے اور غالباً یہ نقطہ بہا اللہ نے اسلامی تعلیمات سے ہی حاصل کیا ہے شاید اس لئے کہ وہ بھی تو پہلے شیعہ مسلمان تھے۔لیکن سوال یہ ہے کہ ثقافت یا کلچر بھی تو پنے اندر کچھ وزن رکھتا ہے۔یعنی دنیا کے رہنے والے لوگوں کے رہنے سہنے کے طریقے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ان کی اقدار علیحدہ علیحدہ ہیں۔شرم وحیا غیرت کے معیار الگ الگ ہیں۔ایک کلچر کے عادی کو کسی دوسرے کلچر سے اچھی طرح واقف بلکہ عادی کرائے بغیر اس میں دھکیل دینا ایک ظلم ہی تو ہے۔اور ظاہر ہے کہ

اس کا نتیجہ وہی نکلے گا جس کا مظاہرہ ہگ اور عائشہ کر رہے ہیں۔ ہگ کے چیک معاشرے میں برسرعام اپنی بیوی کی گود میں بیٹھ جانا یا اس کا منہ چوم لینا شاید قابل اعتراض حرکت نہ ہو۔ لیکن کیا اس حرکت کو ہندوستان‘ پاکستان یا کسی بھی اور ملتے جلتے معاشرے میں برداشت کیا جائے گا۔ کم از کم اس چیز کا تو خیال کرلیا ہوتا۔“

بشیر خاموشی سے میری بات سنتا رہا۔ اس کی بیوی بھی غور سے سنتی رہی۔ جب میں بات مکمل کر چکا تو بشیر کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر بولا۔

”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ مذہب کے معاشرتی یا ثقافتی احکامات پر۔ جو چاہے کتنے ہی سنہری کیوں نہ دکھائی دیتے ہوں۔ بغیر سوچے سمجھے اور اندھا دھند عمل کرنے کا نتیجہ یہی نکلے گا۔ یہ صرف ہگ اور عائشہ کا مسئلہ ہی نہیں جن میں ثقافت کی دوری کے باعث ذہنی ہم آہنگی کا دور دور تک پتہ نہیں۔ بلکہ میرے ساتوں بہن بھائیوں کے گھرانے اسی مشکل بلکہ تباہی سے دوچار ہیں۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک کی ثقافت جدا جدا ہے اور ہر ایک اپنی ثقافت پر عمل کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ وہ بچپن سے اس پر عمل کرتا چلا آیا ہے۔ اس سے یقینی ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے۔ یقین جانئے اپنے والد کی اولاد میں سے صرف ایک میں ہی ہوں جو خوش و خرم زندگی گزار رہا ہے۔

وہ بھی محض اس لئے کہ میری اور میری بیوی کی ثقافت میں زیادہ فرق نہیں۔ میری بیوی کی ثقافتی تربیت اس کے گھر پر مسلسل ہوتی رہی ہے اس پر مغربیت کا وہ رنگ نہیں چڑھ سکا جو یورپی لڑکوں اور لڑکیوں میں پایا جاتا ہے۔ لہٰذا وہ بہائی ہو کر بھی ہندوستانی ہے اور میں بہائی ہو کر بھی پاکستانی۔ ثقافت چونکہ ایک ہے اس لئے اچھی طرح گزارا ہو رہا ہے۔ باقی گھرانے تباہی کے دہانے پر ہیں۔ والد صاحب کا تجربہ ناکام رہا ہے۔“

اس دوران عائشہ بھی آ کے ہمارے پاس بیٹھ گئی۔ وہ دیہاتی قسم کی سیدھی سادی۔ بھولی بھالی لیکن بہت ہی خوبصورت لڑکی تھی۔ اپنے شوہر کے رویہ سے شرمندہ شرمندہ سی بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ اگرچہ اسے سرگودھا سے نکلے دس سال ہو رہے تھے اس کے باوجود وہ اردو بڑی روانی سے بول رہی تھی گو اس کے لہجے میں پنجابی کھنک تھی۔

اس کے بعد بہا اللہ اور اس کی تعلیمات پر گھنٹہ بھر تک باتیں ہوتی رہیں۔ بشیر احمد نے مجھے بتایا کہ بہا اللہ کا فرمان ہے کہ ساری دنیا کی ایک ہی زبان ہونی چاہئے تاکہ ہر شخص اپنا مافی الضمیر دوسرے تک براہ راست پہنچا سکے لیکن وہ خود اس بات کا قائل تھا کہ یہ ایک بہت ہی اچھی

خواہش تو ہو سکتی ہے لیکن اس پر عمل ممکن نہیں۔ کیونکہ دنیا بھر میں چھ ہزار سے زیادہ زبانیں بولی جاتی ہیں اور اس سے لگ بھگ چار گنا زیادہ بولیاں۔ اور پھر جہاں ہر ڈھائی کوس کے بعد بولی بدل جاتی ہو یا اس میں فرق پڑ جاتا ہو وہاں پورے کرہ ارض کے لئے ایک ہی زبان کی خواہش کچھ ضرورت سے زیادہ ہی بڑی ہے۔ پھر ہر شخص کو اپنی ثقافت اور زبان سے پیار ہوتا ہے۔ وہ کیسے دوسری زبان کو قبول کرے گا۔

چنانچہ بہا اللہ کو اس دنیا سے رخصت ہوئے ڈیڑھ سو سال کا عرصہ ہو چکا ہے اس کے باوجود بہائی نہ تو کوئی متفقہ زبان تخلیق کر سکے نہ ہی کسی پر متفق ہو سکے۔ زبان کے علاوہ دنیا بھر کی اقوام کے لئے بہا اللہ کا فرمان تھا کہ وہ ایک جگہ اکٹھی ہو کے اور مل بیٹھ کے اپنے مسئلے مسائل حل کیا کریں۔ بشیر احمد کا کہنا تھا کہ بہا اللہ کی اس پیش گوئی اور فرمان کے مطابق اقوام متحدہ کی تشکیل ہوئی ہے۔ اور ان کی ہدایات کے مطابق ''دنیا بین الاقوامیت کی طرف بڑھ رہی ہے اور ایک گاؤں سا بنتی جا رہی ہے جہاں کوئی قوم دوسری قوم سے اسی طرح واقف ہو گی جس طرح ایک گاؤں کے لوگ ایک دوسرے سے واقف ہوتے ہیں۔ یہ سب بہا اللہ کی تعلیمات کا نتیجہ ہے۔''

میں نے جواب دینے سے پہلے کچھ دیر سوچا۔ ٹرین کی رفتار کچھ ہلکی ہو چکی تھی۔ شاید کوئی اسٹیشن آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں ایک دیہاتی اجاڑ سا اسٹیشن سنسناتا ہوا گزر گیا۔ اسٹیشن کے گزرتے ہی ٹرین کی رفتار پھر تیز ہو گئی۔ اسٹیشن کے گزرنے سے جو شور ہوا اس سے ماں کی گود میں سوئی ہوئی ننھی مُنّی گھبرا کر اٹھ گئی اور رونے لگی۔ سب کی توجہ اس کی طرف مبذول ہو گئی۔ اس کی ماں نے اسے تھپک تھپک کر پھر سلا دیا۔ موقع غنیمت دیکھ کر میں نے بشیر کو مخاطب کیا۔

''تاریخ میں سو ڈیڑھ سو سال کا عرصہ بہت مختصر خیال کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے بہا اللہ نے یہ تصور حال ہی میں یعنی لگ بھگ ڈیڑھ سو سال پہلے پیش کیا۔ لیکن اسلام اس خوبصورت تصور کو اس سے کہیں بہتر انداز میں آج سے چودہ پندرہ سو سال پہلے پیش کر چکا۔ کیا مسلمانوں کا حج ایک بین الاقوامی، بین المملکی اجتماع نہیں۔ جہاں دنیا کے کونے کونے سے لاکھوں انسان جمع ہوتے ہیں۔ ان میں ہر قوم۔ ہر رنگ اور ہر نسل کا شخص موجود ہوتا ہے۔ مختلف لباس پہننے اور مختلف زبانیں بولنے والے وہاں ایک ہی لباس اور ایک ہی زبان اختیار کر لیتے ہیں۔ اس عظیم اجتماع کا مقصد مختلف علاقوں کے مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا ہوتا ہے۔ جہاں وہ مل کر بیٹھتے ہیں۔ اپنے اپنے مسائل پیش کرتے ہیں اور دوسرے مسلمان بھائیوں کی مدد سے ان کا حل تلاش کرتے ہیں۔

آپس میں سمجھوتے اور معاہدے اور تجارتی لین دین کے معاہدے بھی کر سکتے ہیں۔ ذرا خیال تو کرو۔ کینیڈا کا رہنے والا گورا۔ نائیجیریا کا سیاہ فام، انڈونیشیا کا گندمی اور جاپان کا زرد انسان سب آپس میں مل بیٹھتے ہیں ایک لباس یعنی دو ان سلی چادروں کا لباس پہنتے ہیں۔ جس سے امارت اور غربت سب برابر ہو جاتی ہے۔ ایک زبان یعنی عربی بولتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر بین الاقوامی یک جہتی اور کیا ہو سکتی ہے۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔" بشیر بولا۔ اس کی بیوی بھی سن رہی تھی۔ بولی۔

"حج۔؟۔ ہم بہائی بھی تو حج کرتے ہیں۔!"

"ہاں۔" بشیر بولا۔ "لیکن ہمارا حج تو بغداد کے ان دو مکانوں کا طواف ہے جہاں علی محمد باب اور بہا اللہ کچھ دنوں کے لئے قید یا نظر بند رہے ہیں۔ لیکن دو مکانوں کا طواف اور خانہ کعبہ کا عظیم طواف جس میں لاکھوں انسان شریک ہوتے ہیں۔ ان دونوں کا آپس میں کیا مقابلہ۔؟ پھر یہ دونوں مکان انسانی رہائش گاہ ہیں اور خانہ کعبہ خدا کا گھر...... یہ دونوں کیسے برابر ہو سکتے ہیں؟"

"ہاں"۔ شکنتلا نے سر ہلایا۔

"اس وقت دنیا میں کل کتنے بہائی ہوں گے۔؟" میں نے پوچھا۔

"بیت رسول کا اندازہ ہے کہ آج کی دنیا میں بیس سے بائیس لاکھ بہائی ہونگے جو کینیڈا سے لے کر آسٹریلیا تک پھیلے ہوئے ہیں۔ دنیا کے ہر ملک میں کچھ نہ کچھ تعداد بہائیوں کی ضرور ہو گی۔ آپ کے ملک پاکستان میں ہی لاکھوں کی تعداد میں بہائی رہتے ہیں۔"

"پاکستان میں لاکھوں بہائی۔؟۔ ہم سے تو کبھی کوئی بہائی نہیں ٹکرایا......!" میں نے جواب دیا۔

"اس کی وجہ ہے کہ بہائیوں کو سختی سے ہدایت کی جاتی ہے۔ کہ جس سلطنت یا حکومت میں رہیں اس کے وفادار رہیں۔ وہاں کے رسم رواج اور کلچر کو اپنائیں۔ وہاں کے رہنے والوں کے لباس پہنیں اور ان ہی کی طرح کے نام رکھیں۔ مقامی بولیاں اور زبانیں بولیں۔ کسی قسم کے مذہبی اختلافات میں حصہ نہ لیں۔ کسی سیاسی پارٹی کا ساتھ نہ دیں۔ بس اپنے مذہب پر قائم رہیں اور مقامی لوگوں میں ہر طرح سے مل جل جائیں۔ بلاوجہ اپنے آپ کو ظاہر نہ کریں۔ بس یہی وجہ ہے کہ کسی بہائی کو پہچان لینا آسان نہیں تاوقتیکہ وہ خود اپنے آپ کو ظاہر نہ کر دے۔ کوئی بہائی کبھی بھی نہ تو مذہب پر آپ سے بحث کرے گا نہ تبلیغ کرے گا تاوقتیکہ آپ خود اس کی خواہش نہ کریں۔ اسی

لحاظ سے بہائی دنیا کی سب سے زیادہ امن پسند قوم ہیں۔''

''اگر بہائی اتنے ہی امن پسند ہیں تو پھر ایرانیوں نے ان کا قتل عام کیوں کیا۔؟''۔ مجھے برسوں پہلے پڑھی ہوئی بات یاد آ گئی...... ''حالانکہ بہائی جو قتل ہوئے وہ بھی ایرانی ہی تو تھے''۔

بشیر نے مبہم سا جواب دیا...... کہ ہر نیا مذہب جو بھی دنیا میں آیا ہے۔ اسے اور اس کے بانی کو اپنی ہی قوم کی مخالفت اور تشدد کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے حضرت عیسیٰؑ اور رسول اکرمؐ کی مثالیں بھی دیں۔ لیکن پوری طرح نہ وہ مطمئن تھا نہ مجھے کر سکا۔ اس کا جواب خاصے عرصہ بعد مجھے ایک ایرانی شیعہ عالم نے دیا۔

اتنے میں گاڑی میں اعلان ہوا کہ شیفیلڈ آ رہا ہے۔ اس اعلان کو سنتے ہی بشیر اور شکنتلا نے سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ ہگ بھی اپنا سامان سمیٹ کر بشیر کے پاس آ گیا کیونکہ عائشہ وہاں بیٹھی ہوئی تھی۔ بشیر نے بتایا کہ ایران سے ایک مشہور بہائی مبلغ آئے ہوئے ہیں اور آج کل شیفیلڈ میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ان سے ملاقات کرنے' بہائی تعلیمات حاصل کرنے اور خیر و برکت حاصل کرنے کے لئے وہ اور اس کا خاندان دو تین دن کے لئے شیفیلڈ میں ٹھہریں گے اس کے بعد وہ اپنے گھر گلاسکو چلے جائیں گے۔ مجھ سے البتہ اس نے نہیں پوچھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔

تھوڑی ہی دیر بعد شیفیلڈ کا اسٹیشن آ گیا۔ اور ٹرین اس کے طویل سٹینڈ میں گھستی چلی گئی۔ چمکیلا دن اچانک ہی ملگجی شام میں تبدیل ہو گیا حالانکہ دن کا ایک بج رہا تھا لیکن سٹینڈ کی وجہ سے پلیٹ فارموں پر بہت کم روشنی تھی۔ چونکہ مجھے اس ٹرین سے رادھرم جانا تھا۔ جو شیفیلڈ سے اگلا اسٹیشن اور کل چار پانچ میل دور تھا۔ اس لئے میں ٹرین میں ہی بیٹھا رہا اور بشیر' شکنتلا' عائشہ اور ہگ گرم جوشی سے رخصت ہوئے۔ ٹرین سے اتر کر بھی انہوں نے ہاتھ ملائے اور پھر ناک کی سیدھ میں گیٹ کی طرف چل دیئے۔ تعجب کی بات یہ ہوئی کہ پھر ان میں سے سوائے شکنتلا کے کسی نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ البتہ شکنتلا نے مڑ کر نہ صرف ہاتھ ہلایا بلکہ ننھی ٹمی کا ہاتھ بھی لہرایا اور اس کے بعد وہ سب لوگ دروازے کے باہر غائب ہو گئے۔

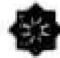
خیال تھا کہ چار پانچ منٹ کے وقفے کے بعد گاڑی دوبارہ چل پڑے گی لیکن وہ تو ایسی کھڑی ہوئی کہ جیسے چلنا ہی بھول گئی ہو۔ پھر پتہ چلا کہ شیفیلڈ چونکہ ایک بڑا جنکشن ہے۔ اس لئے گاڑی یہاں ایک گھنٹہ رکے گی۔ مایوس ہو کر میں نے اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور گاڑی سے اتر کر

سامنے ایک بینچ پر جا بیٹھا اور اس اجاڑ سے اسٹیشن پر لوگوں کو دیکھنے لگا جو اکا دکا ہی نظر آ رہے تھے۔ دور وہ چائے کا اسٹال بھی نظر آ رہا تھا جہاں سے میں نے لندن جاتے ہوئے چائے خرید کر پی تھی۔ وقت گزاری کے لئے میں نے پھر اسٹال کا رخ کیا لیکن اس دفعہ چائے دستیاب نہ تھی کیونکہ ایک بج چکا تھا۔ اور چائے کی بجائے کھانے کا وقت تھا۔

بوریت کے باعث پہلے تو میں نے سوچا کہ اپنا سوٹ کیس اٹھا کر باہر چلا چلوں۔ سامنے ہی بس اسٹینڈ ہے جہاں سے رادھرم جانے والی بسیں ملتی ہیں۔ پہلی بس پکڑلوں اور دس پندرہ منٹ میں رادھرم بس اسٹاپ پر پہنچ جاؤں وہاں سے دوسری بس پکڑ کر پانچ منٹ میں گھر کے قریب جا اتروں۔ پھر خیال آیا کہ رادھرم کے اسٹیشن پر مجھے لینے ایڈنا آئی ہوگی اس کا کیا بنے گا۔ بہتر ہے کہ ٹرین پر ہی جاؤں۔ پھر ہلکا سا یہ خیال بھی آیا کہ رادھرم تک کرایہ چھ پنس اور اس سے آگے گھر تک چھ پنس کرایہ۔ کل 12 پنس کی خوامخواہ کی چپت برداشت کرنی پڑے گی لہٰذا ٹرین ہی بہتر ہے جو مفت میں رادھرم تو پہنچا دے گی۔ آگے ایڈنا بھی تو مفت میں گھر لے جائے گی۔ لہٰذا بیٹھے ہی رہو۔

ٹرین پورا ایک گھنٹہ شیفیلڈ کے اسٹیشن پر رکی رہی۔ اس کے بعد جو چلی ہے تو نالہ کراس کر کے پانچ منٹ میں ہی رادھرم کے سنسان سے اسٹیشن پر پہنچ گئی۔ جہاں میرے پانچ روزہ سفر کا اختتام ہو رہا تھا۔ ایڈنا اسٹیشن پر مجھے لینے آئی ہوئی تھی۔ باہر اس کی سرخ رنگ کی چھوٹی سی کار کھڑی ہوئی تھی۔ جس نے ہمیں تھوڑی دیر میں ہی گھر پہنچا دیا۔

پانچ دن کے غیر معمولی سفر کا انجام بخیر و خوبی ہو چکا تھا۔ اس میں جو کھویا اور جو پایا وہ صرف مجھے ہی معلوم تھا۔



# مشعل بک کلب

کتاب علم کا دروازہ اور معلومات کا خزانہ ہے۔ آج میڈیا کی تیز ترین ترقی بھی کتاب کی اہمیت کو کم نہیں کر سکی۔ میڈیا کے تمام ذرائع کی زندگی محض چند دن سے زیادہ نہیں ہے جبکہ کتاب علم اور معلومات کا مستقل خزانہ ہے۔ جو نہ صرف انسان پر علم کے خزانے وا کرتا ہے بلکہ گزشتہ اقوام کے حیرت انگیز کارنامے اور عبرت ناک انجام بھی ہم تک کتاب کے ذریعے ہی پہنچے ہیں۔ اسی لیے مغربی دنیا میں کمپیوٹر اور انفارمیشن ٹیکنالوجی میں بے مثال ترقی کے باوجود اپنی نسل کو کتاب سے ناطہ جوڑنے اور پڑھنے کی عادت ڈالنے کے لیے سخت کوشش ہو رہی ہے۔

ہمارے معاشرے میں کتاب کو فروغ دینے کے لیے مشعل بک کلب کا اجراع کیا گیا ہے۔ مشعل کتاب کلب کی رکنیت لینے سے آپ درج ذیل سہولیات سے مستفید ہو سکیں گے:۔

☆ مشعل پبلشرز کی تمام کتب پر ۴۰ فیصد رعائت

☆ دیگر پبلشرز کی کتب ۲۵ فیصد رعائت پر مہیا کرنے کا بندوبست کیا جائے گا۔

☆ مشعل بک کلب کے ارکان کی منتخب کردہ دو کتب ہر سال شائع کی جائیں گی جو ارکان کو بلا معاوضہ مہیا کی جائیں گی۔

☆ ہر سہ ماہی ایک کتاب ارکان کے مشورے سے مشعل کتاب کلب کے ارکان کے مطالعے کے لیے منتخب کی جائے گی۔ اس کتاب پر ارکان دو صفحات کا خلاصہ لکھیں گے اور سب سے بہتر خلاصہ لکھنے والے رکن کو کتابوں کا ایک سیٹ پیش کیا جائے گا۔

☆ مشعل بک کلب کے ارکان کے بچوں کے لیے درسی کتب ۱۰ سے ۲۰ فیصد رعائت پر ان کے گھر پر مہیا کی جائیں گی۔

ممبر شپ حاصل کرنے کیلئے اس پتے پر لکھیں:

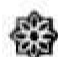
C-2 اسلامک سنٹر پنجاب یونیورسٹی لاہور۔ یا

www.mashalfoundation.org پر لاگ ان کریں۔ یا

mashalfoundation@gmail پر ای میل کریں

# بچوں کو اقدار کیسے سکھائیں؟

بچے کسی بھی قوم کا اثاثہ ہیں اور ان کی تربیت قوموں کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔
بچوں کی تربیت کا آغاز گھر سے ہوتا ہے۔
نپولین نے کہا "مجھے اچھی مائیں دو میں تمہیں بہترین قوم دوں گا۔"
نبی کریم ﷺ کے فرمان کے مطابق والدین اپنی اولاد کو جو کچھ وراثت میں دیتے ہیں اس میں سب سے قیمتی چیز بہترین تربیت ہے۔
ہمارے معاشرتی مسائل کی بنیادی وجہ تربیت کا فقدان ہے اور اس کی ایک وجہ تربیتی مواد کی کمی بھی ہے۔
لیکن اگر تربیت کی اہمیت اور فرض کی ادائیگی کا احساس ہو تو باپ اپنی اولاد کے لیے خود کتاب لکھتا ہے جو دنیا کے سامنے مراۃ العروس کے نام سے آتی ہے۔
خوش اخلاقی، ایثار، سچ بولنا، دیانتداری، محنت، قربانی اور اس طرح کی دوسری عادات وراثت میں نہیں ملتیں بلکہ سکھانی پڑتی ہیں۔
اس کتاب میں بچوں کو بارہ اقدار سکھانے کے لیے انتہائی دلچسپ اور سہل طریقوں کا ذکر ہے جس کے ذریعے آپ بچوں کو کھیل کھیل میں اقدار سکھا سکتے ہیں۔
گھر اور سکول کے لیے یکساں موزوں اور انتہائی مفید کتاب



# کیمیا گری

**"Every few decades a book is Published which changes lives of its readers for ever, the Alchemist is such a book."**

دی ایکسپریس کا یہ تبصرہ برازیلوی مصنف پاؤلو کوئیلو کی کتاب کے بارے میں ہے جس کی اب تک دنیا کی ۴۰ سے زیادہ زبانوں میں چار کروڑ سے زائد کاپیاں بک چکی ہیں۔

پاؤلو نے ہر انسان کے ساتھ زندگی میں پیش آنے والے پانچ انتہائی اہم امور کو نہایت دلچسپ کہانی کے انداز میں پیش کیا ہے۔ مصنف کا انداز بیان بہت دلچسپ اور زبان نہائت سادہ ہے۔ اس کتاب کو ترجمہ کرنے کی وجہ صرف اس کا طرز بیان اور سادگی اسلوب ہی نہیں ہے بلکہ:۔

☆ مصنف نے انسانی زندگی کے چند بہت ہی اہم امور سے متعلق پائی جانے والی کم علمی بلکہ غلط فہمی کا ازالہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اس کوشش میں کس حد تک کامیاب رہا ہے، اس کا اندازہ کتاب کی مقبولیت سے لگایا جا سکتا ہے۔

☆ ان امور سے متعلق مصنف کا نقطہ نظر کم و بیش وہی ہے جو اسلام کا ہے دراصل یہ بہت حد تک اسلام کے فلسفہ حیات سے ہی اخذ شدہ ہے۔

☆ ہم بالعموم اپنے بارے میں احساس کمتری کا شکار ہیں۔ مغرب کی صنعتی ترقی کی چکا چوند ہماری نظر اپنے اسلاف کے کارناموں تک بھی نہیں جانے دیتی۔ ہمارے ہاں تیار ہونے والی اشیا جب بین الاقوامی لیبل کے ساتھ واپس ہمارے ہاں فروخت ہوتی ہیں تو ہمارے اعتماد پر پوری اترتی ہیں۔ اسی طرح ہمارے اپنے نظریات جب مغربی لبادہ اوڑھ کر ہمارے پاس آتے ہیں تو ہمارے لیے معتبر اور قابل عمل بن جاتے ہیں۔

☆ اس کتاب کے ذریعے اس نقطے کو اٹھانے کی کاوش کی گئی ہے کہ:۔

☆ مغرب کی کامیابی کے پیچھے وہ نظریات اور اصول ہیں جو حضرت محمد ﷺ آج سے چودہ سو سال قبل لائے تھے۔

☆ کیا اس دنیا میں کامیاب زندگی کے لیے اس نظریہ حیات پر صرف ایمان لانا ہی کافی ہے یا ایمان کے بعد عمل بنیادی شرط ہے۔

☆ اسلام کے فلسفہ حیات پر ایمان لائے بغیر اس کے اصولوں پر عمل تو اس دنیا میں کامیابی کی ضمانت ہے۔اس کی مثال ہمیں مغرب سے مل سکتی ہے۔جبکہ اس پر محض ایمان جو کہ عمل سے خالی ہو ایمان لانے والے کو اس دنیا میں کامیابی کی ضمانت نہیں دیتا اس کی گواہی ہماری بے سکون معاشرتی زندگی دیتی ہے۔

اس کاوش کا مقصد یہ ہے کہ ہم زندگی کی حقیقت کو جانیں اور ایک بامقصد زندگی گزارنے اور اس مقصد کے حصول کے لیے درکار محنت کی ضرورت کی اہمیت کو سمجھیں۔

کتاب کے آخر میں ایک سوال نامہ لف کیا گیا ہے تا کہ وہ اہم نقاط جو مصنف نے اٹھائے ہیں اور جو اس کتاب کی عالمگیر شہرت کا باعث بنے ، ہر قاری ان کا زیادہ سے زیادہ ادراک حاصل کر سکے۔

اس سوال نامے کی فوٹو کاپی کروائیں۔اس کو مکمل کر کے آخر میں دیے گئے پتے پر ارسال کر دیں۔صحیح جواب کی صورت میں آپ کو کتابوں کا ایک سیٹ تحفے میں دیا جائے گا۔

